مطالعہ افکار مغرب۔ ششم

مابعد جدیدیت اور اسلامی تعلیمات

مصنف
پروفیسر ڈاکٹر احمد ندیم
(گولڈ میڈلسٹ)

کتاب محل

مابعد جدیدیت
اور
اسلامی تعلیمات

(Postmodernism and Islamic Teachings)

پروفیسر ڈاکٹر احمد ندیم گہلن

ایم۔فل (گولڈ میڈلسٹ)

پی۔ایچ۔ڈی، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، اوکاڑہ

کتاب: مابعد جدیدیت اور اسلامی تعلیمات

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر احمد اللہ گھلن

اشاعت: 2016ء

قیمت: 600

ناشر: محمد فہد (رابطہ نمبر: 0321-8836932)

کتاب محل

عربی، فارسی، اردو، انگریزی کتب کا مرکز

(اپنی کتب دیدہ زیب پرنٹ کروانے کیلئے رابطہ کریں)

ملنے کا پتہ: دربار مارکیٹ، لاہور۔

فہرست موضوعات

3013

حرف آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام طرح کی تعریف اس خدا کیلئے ہے جس نے تمام انسانوں کو تخلیق اور اخلاق میں برابری کا اعزاز بخشا۔ انسان کو عقل سے بہرہ یاب فرمایا تاکہ وہ اسرار وجود اور تخلیق کے اسباب کا ادراک کر سکے، اور جان سکے کہ کائنات کو انسان کیلئے کیوں مسخر کیا گیا ہے اور قرآن میں کیا کیا حکمتیں اور احکام بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی وہ کائناتی حقیقت اور قرآنی حقائق دونوں کا شعور حاصل کر سکے اور پھر اپنی امنگوں اور خیالات کو بلند کرتے ہوئے حیوانیت کی پستی سے نکل کر اعلیٰ تر انسانی مراتب پر ترقی کر سکے اور۔۔۔۔۔

صلوٰۃ والسلام ہو اس ہستی مقدس (ﷺ) پر جسے انسان اور تہذیب و ثقافت کو ضلالت و جہالت اور شر و رذالت کی ہلاکت انگیز وادیوں سے نکالنے والا بنا کر بھیجا گیا۔

ہر دور میں نئے نئے مسائل سر اٹھاتے رہے ہیں۔ ہر نسل جداگانہ افق لے کر منصۂ شہود پر نمودار ہوتی رہی ہے اور جب مشکلات پیچیدہ تر ہو جاتی ہیں، زندگی کی گتھیاں لاینحل ہو جاتی ہیں۔ ان کے حل کے تقاضے ابھر آتے ہیں اور انسان کا ان سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو پھر پروردگار کی عنایت و توجہ دخل انداز ہوتی ہے اور انسان کا شعور اور عزم بروئے کار آ جاتا ہے۔ اس کا سنجیدہ عزم اپنی مشکلات کے حل کیلئے شاہراہ حیات پر جلوہ افرز ہو جاتا ہے اور پھر ایسی منظم مساعی بروئے کار آ جاتی ہے جو سیاہی (علامتِ علم) اور پسینہ (علامتِ محنت) کو یکجا کر لیتی ہے۔

عصر حاضر نے جن نئے نظریات کو جنم دیا ہے ان میں موجودہ مہذب انسان کی حالت دگرگوں ہے

اور انسان قلق واضطراب میں صبر کی حدوں کو پھلانگ چکا ہے، جبکہ دوسری طرف انسان سائنس اور ٹیکنالوجی پر اپنی گرفت وقدرت میں برابر اضافہ کرتا جارہا ہے،اس صورت حال نے انسان کو ضیاع وشقاوت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ انسان اپنی طاقت اور صلاحیتوں کو مفلس آئیڈیالوجی کے تحت قائم ہونے والے نظام حیات کی خدمت میں استعمال کررہا ہے۔

سرمایہ دارانہ لبرل آئیڈیالوجی اور کمیونسٹ آئیڈیولوجی کے بعد ''جدیدیت'' (Modernism) کا دور آیا اور سیلاب کی طرح انسانی فلسفہ کو بہالے گیا۔اس کے ردعمل کے طور پر ''مابعد جدیدیت'' (Postmodernism) کے نظریات ایک چیلنج کی صورت میں سامنے آئے اور وحی پر مبنی علوم اور نظامِ حیات کو مسلسل للکار رہے ہیں۔ دور جدید کے مغربی معاشرے اس آئیڈیالوجی کو مسلسل اپنائے ہوئے ہیں اور مغربی میڈیا اپنے پورے وسائل بروئے کار لارہا ہے کہ مسلم معاشرے بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں۔

موضوع کی اہمیت:۔

دین اسلام کی بنیاد وحی ربانی پر قائم ہے اور قرآن کے سرمدی اصول غیر متبدل اور نا قابل تغیر ہیں۔ قرآنی تعلیمات پر قائم ہونے والا معاشرہ نہ تو غیر مہذب ہوسکتا ہے اور نہ پسماندہ لیکن موجودہ مسلم معاشرے قرآنی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ یورپی وامریکی مفکرین جس تھیوری کو درست ثابت کرنے کیلئے دلائل اور Proofs کے انبار لگادیں ہمارے مفکرین بھی ذہنی مرعوبیت کی وجہ سے اسے قرآن کی کسوٹی پر جانچے بغیر (Authentic) تسلیم کرلیتے ہیں۔

گزشتہ صدی ''جدیدیت'' کی صدی تھی۔ جدیدیت اصل میں ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کا نام ہے جو گزشتہ دو صدیوں کے یورپ میں ''روایت پسندی'' Traditionalism اور کلیسائی استبداد کے ردعمل میں پیدا ہوئیں اور ''مابعد جدیدیت'' ان افکار کے مجموعے کا نام ہے جو جدیدیت کے بعد اور اکثر اس کے ردّعمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ مابعد جدیدیت کے نظریہ کا گہرائی سے عام لوگوں کو اگرچہ علم نہیں ہوتا لیکن محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اپنی عملی زندگی اور رد وقبول میں اس کے اثرات قبول کرلیتے ہیں۔

عام مسلمان اور بعض اوقات اسلام کے فروغ کیلئے کام کرنے والے علماء بھی اس کے اثرات سے خود

کونہیں بچا پاتے۔ مابعد جدیدیت کا سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ افکار، نظریات، آفاقی صداقت، مقصدیت اور آئیڈیالوجی سے لوگوں کی دلچسپی نہایت کم ہوگئی ہے۔ مابعد جدید دور کے انسان کے نہ کوئی آدرش ہیں اور نہ اصول۔ اس لیے اس کے مبلغ اس دور کو Age of No Ideology قرار دے رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ نہایت خطرناک Trend ہے کہ انسان اصول ومقاصد پر یقین کھودے۔

موضوع کا بنیادی سوال:۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مابعد جدیدیت کا نظریہ" اسلام کو کوئی چیلنج کرتا ہے اگر وہ چیلنج ہے تو اسلامی تعلیمات میں اس کا کیا جواب پیش کیا گیا ہے۔ کیا اسلامی تعلیمات کیلئے مابعد جدیدیت ایک چیلنج ہے یا نہیں؟ اگر یہ نظریہ چیلنج پیش کرتا ہے تو اسلام میں ان کے بارے میں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

منہج تحقیق:۔

تحقیق کا بیانیہ اور تجزیاتی طریقہ اپنایا جائے گا اور مابعد جدیدیت کے حامی مفکرین کی آراء و دلائل کا قرآن وحدیث اور عقلی دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ انسان کیلئے مفید مابعد جدیدیت ہے یا کامل وحیٔ الٰہی جس کا نام اسلام ہے۔

دائرہ تحقیق:۔

مابعد جدیدیت کے حامی بڑی شد و مد کے ساتھ اس نظریہ کے تین پہلوؤں پر زور دیتے ہیں یعنی

۱۔ سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ (Metanarratives) کا ردّ

۲۔ دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ یعنی (Hyperreality) اور

۳۔ ردّ تشکیل کا نظریہ (Deconstruction)

ہم ان پہلوؤں کا تجزیاتی اور تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے مابعد جدیدیت کے عملی اثرات کو بھی زیرِ غور لائیں گے۔ پھر اس نظریہ کا محاکمہ کرتے ہوئے دورِ حاضر میں مابعد جدیدیت کو فروغ اسلام میں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟ اس امکان کا بھی جائزہ لیں گے۔ انشاءاللہ

موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ:-

مابعد جدیدیت کے موضوع پر مغربی مفکرین نے بہت سی کتب تالیف کی ہیں۔ جس کے نتیجے میں مابعد جدیدیت کو باقاعدہ ایک فلسفۂ حیات اور طرزِ زندگی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور ان مفکرین کے افکار کو معاشرتی اور سماجی پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس موضوع پر مغربی سکالرز کی درج ذیل کتب میں بحث ملتی ہے:

(i) Lyotard, J-F(1993), The Postmodern condition: A Report on Knowledge (Tr.Geoff Bennington and Brian Massumi) university of Minnnesota press.

(ii) Alain, Tourain (1995), Critique of Modernity, Combridge Black well.

(iii) Bauman, Zygmunt (2000), Liquid Modernity, Cambridge: Polity press.

(iv) Charles upton (2001), The system of Antichrist Truth and Falsehood in Postmodernism The New age, Sophia Perennis.

(v) Collins, Jim(1989), uncommon cultures; Popular cultures and Postmodernism, Routledge.

(vi) Habermas, Jurgen (1993), Modernity versus Postmodernity, Cambridge: polity press.

(vii) Umberto Eco (1986), Travels in Hyperreality, New York, Harcourt Brace Jovanovich.

ایک اہم اور قابلِ ذکر کتاب جس میں مابعد جدیدیت کا اسلامی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ وہ پاکستانی نژاد امریکی مفکر اکبر صلاح الدین احمد کی ہے:

Akbar S. Ahmad (1992), Postmodernism and Islam: Predicament and Promise, Routledge.

اردو زبان وادب کو مابعد جدیدیت کے ڈسکورس سے متعارف کرانے کا سہرا ہندوستانی مفکر پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سر ہے۔آپ کی اس سلسلہ میں درج ذیل دو کتب نہایت اہمیت رکھتی ہیں جن میں ادبی حوالے سے مابعد جدیدیت کے اردو پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے:

(الف) نارنگ، پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سنگ میلی پبلی کیشنز لاہور، 2006ء

(ب) نارنگ، پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1994ء

مابعد جدیدیت کے اردو زبان وادب پر اثرات کے حوالے سے اورادبی تنقید کی تحریک کے طور پر''مابعد جدیدیت اوراردو ادب'' کے عنوان سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔لیکن اس میں محض اردو زبان وادب کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا موازنہ نہیں ہے۔

سید سعادت اللہ حسینی نے''مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام'' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے جو دو قسطوں میں ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں چھپ چکا ہے۔اس میں سید صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں اسلامی تعلیمات کی مابعد جدیدیت کے مقابلے میں حقانیت کو ثابت کیا ہے لیکن اردو زبان میں یہ پہلی اور مختصر سی کوشش تھی جس میں اسلامی رہنمائی پیش کی گئی ہے۔

لیکن ابھی تک باقاعدہ کسی کتاب یا تحقیقی مقالے میں مابعد جدیدیت بطور فلسفہ حیات، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا جائزہ نہیں لیا گیا۔

مجوزہ خاکہ (Synopsis)

☆ باب اول۔ جدید تہذیب کا ارتقاء

فصل اول — یورپ کے ذہنی انحطاط کا سفر

فصل دوم — نشاۃ ثانیہ (Renaissance) یورپ میں عقلی بیداری

فصل سوم — جدیدیت (Modernism)

☆ باب دوم — مابعد جدیدیت (Postmodernism)

فصل اول — مابعد جدیدیت......ایک تعارف

فصل دوم — مابعد جدیدیت کے بنیادی نظریات

الف۔ سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ (Metenarratives) کا ردّ

ب۔ دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ یعنی Hyperreality اور

ج۔ ردِ تشکیل کا نظریہ یعنی Deconstruction۔

☆ باب سوم — مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام

فصل اول — مابعد جدیدیت کے اثرات

الف۔ اسلامی معاشرہ کے تناظر میں

ب۔ عالمی تناظر میں

فصل دوم — مابعد جدیدیت اور فروغ اسلام

فصل سوم — مابعد جدیدیت اور اسلامی نظریہ حیات

☆ خلاصۂ بحث

☆ نتائج تحقیق

باب اول

فصل اول

یورپ کے ذہنی انحطاط کا سفر

اس وقت دنیا پر مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ ہے مغرب نے اپنے معاشی، سیاسی اور حربی تفوق (Supremacy) کو اپنے فکری غلبے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور یوں وہ اپنی تہذیب کی عالمگیریت (Globalisation / Universalization) کی مہم پر کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مسلم دنیا کو بھی پہلے اس نے بزور بازو فتح کیا، کچلا، تباہ و برباد کیا اور پھر ان کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے مسلم ممالک میں اجتماعی ادارے (سیاسی، معاشی، قانونی، سماجی، تعلیمی وغیرہ) اپنی فکر و فلسفے پر قائم کیے اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کرنے کی بھرپور کوشش کی جس میں اسے خاصی کامیابی ملی۔ مغرب نے اپنے ہمہ جہتی تہذیبی غلبے سے جن افکار و تصورات کو بالعموم دنیا میں اور بالخصوص مسلم ممالک میں مروج کیا ہے اس کی تاریخ ایک ایسی طویل اور مسلسل جاہلیت کی تاریخ ہے جس کی کڑیاں باہم دگر پیوستہ ہیں اور تاریخ کے کسی موڑ پر یہ تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ میں نے مغربی افکار و تصورات کے لیے جاہلیت، کا لفظ محض جذباتی ہو کر نہیں لکھا بلکہ مسلسل مطالعہ، فکر اور مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج بھی مغربی افکار کی سمت وہی ہے جو معلوم تاریخ کے ابتدائی مادہ پرست اور مظاہر پرست معاشروں کی تھی۔

عصر حاضر کے جید عالم اور معروف مصری مفکر محمد قطبؒ نے بھی مغربی تہذیب کے لیے ''جاہلیت جدیدہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے محمد قطبؒ لکھتے ہیں:

> ''یورپ کی تاریخ مسلسل جاہلیت کی تاریخ ہے۔ اور تاریخ کے کسی موڑ پر جاہلیت کا تسلسل نہیں ٹوٹا ہے۔ چنانچہ پہلے یونانی اور رومی جاہلیت تھی۔ اس کے بعد قرون وسطیٰ کی جاہلیت آئی اور پھر آخر میں جاہلیت جدیدہ آ گئی جو دراصل اسی پرانی یونانی اور رومی جاہلیت کی طرف رجعت اور اسی کا پھیلاؤ ہے جس میں یہودی عبقری نے ڈارونیت (Darwinism) کا اضافہ کر کے اس کی تباہ کاریوں میں اضافہ کر دیا ہے اور اس جاہلیت کا رخ اپنے مقاصد کی طرف پھیر دیا ہے''۔(1)

ہمارے مقالے کا موضوع کیونکہ مابعد جدیدیت ہے اس لیے یورپ کی ذہنی بیداری اور مذہب اور عقل و سائنس سے تصادم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی فکری تحریکات کا جب تک ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک بات واضح نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے مابعد جدیدیت یکلخت تو رونما نہیں ہو گئی ہے بلکہ مغرب (اور مغرب سے ہماری مراد یورپ اور امریکہ ہے) کی تاریخ میں اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس بات کا یورپ کو بھی اعتراف ہے کہ جدید یورپی تمدن کی اصل بنیادیں یونانی اور رومی تہذیبیں ہیں۔ محمد قطبؒ جو کہ مغربی علوم و فکر کے نبض شناس ہیں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''یورپ کو بخوبی اعتراف ہے کہ اس کی نشاۃ ثانیہ میں اسلامی تہذیب و تمدن کا بڑا اثر ہے لیکن اسلامی تہذیب کا یہ مواد اپنے اندر اسلامی رنگ لیے ہوئے داخل نہیں ہوا۔ بلکہ یونانی اور رومی رنگ میں رنگ کر اس کی وثنیت اپنا چکا تھا پھر جب یہ مواد یورپ پہنچا تو اس پر مسیحیت کا ایک باریک سا غلاف چڑھ گیا جو آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا رہا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں بالکل تار تار ہو گیا'۔(2)

مابعد جدیدیت نے مغربی تہذیب و فکر کے بطن سے جنم لیا ہے اور اسی کی گود میں اس نے پرورش پائی ہے۔ اسی لیے اس نظریہ اور تحریک کو سمجھنے کے لیے اس کے تہذیبی پس منظر کو نگاہ میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کا آغاز اس فکری اور ذہنی رو سے ہوا جسے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہتے ہیں اور جو عبارت تھی قرون وسطیٰ کے مذہبی جبر و تشدد کے نظام کے خلاف بغاوت سے۔ سب سے پہلے فکری میدان میں آزادروی اور حریت پسندی (Liberalism) رونما ہوئی جس کا سب سے نمایاں مظہر پرانے ادب کا احیاء تھا۔ یہ تحریک دراصل یورپ کے مذہبی

دور کے مقابلے میں اس سے قبل کی دنیا سے ذہنی وابستگی کی علامت تھی۔ پرانی دیومالاؤں اور یونانی اور رومی وثنی ادب (Pagan literature) کی طرف رجوع کیا گیا اور فکر و فن کے ہر میدان میں مذہب کی دی ہوئی اقدار سے گریز بلکہ ان سے انحراف اور ان کے خلاف بغاوت اور متشددانہ نظام کی روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ لبرلزم فلسفہ کے میدان میں رونما ہوا اور الہامی/آسمانی ہدایت سے بے نیاز ہوکر محض عقل کے سہارے سفرِ حیات طے کرنے کا دعویٰ پیش کیا۔ عقلیت (Rationalism)، انسانیت پرستی (Humanism)، سیکولرزم (Secularism)، تجربیت (Empiricism) وغیرہ کی تحریکات اسی رجحان کی علمبردار تھیں۔ اس کے بعد اس کا اظہار اخلاق و معاشرت کے دائرے میں ہوا اور روایتی اخلاق کے مقابلے میں ایک قسم کی بے قیدی، آزادی پسندی اور بے راہ روی کی کیفیت رونما ہوئی۔ پھر یہ حریت پسندی خود مذہب کے دائرے میں رونما ہوئی اور اس نے تحریکِ اصلاحِ مذہب (Reformation) کو جنم دیا لیکن ان تمام تحریکات کا مقصد محض مادی مفاد/لذت کا حصول تھا۔

پروفیسر خورشید احمد جن کی مغربی علوم پر گہری دسترس ہے وہ مغربی فکری تحریکات کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''مغرب میں جتنی بھی فکری تحریکات برپا ہوئی ہیں بحیثیت مجموعی جو بھی نیا نقطہ نظر ابھرا اس میں آخرت کو اساس بنانے کی بجائے صرف اس دنیا کے سود و زیاں کو بنیاد بنانے کا رویہ تھا۔ نئی اقدار کا محور و مرکز جلبِ دنیا، حصولِ منفعت، لذت پسندی اور مادہ پرستی قرار پائی۔''(3)

الغرض مغرب کا فکری سفر جاری رہا اب اس کے اظہار کا اگلا میدان سیاست تھا یہاں اس نے انفرادیت پسندی (Individualism) کا روپ دھارا۔ بادشاہت اور استبدادی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا گیا۔ فرد کے حقوق کے لیے لڑائی لڑی گئی اور بالآخر عوام کی حاکمیت کی بنیاد پر لادینی جمہوری نظام قائم کیا گیا۔ سیاست ہی کا ایک اور پہلو مذہب کے نام پر ہمہ گیر بین الاقوامی ریاست تھی۔ اس کے خلاف بھی تحریک رونما ہوئی اور بین الاقوامیت کی جگہ قومیت کا محدود جغرافیائی تصور رونما ہوا۔ بالآخر معیشت کے دائرے میں اس نئی رو نے اپنا اظہار کیا اور صنعتی انقلاب کے سہارے جدید سرمایہ داری (Capitalism) رونما ہوئی جس میں فرد کو معاشی سعی و جہد کی بے قید

آزادی دی گئی اور سرمایہ کو اصل فیصلہ کن قوت بنا دیا گیا اور ذاتی نفع کا حصول معیشت کی رہنما طاقت بنا۔اس کے نتیجہ میں شدید قسم کی معاشی انفرادیت (Economic Individualism) رونما ہوئی ۔سائنس اور فنیت (Technology) کی تمام قوتیں انفرادیت پسند تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے استعمال ہوئیں۔ مذہب سے بغاوت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تحریک تنویر/روشن خیالی (Enlightenment) نے جہاں مذہبی اور سیاسی استبداد سے پیدا ہونے والی بہت سی خرابیوں کو دور کیا اور نئی تخلیقی قوتوں کو جنم دیا۔ وہیں اس نے متعدد نئے مسائل اور پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیں۔ نیا انسان اخلاق، مذہب، قانون اور رواج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر بالکل مادر پدر آزادی کے تباہ کن راستہ پر لگ گیا۔ اور ظلم واستحصال کا ایک نیا اور خراب تر دور شروع ہو گیا۔بات یہاں تک پہنچی کہ Gay اور Lesbian (4) کلچر عام ہونے لگا۔ Homosexual شادیاں عام ہیں اور انہیں قانونی تحفظ حاصل ہے۔ Nude races آئے دن منعقد ہوتی ہیں۔اور اس میں اچنبھے کی کوئی بات انہیں نظر نہیں آتی ۔اس طرح بات چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کو غیر حقیقی سمجھا جانے لگا ہے۔ عالمی سچائیوں (universal Truths) کا انکار کیا جانے لگا ہے اور ہر قسم کے عقائد کو Meta Narratives کہہ کر رد اور انکار کیا جا رہا ہے۔ اس طرح مغرب کے نزدیک ان کی تہذیب Peak پر پہنچ گئی ہے اگر تہذیب وتمدن کا عروج یہ ہے تو بگاڑ (Decay) کیا ہو سکتا ہے؟ ہماری سمجھ شاید اس Peak تک نہیں پہنچ پائی اس لیے ہم مشرق والوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس کی سمجھ بھی نہیں آتی۔ الامان والحفیظ۔

ہماری گفتگو کا آغاز ہوا تھا مغرب کے فکر اور تہذیبی سفر کے حوالے سے،مغرب کا سفر انسانی فکر سے جدا نہیں کیا جا سکتا ابتداء تو بہر حال ایک ہی طرح سے ہوئی ہے اس سلسلہ میں پروفیسر نعیم احمد لکھتے ہیں:

> ''انسان کا فکری سفر کم وبیش اڑھائی تین ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے ۔اس سفر کا آغاز دیومالائی عقائد سے ہوا۔ پھر آیونیا (Ionia) کی سرزمین میں فلسفیانہ سوچ کی ابتدائی شکلیں سامنے آئیں اور فکر وفلسفے کی ایک باقاعدہ روایت بننی شروع ہوگئی۔تاہم ایک لمبے عرصے تک فکری کاوشوں میں دیومالائی عقائد کی بھی آمیزش رہی ۔پھر افلاطون (428-348 ق م) اور ارسطو (348-322 ق م) کے فلسفوں میں یہ روایت

اپنی انتہائی حدوں کو جا پہنچی۔ اسے ہم قرون اولیٰ کا فلسفہ وفکر کہہ سکتے ہیں یہ زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر حضرت مسیح کی پیدائش تک پھیلا ہوا ہے اس کے بعد سولہویں صدی کے آخر تک قرون وسطیٰ کا دور ہے جس میں فلسفہ (اور آزاد فکر) مسیحی عقائد کے سامنے بہت حد تک دب کر رہ گیا۔ ان دونوں ادوار میں فلسفے اور سائنس کے مابین کوئی واضح تخصیص نہ تھی ازمنۂ وسطیٰ میں ارسطو کے نظریات ہی فلسفے اور سائنس کے حوالے سے مستند سمجھے جاتے تھے"۔(5)

پروفیسر حسن عسکری صاحب جدیدیت کے ارتقاء کا آغاز یونانی دور سے تسلیم کرتے ہیں اس سلسلہ میں وہ رقم طراز ہیں:

"پچھلے چھ سو یا کم از کم چار سو سال سے یورپ کا یہ ذہن بن چکا ہے کہ صرف اس علمی شہادت کو قبول کیا جائے جو تحریری صورت میں دستیاب ہو اس ذہنیت کے مطابق یورپ کے لوگ عموماً اپنی تہذیب کی تاریخ یونان سے شروع کرتے ہیں۔"(6)

ہماری بحث کیونکہ مغربی تمدن کی فطرت، ساخت، روح اور ان موثر قوموں کے فلسفہ زندگی کے ارتقاء کے بارے میں ہو رہی ہے اس لیے ہم یہ متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کیسے پیدا ہوا اور اس نے کس طرح نشو ونما حاصل کی؟ اس سلسلے میں ہمارے دور کے عظیم سکالر اور عرب وعجم کے درمیان علمی پل کی حیثیت رکھنے والی شخصیت جن کا چند سال پیشتر انتقال ہوا۔ علامہ ابوالحسن علی ندویؒ ان کی شہادت پیش کی جاتی ہے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی کی مغربی تہذیب ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی چند صدیوں میں ہوئی ہو۔ دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کا نسبتی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ اور عقلی وعلمی سرمایہ چھوڑا تھا، اس کے حصہ میں آیا اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسل منتقل ہوئے۔"

مولانا علی میاںؒ مزید لکھتے ہیں:

"یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی یہ پہلا تمدن تھا جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور رہا۔ یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی جس میں ایک ہی مغربی روح

کام کر رہی تھی۔ مغربی قومیں صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج ان کے فلسفہ، علوم و ادب و افکار کو سینہ سے لگائے رہیں۔ انیسویں صدی میں انہی خصوصیات کے ساتھ انہوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانابانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔"(7)

اس لیے ضروری ہے کہ اکیسویں صدی کی مابعد جدید فکر کا مطالعہ کرنے سے پہلے یورپی فکر کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا جائے تاکہ ہم بصیرت اور انصاف کے ساتھ مابعد جدیدیت کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لے سکیں۔ چنانچہ یورپ کی فکری تاریخ کے ادوار کا خاکہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

۱۔ یونانی تہذیب کا دور

۲۔ رومی تہذیب کا دور

۳۔ مسیحیت اور کلیسا

۱۔ یونانی تہذیب

جان سٹورٹ مل کہتا ہے کہ:

"تقریباً ہر شے جس پر آج کل کا انسان ناز کرتا ہے اس کی ابتدا یونان سے ہوئی۔"(8)

یونانی تہذیب اپنے دور کی بہترین اور ترقی یافتہ تہذیب تھی، وہ اپنے جلو میں علم و فن، فلسفہ، سیاسی نظریات اور علمی افکار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ لے کر آئی تھی۔ دور یونان میں سیاسی، حربی اور تمدنی نظم وجود میں آیا۔ مادی وسائل کو رفاہی کاموں میں لگایا گیا، مدنیت فنی حیثیت سے وجود میں آئی۔ راستے اور پل بنائے گئے۔ تفریح گاہیں اور تھیٹر بنائے گئے۔ قدیم یونان کے بارے میں معتبر (Authentic) اور تحریری مواد بہت کم دستیاب ہے اس لیے یونانی دین کے بارے میں صحیح معلومات مہیا نہیں ہیں۔ اس بارے میں پروفیسر حسن عسکری لکھتے ہیں:

"یونان کا قدیم دین کیا تھا اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا، اتنا ضرور معلوم ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح سے دو ایک صدیاں پہلے تک

یونان میں متصوفین کے چند گروہ تھے جو اپنے اسرار و رموز کو عوام سے پوشیدہ رکھتے تھے اوران گروہوں میں داخلہ بھی مشکل سے ملتا تھا یہ اسرار ورموز کیا تھے اور علم توحید میں ان کی پہنچ کہاں تک تھی اس کے متعلق کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔''(9)

ہاں البتہ معلوم لٹریچر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں فلسفے کو سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔ یونانی زبان میں لفظ فلسفہ (Philosophy) کے معنی ہیں' حکمت سے محبت کرنا'(10) یعنی اس دور میں فلسفی سے مراد وہ لوگ تھے جنہیں اصل حکمت (توحید) تو حاصل نہ تھی مگر اس کے طالب تھے۔ ہم مسلمان لوگ تہذیب وتمدن کے دشمن نہیں بلکہ ہر تہذیب کی اچھائیوں کے قدردان ہیں اس مقام پر ہمارا مقصد یونانی تہذیب کی قدر و قیمت گرانا نہیں اور نہ یونانیوں کی فکری لغزشوں کی فہرست بنا کر پیش کرنا ہی مقصد ہے، بلکہ ہمیں تسلیم ہے کہ یونانیوں نے انسانی زندگی کے بہت سے گوشوں کو نمایاں کر کے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں کوئی ایسا معلم/ رہبر موجود نہیں تھا جو انہیں اللہ کی ہدایت سے روگردانی کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بگاڑ سے آگاہ کرتا۔

ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یونانی معاشرے میں کہاں کہاں بگاڑ تھا اور اس بگاڑ کا کس قدر مواد تہذیب جدید اور فکر مابعد جدید تک منتقل ہوا ہے۔

وثنیت (Idolism)

معبودان کی کثرت ہر جاہل معاشرہ کی مشترکہ خصوصیت رہی ہے البتہ آلہہ کبھی مادی اور محسوس (Concrete) ہوتے ہیں اور کبھی معنوی اور غیر محسوس (Ideologies)۔ یونانی تہذیب وفکر نے غضب یہ کیا کہ تعدادِ آلہہ کے تصور میں دیوتاؤں اور انسان کی کشمکش کا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پرومیتھیس (Prometheus) کی مثال دی جاسکتی ہے جس نے مقدس آگ چرالی تھی۔ پرومیتھیس یونانی صنمیات (Greek Mythology) کا ایک کردار ہے جس سے زیوس (Zeus) دیوتا تخلیق میں انسان کی مدد لیا کرتا تھا۔ پرومیتھیس کو انسان پر رحم آیا اور اس نے انسان کو مقدس آگ چرا کر لادی اس پر زیوس دیوتا نے اسے سزا دی اور اسے زنجیروں میں باندھ کر قفقاز کے پہاڑوں

میں ڈال دیا اور ایک گدھ (vulture) سارا دن اس کا جگر کھاتا رہتا تھا اور رات کو اسے نیا جگر دے دیا جاتا تھا تاکہ آئندہ روز پھر گدھ کھاتا رہے اور اس طرح اسے سزا ملتی رہے۔

The Hutchinson Dictionary of Ideas میں یہ قصہ ان الفاظ میں لکھا ہوا ہے:

"Prometheus: In Greek mythology a titan who stole fire from heaven for the human race. In revenge, Zeus had him chainced to a rock where an eagle came each day to feast on his liver which grew back each night, until he was rescued by the hero Heracles."(11)

یونانی تہذیب و فکر ہمیں بتاتی ہے کہ **انسان اور خدا کے رشتے کی نوعیت تنازع اور طاقت آزمائی کی ہے** کہ انسان نے مقدس آگ کو اس لیے چرایا کہ کائنات کے راز معلوم کر کے خود دیوتا بن جائے اور دیوتاؤں نے اسے وحشیانہ سزائیں اس لیے دیں کہ طاقت کا سرچشمہ ان کے پاس رہے۔

مغربی فکر جدید نے یونانی دیومالاؤں (Mythologies) کے بارے میں بہت موشگافیاں کی ہیں۔ خصوصاً یہ کہانی آج بھی ان کے تجزیہ کا موضوع بنی رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ **جنگ انسان نے اپنے وجود کو ثابت کرنے اور زندگی میں اپنے کردار کو مثبت بنانے کے لیے لڑی تھی اور دیوتا کی یہ نافرمانی دراصل انسان کا اپنے وجود، اپنے کردار اور اپنی ذات کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔** اس وقت ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یونانی فکر آج بھی مغربی فکر پر اثرانداز ہے۔ اگرچہ معلوم تاریخ کی تمام جاہل تہذیبوں میں تعدادِ آلہہ کا تخیل کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ ہی موجود رہا ہے، لیکن یونانی جاہلیت اہل میں دیوتاؤں (gods) اور انسانوں کی کش مکش کا اضافہ کر کے ایک بھیانک بگاڑ کا شکار ہو گئی، اس نے انسان کے حق میں یہ لعنت مقدر کر دی کہ وہ اپنی ذات کے اثبات کے لیے عقیدے کو بھینٹ چڑھا کر اللہ سے جنگ کرے اور اس طرح انسان کو ضمیر کی اس کش مکش سے کبھی بھی نجات نہ مل سکے کہ اس کی فطرت اپنے وجود کو بھی ثابت کرنا چاہتی ہے اور خدا پر ایمان بھی لانا چاہتی ہے۔

فنون لطیفہ (Fine Arts) کے نام پر انسان اپنے ذوق جمال (Aesthetic Sense)

کی جو تسکین کر رہا ہے اس کی ابتدا کی کڑیاں بھی تہذیب یونان میں ملتی ہیں، اس سلسلہ مین جارج سارٹن نے لکھا ہے:

> ''قدیم یونانی اعلیٰ درجے کے مجسمہ ساز تھے، بطلیموس اول نے کوہ اتھوس کی ایک چوٹی کو سکندر اعظم کے دیو پیکر مجسمے کی صورت میں تراش دینے کا اچھوتا خیال سوچا''۔(12)

جارج سارٹن نے اپنی کتاب Introduction to the History of Science میں یونانی دور کا آغاز ہومر (Hommer) سے کیا ہے اور اس کی نظموں Odyssey اور Iliad میں کیا ہے؟ (Troy کے محاصرہ کی رزمیہ داستان) جارج سارٹن کے اپنے الفاظ میں سنیے:

> ''ایلیڈ کی نوعیت اور اس کا لب ولہجہ ایک تاریخی نظم کا ہے، وہ زیادہ مضبوط و منظم اور فی الواقعہ ایک رزم کی داستان ہے۔ اس کے مقابلہ میں اڈیسی ہے۔۔۔ سحر و ساحری اور عشقیہ حکایات سے پُر، معاشرتی زندگی کی زیادہ بہتر ترجمان، اخلاق و توہمات کی آئینہ دار، اور اس لیے تہذیب و شائستگی کی ایک برتر منزل......''(13)

غور فرمایا آپ نے! سحر و ساحری اور عشقیہ حکایات کو جارج سارٹن تہذیب و شائستگی کی برتر منزل قرار دے رہے ہیں

عقل کو معیار (Standard) قرار دینا

بلاشبہ عقل انسانی ایک عظیم ترین طاقت ہے۔ جو اس کائنات میں انسان کے وجود، اس کی فاعلیت اور مؤثریت (Affectivity) ثابت کرنے میں اکردار ادا کرتی ہے۔ لیکن صرف انسانی عقل پر ایمان لانا ایک ایسا بگاڑ ہے جو بالآخر انسان کی قیمت گھٹا کر اسے صرف ''حیوانِ عاقل'' بنا دیتا ہے۔ یونانی تہذیب کو دوسری ٹھوکر یہاں لگی کہ اس نے روح کو قطعاً نظر انداز کر کے عقل کو حد درجہ اہمیت دے دی۔ ان کے یہاں زندگی کے ہر مسئلہ میں عقل کا فیصلہ آخری سمجھا گیا۔ محمد قطبؒ کے مطابق:

> ''مغربی جاہلیت جدیدہ کہتی ہے کہ یونانیوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انسان کی بلندی اور اس کی ایجابیت کو ثابت کیا جائے تاکہ اس طرح زندگی میں انسان کی قیمت گراں ہو سکے۔''(14)

عقل کو اس قدر اہمیت دینے کی وجہ سے وہ تمام عقلی موشگافیاں وجود میں آئیں جن سے یونانی فلسفہ بھرا پڑا ہے۔ جس نے دور مظلمہ (Dark Ages) میں یورپ کی طاقت سلب کیے رکھی اسی عقلیت کا شکار ہو کر اخلاق بھی بجائے ایک عملی محرک ہونے کے، ذہنی تربیت کا ایک معمہ بن کر رہ گئے۔

دین و دنیا کے ہر معاملہ میں جب عقل کو حکم قرار دے لیا گیا تو پھر ہر وجود کے ناپنے کا پیمانہ عقل ہی ٹھہری، حتیٰ کہ اللہ کا بھی اسی قدر وجود قابل تسلیم ہوا جہاں تک عقل کی رسائی ہو سکے۔ اللہ کے وجود اور الہامی احکامات کو جب عقل کے فریم میں نصب کرنے کی کوشش ہوئی تو متضاد قسم کے عقائد مروجہ کے متعلق عام شکوک پھیل گئے۔ ان شکوک کی تائید میں شواہد و دلائل کا انبار جمع ہو گیا اور مختلف مذاہب کے عقائد کے باہمی مقابلہ سے ان نواقض کی بناء پر جو پائے گئے، نوبت کہاں تک پہنچی ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کے الفاظ میں سنیے، ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

> ''مذاہب کے عقائد کے باہمی نواقض کی بنا پر یہ ثابت کیا گیا کہ انسان کے پاس حق وصداقت کا کوئی معیار نہیں، نیکی اور بدی کے خیالات اس دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں، بلکہ محض تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں، اس لیے کہ ایک ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی محض چند اعتبارات کا نام ہے جنھیں بنی نوع انسان نے اپنے فوائد کے لحاظ سے قائم کر رکھا ہے۔
> ایتھنز (Athens) میں بعض فرقے تو یہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف انہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیکھی، ان بوجھی اور فوق القدرت ہستی کا وجود ہو سکتا ہے، بلکہ وہ دنیا کو ایک خوابِ پریشان، ایک خیال موہوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔'' (15)

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ یہی وہ خیالات ہیں جو آج مابعد جدیدیت کی صورت میں Culminate ہوئے ہیں اور انہی سے پھر ہمیں نئے سرے سے سابقہ درپیش ہے۔

یونانی تہذیب کی خصوصیات (مادیت پرستی)

یونانی تہذیب کے تحلیل و تجزیہ کے بعد مولانا علی میاںؒ اس کے مخصوص مزاج کی درج ذیل خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''یونانی تہذیب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲۔ خشوع وخضوع اور ان میں روحانیت کی کمی۔

۳۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمامِ شدید۔

۴۔ حب وطن میں غلو وافراط۔

ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا ''مادیت'' کا لفظ کافی ہے۔''(16)

پروفیسر حسن عسکریؒ ان خصوصیات میں درج ذیل خصوصیات کا اضافہ کرتے ہیں:

۱۔ ''یونانی فلسفیوں کی توجہ کا مرکز انسانی معاشرہ تھا نہ کہ مبدا و معاد۔ یعنی دنیاویت ان میں اچھی طرح جڑ پکڑ گئی تھی۔

۲۔ یونانی ہر مسئلے کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے چنانچہ جب پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپ والوں نے یونانی فلسفے پر زور دینا شروع کیا تو اس تحریک کا نام ہی ''انسانیت پرستی'' (Humanism) قرار پایا۔

۳۔ ارسطو کو عقل کل (Intellect) اور عقل جزوی (Reason) کے فرق کا اندازہ تھا، لیکن مغربی فکر نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ سولہویں صدی سے یہ امتیاز ایسا مبہم ہونا شروع ہوا کہ آخر اٹھارویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کی تحریک یورپ کے ذہن پر غالب آ گئی۔''(17)

مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تصنیفات اور علمی مباحث میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ چند دہائیاں پہلے ڈاکٹر ہاس (Hass) نے جنیوا میں ''یورپی تمدن کیا ہے؟'' کے موضوع پر تین لیکچر دیئے تھے ان کا ایک اقتباس ہم مولانا ندویؒ کے توسط سے پیش کرتے ہیں:

''موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا، اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشوونما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے، جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ

کو خاص اہمیت حاصل تھی، ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈارمہ، فلسفہ، سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی ایک حدِ خاص سے آگے نہیں بڑھنے پائی تھی تا کہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچ پائے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے، نہ باطنیت کا، نہ علمِ دین ہے نہ پیشوایانِ دین کا طبقہ''۔(18)

یہاں ہمارا یونانی تہذیب کا تعارف اپنے اختتام کو پہنچا اب ہم مغربی تہذیب کے دوسرے بڑے عنصر، رومی تہذیب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۲۔ رومی تہذیب

مملکت روما (Roman Empire) تاریخ کی عظیم ترین اور طویل ترین مملکتوں میں سے ایک ہے۔ یہ مملکت کوئی ایک ہزار برس تک قائم رہی۔ رومن تہذیب کا گہوارہ شہر روما تھا۔ اس دوران یونان کی تہذیب زوال پذیر ہو چکی تھی اور اس خلا کو اہلِ روما نے پر کیا۔ ڈاکٹر افتخار حسین کو اپنے مطالعاتی دوروں کے سلسلے میں دو مرتبہ رومۃ الکبریٰ کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا، وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''سوادِ رومۃ الکبریٰ میں مَیں نے جو کچھ دیکھا اس میں وہ پہلو زیادہ اہم ہے جس پر تاریخ میں طنز ملتا ہے۔ میں نے وہ اکھاڑے (Theatre) بھی دیکھے جہاں رومن انسانوں کو انسانوں سے لڑاتے تھے اور اس طرح لڑواتے تھے کہ دو آدمی اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کوئی ایک دوسرے کو قتل نہ کر دے۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے ہیں جہاں بے دست و پا انسانوں (Gladiators) کو بھوکے آدم خور شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ میں نے وہ فورم (Forum) بھی دیکھا ہے، جہاں روما کے اہم سیاسی مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں اور عوام کے نمائندے ایسی مؤثر تقریریں کرتے تھے جو تاریخ اور ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔''(19)

مملکت روما حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے ذرا پہلے قائم ہوئی اور آنحضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل زوال آمادہ ہو کر ختم ہو گئی۔

رومی تہذیب کی درج ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

دنیاوی اور ظاہری امور پر توجہ

دنیا اور خصوصاً یورپی تہذیب وفکر پر اہل روما کے اثرات بہت دوررس ہیں۔ مملکت روما نے دنیا کو بہت کچھ دیا۔ رومن قانون اس قدر جامع تھا کہ دو ہزار سال گزرنے کے بعد بھی یورپ میں اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس قدر وسیع، طاقتور اور پرشکوہ مملکت کو زوال کیسے آ گیا اور وہ کیسے مٹ گئی؟ یہ روداد بیان کرنے کے سلسلے میں ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کی کتاب Decline and Fall of the Roman Empire تاریخ عالم کا ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کا ایک عظیم شہ پارہ تسلیم کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر افتخار کے توسط سے ہم گبن کے الفاظ درج کرتے ہیں جو اس نے رومن تہذیب کی خوبیاں یا خامیاں گنواتے ہوئے لکھے ہیں گبن لکھتا ہے:

> "رومن علم وحکمت سے کم دلچسپی رکھتے تھے اور سپہ گری، فنون لطیفہ، شاعری، خطابت، موسیقی، فن تعمیر اور کھیل تماشے کی طرف زیادہ راغب تھے۔" (20)

رومی لوگوں کی توجہ دنیاوی امور پر زیادہ تھی یہ لوگ سلطنت قائم کرنے اور نظم ونسق ٹھیک کرنے کے ماہر تھے۔ ان کی ذہنی طاقت زیادہ تر قانون سازی اور تنظیمی ادارے بنانے میں صرف ہوتی تھی۔ مغرب کے ذہن پر رومی اثر اتنا شدید تھا کہ جب عیسائیت یورپ پہنچی تو اس نے بھی ایک ادارے یعنی کلیسا کی شکل اختیار کر لی، پھر عیسوی عقائد بھی قوانین کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ روم کے لوگوں نے فلسفے یا فکر میں کوئی اضافہ نہیں کیا، اس معاملے میں یہ لوگ یونان کے مقلد تھے۔ یونانی فلسفے کا بھی انہوں نے صرف خارجی اور ظاہری پہلو لیا۔ بلکہ صرف وہ اصول اخذ کیے جن کا تعلق فرد یا معاشرے کی ظاہری زندگی سے تھا۔ اگر مغرب میں ظاہر پرستی بڑھ گئی ہے تو اس میں رومی لوگوں کی ذہنیت کا بھی بڑا دخل ہے۔ رومی لوگوں کا اصلی خدا، وطن تھا یا قوم۔ فرد سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی ہر چیز قوم یا وطن یا سلطنت کے لیے قربان کر دے۔

مذہب سے بے رغبتی

رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب وعقائد میں راسخ الایمان نہ تھے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی نتیجتاً فطری تھا کہ جوں جوں وہ علم میں ترقی کرتے جائیں ان کے دماغ روشن ہوتے

جا میں اتنی ہی مذہب کی بے توقیری اوراس کی عظمت میں کمی واقع ہوتی جائے۔اور یہ گویا انہوں نے پہلے ہی دن سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں (gods) کو امورِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ سسرو (Cicero) بیان کرتا ہے کہ:

''تھیٹر میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیاوی معاملات میں کوئی دخل نہیں تو لوگ انہیں نہایت ذوق وشوق سے سنتے تھے۔''(21)

سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) وغیرہ حسرت سے کہتے ہیں کہ:

''یہ رومن بت پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے مگر تھیٹروں میں ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔''(22)

رومی مذہب کی گرفت اپنے پیروؤں پر اتنی ڈھیلی ہوگئی تھی اور جذبۂ مذہب اتنا سرد پڑ چکا تھا کہ لوگ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور اشتعال میں آ کر گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔اس سلسلہ میں ہم ایک دفعہ پھر ''تاریخ اخلاق یورپ'' کے مصنف کے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔لیکی لکھتا ہے کہ:

''مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہوگیا۔جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا اوراس کے مظاہر تقریباً ہر شخص کو نظر آنے لگے۔چنانچہ جب آگسٹس (Augusts) کا بیڑہ غرق ہوگیا تو اس نے غصے میں آ کر نیپچون (Neptune) (سمندروں کے دیوتا) کے بت کو مسمار کر دیا۔جب جرمینیس (Germanus) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کی قربان گاہوں پر خوب پتھراؤ کیا۔''(23)

اخلاقی انحطاط وشہوانیت

رومی اپنی تہذیب کے آخری دور میں اخلاقی انحطاط،حیوانی ہوس رانی اور تعیش کے سیلاب میں ڈوب گئے۔وہ اخلاقی نظام وضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی،خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا تزلزل آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آ رہتے۔ڈاکٹر ڈریپر جن کا ہم پیچھے بھی ذکر کر آئے ہیں۔اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''معرکۂ مذہب وسائنس'' میں اس کی قلمی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

''جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما منتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہنچ گئی، اہل روما کی عیش پرستی اور عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ عیش بنا دے۔ پاک بازی، حظ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے اور اعتدال سلسلہ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے۔ ان کے دستر خوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی، جھلکتے نظر آتے تھے۔ ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ہوئے ان کی خدمت کے لیے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے۔

ماہر ُویان روما (Beauties of Rome) جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر سے آزاد تھیں، ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لیے محوِ ناز رہتی تھیں۔ عالی شان حماموں، دل کشا تماشا گاہوں اور جوش آفرین دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے، اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک محوِ زور آزمائی رہتے تھے، جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لیے خاک وخون میں سونہ جائے، اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحین کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ ''قوت'' (Power) ہے۔ اس لیے کہ اسی قوت کی بدولت اس تمام سرمایہ کا حاصول ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے۔ مال اور املاک کی ضبطی، صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص، زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے۔ غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ وجلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھا گیا تھا۔'' (24)

اب تہذیب، مسیحیت اور کلیسا کے رحم وکرم کے حوالے ہوتی ہے لہٰذا ہم اپنی توجہ ازمنۂ وسطیٰ کے عیسوی دور کی طرف مبذول کرتے ہیں۔

۳۔ مسیحیت اور کلیسا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام ادیان کی طرح مسیحیت بھی عقیدہ اور شریعت پر مشتمل

تھی۔ ہر چند کہ انجیل (25) میں زیادہ تفصیلات نہیں تھیں اس لیے تورات کو بنیاد بنا کر بعض احکام میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی۔

چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے:

ومصدقالما بین یدی من التوراۃ ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم.(26)

ترجمہ: انجیل تصدیق کرنے والی ہے، اپنے سے پہلی کتاب تورات کی، تاکہ حلال کر دے بعض ان چیزوں کو جوتم پر حرام کر دی گئی تھیں۔

لیکن ڈاکٹر ڈریپر کے الفاظ میں:

''سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت رومتہ الکبریٰ نے دنیا کے لیے چھوڑا۔''(27)

ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا وہ ہے، عیسائیت کا بت پرست روما کے تختِ سلطنت پر فائز ہو جانا۔ وہ واقعات جنہوں نے مذہب مسیحی کی رہنمائی کی اور بے شمار مصائب کے مقابلے میں انجام کار اس کی فتح ونصرت کا باعث ہوئے، ایسے ناقابل یقین ہیں کہ مسیحیت کے وکیل انہیں اپنے مذہب کی صداقت وفوقیت کی برہان قاطع کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایک عجیب وغریب مگر موثر حقیقت، ابتدائی زمانے میں سب سے مسکین سمجھے جانے والے افراد کا سر بلند ہونا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ قسطنطین اعظم (Constantine the Great (280-337) جس نے مسیحیت قبول کر لی تھی، 305ء میں روما کے تخت پر بیٹھا۔ اس طرح مسیحیت کو ایسی وسیع سلطنت اور وسیع اختیار واقتدار حاصل ہو گیا جس کا خواب وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ چونکہ قسطنطین کو عیسائیوں کی سرفروشی، فداکاری اور زبردست قربانیوں کے بعد تختِ سلطنت ہاتھ آیا تھا، اس لیے اس نے عیسائیوں کو پورا صلہ دیا اور سلطنت میں پورے طور پر شریک اقتدار کیا۔ اس بارے میں جارج سارٹن رقمطراز ہیں:

''یہ انقلاب جس نے ساری دنیا کی کایا پلٹ دی، بیشتر ان لوگوں کی وساطت سے عمل میں آیا جو معاشرے میں سب سے کم اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ فقط ایک عرصے کے بعد اور آہستہ آہستہ ہی ذی وجاہت لوگوں نے سائلین مسیحیت میں شامل ہونا شروع کیا۔ اس انقلاب کا آغاز بڑی خوبصورتی سے ایک ادنیٰ درجے کی عورت نے کیا۔ یہ مسماۃ ھلینا (28)

(St. Helena 248-328) کہتے ہیں کہ ایک بھٹیارے کی بیٹی اور ایک رومی سردار کونس ٹن ٹیوس (Constantius) کی داشتہ (Mistress) بن گئی تھی۔ان کے ہاں ایک بیٹا 280ء میں بمقام یارک (York)، قسطنطین پیدا ہوا جس کے بعد ماں باپ نے باقاعدہ شادی کر لی۔ لیکن 292ء میں جب سردار موصوف ''قیصر یت'' کے مرتبے پر فائز کیا گیا تو اسے زیادہ معزز خاندان میں شادی کرنے کی خاطر ہلینا کو چھوڑ دینا پڑا۔ یہ کونس ٹن ٹیوکلورس 305ء یا 306ء تک بادشاہ رہا اس کا فرزند قسطنطین اعظم ہوا جس نے 306ء سے 337ء تک حکومت کی۔اسی بادشاہ نے مسیحیت کی سب سے پہلے حمایت کی اور مسیحیت کو سرکاری مذہب تسلیم کر لیا۔ قسطنطین اپنا دارالحکومت روم سے بدل کر بازنطہ کے مقام پر لے گیا اور وہاں مقدس دوشیزہ (Holy virgin) (حضرت مریمؑ) کے نام پر نیا شہر آباد کیا جسے خود بادشاہ کے نام پر قسطنطنیہ (Constantinople) کہا جانے لگا یہ رومی بادشاہ اگرچہ ''اعظم'' (Great) کے لقب سے ملقب ہوا، لیکن حقیقتاً گھٹیا آدمی تھا۔ مرنے سے تھوڑے ہی دن پہلے اسے قیصریہ کے پادری یوسبیوس (4thc.) نے نکومیدیہ کے مقام پر 337ء میں اصطباغ دیا تو اس کے بہت سے جرائم اور کبائر دھل گئے۔ وہ اپنے شہر قسطنطنیہ میں دفن ہوا۔''

جارج سارٹن مزید لکھتے ہیں:

''ممکن ہے قسطنطین نے اپنی ماں کو 306ء یا کچھ بعد شاہی محل میں بلوا لیا ہو اور خود عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد اسے بھی عیسائی بنا لیا ہو۔ (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماں نے خود اسے عیسائی بنایا تھا) غالباً قسطنطین کے مختلف جرائم کا ارتکاب کرنے کی بناء پر اس نے منت مانی اور اسی سالہ ہونے کے باوجود ارض مقدس کی زیارت کرنے گئی۔اس نے حج کی تکمیل کی اور 3 مئی 326ء کے دن یروشلم (بیت المقدس) میں ''اصلی صلیب'' کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ 327ء یا 328ء میں اس کا انتقال ہو گیا مگر وفات اور دفن کے مقامات نامعلوم ہیں۔ وہ ملکہ سلطنت تھوڑے دن کے لیے بھی نہیں بنی مگر آخرکار ہمیشہ کیلئے مقدس ولیہ (Saint) بنا دی گئی۔'' (29)

درج بالا اقتباس پڑھ کر ہو سکتا ہے کہ کسی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اردو ترجمہ میں کمی بیشی کر دی گئی ہوگی۔ آیئے دورِ جدید کی ایک معتبر کتابِ حوالہ (Reference Book)، Helicon Dictionary of Ideas کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کتاب مذکورہ میں آرٹیکل بعنوان Constantine the Great اس طرح معلومات فراہم کرتا ہے:

"First Christian Emperor (c.AD 280-337) of Rome and founder of Constantinople. He defeated maxentius (joint emperor of Rome AD 312 and in 313) formally recognized Christianity. As sole emperor of the west of the empire, he defeated Licinius emperor of the East, to become ruler of the Roman World 324. He Presided over the Church's first council an Nicaea 325. Constantine moved his capital to Byzantium on the Bosporus 330, renaming it Constantinople (Now Istanbul).

Constantine was born at Naissus (Nis, Yugoslavia), the son of constantius. He was already well known as a soldier when his father died in York in 306 and he was acclaimed by the troops there as joint emperor in his father's place. A few years later Maxentius, the joint emperor in Rome (Whose sister had married constantine), challenged his authority and mobilized his armies to invade Gaul. Constantine won a crushing victory outside Rome in 312. During his comaign he was said to have seen a vision of the cross of Jesus superimposed upon the sun, accompanied by the words: In this sign, conquer, by the Ediet of Milan 313 he formally recognized Christianity as one of the religions legally permit within the Roman Empire and in 314 he sumtedmoned the bishops of the western world to the council of Arles, However, there has never been agreement on whether Constantine adopted Christianity for reasons of faith or as an act of imperial absolutism to further his power. Constantine increased the autocratic power. He summoned, and presided over, the first general counsel of the Church in Nicaea 325."(30)

مسیحیت میں بت پرستی کی آمیزش

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ بت پرست رومی قسطنطین نے سیاسی وجوہات کی بناء پر مسیحیت کے سر پر ہاتھ (Adopted) رکھا تھا۔ جبکہ بباطن بت پرست ہی رہا اس لیے مذہب عیسوی کے لیے یہ بڑا نامبارک واقعہ ثابت ہوا جس نے سلطنت تو حاصل کر لی لیکن بڑی قیمتی مذہبی متاع (توحید) کھو دی۔ رومی بت پرستوں اور خود عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ ڈریپر لکھتا ہے:

> ''فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا، اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہو گئے چونکہ وہ بظاہر عیسائی اور بباطن مشرک و بت پرست تھے۔ لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔
>
> قسطنطین نے جہاں گرجا تعمیر کیے، بت پرستوں کے لیے مندر بھی بنوا دیے۔ نیقیا (Nicaea) کی مسیحی کونسل منعقد کی تو دولت کے بت پر چڑھاوے بھی چڑھائے۔ قسطنطنیہ میں اپالو (Apollo) دیوتا کا مجسمہ نصب کروایا اور سر کے گرد گردوہ میخیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا تھا کہ مسیح کو مصلوب کرتے وقت ٹھونکی گئی تھیں، ایسی صنعت کاری گری سے جمائی گئیں کہ عظمت وجلال کے تاج کی شکل پیدا ہو گئی۔'' (31)

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مسیحیت کے ساتھ بت پرستی کے شامل کر دینے سے بالآخر لوگ عقل کی تذلیل کے گڑھے میں جا گرے تھے۔ بت پرستی کی رسموں کو مذہب میں داخل کر دیا گیا تھا، دوسرے یہ کہ **مسیحیت جب کامیابی کے دور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس برائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔** اولیاء پرستی نے قدیم معبودوں کی جگہ لے لی۔ ہورس (Horus) اور آئسس (Isis) کے مجسموں کی جگہ مسیحؑ اور مریمؑ کے بت پوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ ایک دفعہ پھر ڈاکٹر ڈریپر کی طرف رجوع کرتے ہیں:

''گرجا شہدا کے مزاروں پر بنائے جانے لگے۔ پادریوں نے پر تکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیے۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں کسی ولی، شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً ان کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دیے گئے۔ مورتوں، صلیب کے ٹکڑوں، ہڈیوں، میخوں اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام ہوگئی۔ ان آثار متبرکہ کی تصدیق کا انحصار دو براہین پر تھا یعنی پادریوں کا حکم یا معجزات کا اظہار۔''(32)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جنہوں نے ارض القرآن کا مطالعاتی دورہ کیا تھا اس سلسلہ میں اپنے مشاہدات قلم بند فرماتے ہیں:

''ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ میں نے خود کوہ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن (St. Catherine) کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے۔ جس میں کہیں اولیاء کی کھوپڑیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ کہیں پاؤں کی ہڈیاں اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں اور ایک ولی کا تو پورا ڈھانچہ ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا۔''(33)

بت پرستی اور مسیحیت کا یہ مرکب جس سے مسیحی مذہب کی روح اور اس کا حسن نکل چکا تھا اس پر مستزاد مسیحیوں نے یہ غضب کیا کہ ''رہبانیت'' کی بدعت ایجاد کر لی جو شاید انسانیت و تمدن کے حق میں بت پرست روما کی حیوانیت سے زیادہ وبالِ جان ثابت ہوئی۔ یورپ کی مادہ پرستی اور لادینیت میں اس مردم آزاد، آدم بیزار و دشمنِ فطرت رہبانیت کو بہت کچھ دخل ہے اس لیے کچھ تفصیل رہبانیت کی بھی پیش خدمت ہے۔

رہبانیت کی بدعت

حضرت عیسیٰؑ کے رفع آسمانی کے بعد مسیحیت میں جو بگاڑ رونما ہوئے ان میں ایک رہبانیت کی بدعت بھی تھی۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں نصاریٰ کی بدعتِ رہبانیت کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کرتا ہے:

'' ورھبانیۃً ابتدعُوھا ما کتبنھا علیھم الا ابتغآءَ رضوان اللہ فمارعوھا حقَّ رِعَایتِھاج''(34)

ترجمہ: اور رہبانیت (ترک دنیا) جو انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے ایسا کر تو لیا مگر اسے نباہ نہ سکے جیسا کہ نباہنے کا حق تھا۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں رأس المفسرین حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''جب بنی اسرائیل کے بادشاہوں نے توریت وانجیل میں تبدیلیاں کر لیں تو کمزور لوگوں کی ایک جماعت اٹھی ان میں طاقت نہ تھی کہ اصل دین کے احکام کی تبلیغ ان ظالموں میں کریں۔ اسی لیے ان لوگوں نے اپنے دین کا بچاؤ اس میں سمجھا کہ جنگلوں میں نکل جائیں اور پہاڑوں پر چڑھ جائیں، عبادت میں مشغول ہو جائیں اور دنیا ترک کر دیں۔'' (35)

امام ابو بکر جصاص حنفیؒ (م 370ھ) اس آیت کی تفسیر میں درج ذیل اثر لائے ہیں:

''حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے کچھ نئی عبادتیں ایجاد کر لیں جنہیں اللہ نے ان پر واجب نہیں کیا تھا، وہ ان عبادتوں کے ذریعے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن پھر انہوں نے ان کی پوری پوری رعائت نہیں کی۔ اللہ نے ان کے ترک پر ان لوگوں کی مذمت کی''۔ (36)

واضح رہے جتنے بھی بدعتی کام کسی بھی دین میں شروع کیے جاتے رہے ہیں وہ ہمیشہ نیک آرزوؤں اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر ہی شروع کیے جاتے ہیں اور یہی شیطان کا فریب ہوتا ہے جسے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

مفسر قرآن مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ اس آیہ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''رہبانیت کے نام پر ان لوگوں نے اپنے آپ پر چار قسم کی پابندیاں عائد کی تھیں جنہیں مختصراً چہار ترک (چار قسم کی چیزوں کو چھوڑ دینا) کا نام دیتے ہیں (۱) ترکِ دنیا، یعنی دنیا کی تمام لذات کو چھوڑ دینا (۲) ترکِ عقبیٰ؛ یعنی آخرت کی جزا وسزا سے بے نیاز ہو جانا (۳) ترک اکل ونوم یعنی کم سے کم کھانا پینا اور کم از کم آرام کرنا اور (۴) ترک خواہش نفس یعنی جو کچھ انسان کا جی چاہے اس کے برعکس کرنا۔'' (37)

رہبانیت کی تاریخ اور واقعات بیان کرنے میں جب تک سید مودودیؒ کی تفہیم القرآن کا ذکر نہ کیا جائے ہماری گفتگو تشنہ رہے گی۔ سید مودودیؒ رہبانیت کی تاریخ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے ناآشنا تھا مگر ابتداء ہی سے مسیحیت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے۔ کلیسا میں مذہبی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں۔ اس چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیل گئی۔ اسی طرح عوام چونکہ اس شخص کو خدارسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اسی لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔

مسیحی علما نے رہبانیت کا فلسفہ اور اس کا طریق کار بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری فقرا (Anchorites) سے ایران کے مانویوں سے اور افلاطون اور افلاطینوس کے پیرو، اشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیہ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی (یعنی نزول قرآن کے زمانے) تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں... سینٹ اتھاناسیوس، سینٹ باسل، سینٹ گریگوری، سینٹ کرائی سوسٹم، سینٹ ایمبروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بنی ڈکٹ، گریگوری اعظم... سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے، انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔''

مولانا مزید لکھتے ہیں:

"اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جنہیں ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(1) سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیت دینا مثلاً سکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت اپنے جسم پر 80 پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کا مرید سینٹ یوسیبیس 150 پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا اور 3 سال ایک خشک کنویں میں پڑا رہا

۔سینٹ بیساریوں 40 دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور 40 سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ ایک ولی جان (John) تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹ (449-390ء) ایک دفعہ پورے سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا پھر اس نے شمالی شام کے قلعہ سیمان کے قریب 60 فٹ بلند ایک ستون بنوایا۔ جس کا چبوترہ تین فٹ قطر کا تھا اس ستون پر اس نے پورے تیس سال گزارے۔ دھوپ، بارش، سردی، گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھی اور وہ کبھی ستون سے نہ اترتا تھا اس کے مرید سیڑھی لگا کر اسے کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے پھر اس نے ایک رسی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسی اس کے گوشت میں پیوست ہوگئی، گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں میں سے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا ''کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے''۔ مسیحی عوام دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔ اس دور کے عیسائی اولیا کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ کسی ولی کی یہ تعریف تھی کہ 30 سال تک وہ بالکل خاموش رہا کسی نے اپنے آپ کو چٹان سے باندھ رکھا تھا، کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا، کچھ حضرات جانوروں کے بھٹوں، خشک کنوؤں یا پرانی قبروں میں رہتے تھے اور کچھ دوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے۔''

معاف کیجیے! تفہیم القرآن سے اقتباس طوالانی ہوتا جا رہا ہے لیکن میں اس معاملے میں معذور ہوں کیوں کہ میں نے رہبانیت کی تاریخ کا مطالعہ مسیحی ذرائع (Sources) سے بھی کیا ہے ۔مختلف مسلم علماء کی خوشہ چینی بھی کی ہے لیکن جس شاندار اور جامع انداز میں مولانا مودودیؒ نے داستان لکھ دی ہے یہ انہی کا خاصہ ہے۔ لہٰذا آئیے! ایک بار پھر تفہیم القرآن کی ورق گردانی کرتے ہیں:

(2) ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ سینٹ اینتھونی (St. Anthony) کی یہ خوبی بیان کی جاتی ہے کہ اس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام (St. Abraham) نے پورے پچاس سال تک نہ منہ دھویا اور نہ پاؤں۔ ایک مشہور کنواری راہبہ سلویا (Silvia)

نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے علاوہ جسم کے کسی حصے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانونیٹ (Convent) کی 130 راہبات کی تعریف میں لکھا ہے، غسل کا نام سن کر ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

(3) اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا۔ تجرد کو سب سے بڑی اخلاقی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ عورت اور مرد کے شادی کے تصور کو نجس خیال کیا جاتا تھا۔ سینٹ امون (St. Ammon) نے شادی کی پہلی رات ہی دلہن کو ازدواجی تعلق کی نجاست پر وعظ سنایا اور دونوں بالاتفاق جیتے جی ایک دوسرے سے الگ رہے۔ سینٹ ابراہام (St. Abraham) شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

(4) سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں، باپ، بہن بھائی اور اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں ان تمام رشتوں کی محبت گناہ تھی۔ ایک راہب ایواگرس (Evagrius) سالہا سال صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا اس کے پاس اس کے ماں باپ کے خطوط پہنچے، اس نے ان کو کھولے بغیر آگ میں جھونک دیا۔

اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سیمون (St. Simeon Stylites) کا ہے، جو ماں باپ کو چھوڑ کر 27 سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا، ماں زندہ تھی، ولائت کے تذکرے سن کر ملنے آئی مگر اس ''ولی اللہ'' نے صورت دکھانے سے انکار کر دیا، ماں تین رات اور تین دن خانقاہ کی دہلیز پر پڑی رہی آخر کار وہیں لیٹ کر اس نے جان دے دی۔

(5) انسانی جذبات کو کچلنے کی مشق کے نتیجے میں ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلافات ہوتے تھے ان پر ظلم وستم کی انتہا کر دیتے تھے، اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب تھے مخالفین کو زندہ جلانے کے متعدد واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔

366ء میں پوپ لبیریس (Liberius) کی وفات پر دو مخالف گروہوں نے پاپائی کے لیے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے، دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی، حتیٰ کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے 137 لاشیں نکالی گئیں۔''

(6) ترک وتجرد کی آڑ میں دولتِ دنیا بھی خوب سمیٹی گئی روم کا بشپ (Bishop) بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا اور اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر سے کم نہ تھے۔

[مذہبی عہدہ دار سخت راشی دسود خور تھے۔فضول خرچی اوراسراف کا حال یہ تھا کہ پاپائے ہشتم انوسینٹ (Innocent VIII) نے پاپائی کا تاج رہن رکھا۔اور پاپائے لیو دہم (Lio X) کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا دی، لی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی پہلے وہ خرچ کی ،اس کے بعد اپنی دولت بھی جب کافی نہ ہوئی تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی۔(38)]

یہ بات عوام کے ذہن نشین کروادی گئی تھی کہ جس کسی سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے یا خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے سے ہی ہو سکتی ہے۔

(7) عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑکر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی۔ فلسطینی خانقاہوں میں راہب اور راہبات نفس کشی کے لیے بسا اوقات ایک بستر پر سوتے، اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے راہب عورتوں کے ساتھ یکجا غسل کرتے تھے۔اور ان کی دید سے، ان کے لمس سے، حتیٰ کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی۔غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا، مگر نفس کشی کی مشق کے لیے اس طرح غسل بھی کرلیے جاتے تھے۔ آخر کار اس فلسطین کے متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری (396ء) لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈا بن گیا۔ انسانی فطرت کبھی ان لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑکر بالآخر بداخلاقی کے جس گڑھے میں جاگری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنماترین داغ ہے۔ قرون متوسط کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں، ان کی چاردیواری میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہو رہا ہے، پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلق اور خانقاہوں میں خلاف وضع فطری جرائم [Lesbian / Gay] پھیل گئے ہیں، اور کلیسا میں اعتراف گناہ (Confession) کی رسم بدکاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔" (39) ملخصاً

رہبانیت کی خرابی کا یہ صرف ایک پہلو ہے اور جو خرابیاں اس مسلک سے عام معاشرہ میں پیدا ہوئیں وہ یہ ہیں:

1 معاشرہ میں جو خدا ترس لوگ تھے وہ اپنی اس غلط روش کی بنا پر معاشرتی ذمہ داریوں اور دوسرے انسانی تعلقات سے ایک طرف ہو گئے۔ جس سے اخلاق وتمدن، سیاست اور اجتماعیت کی جڑیں تک ہل گئیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت عیار اور ناخدا ترس لوگوں نے سنبھال لی۔ دنیا میں ''فساد فی الارض'' کا دور دورہ ہو گیا اور اللہ کے بھیجے ہوئے پیغام ہدایت اور ضابطہ حیات کی انہی بزرگان دین کے ہاتھوں بیخ کنی ہوئی۔

2 راہبوں کی اس روش کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ دین اور دنیا دو الگ چیزیں ہیں۔ دین یا مذہب تو محض پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا نام ہے اور مذہب کا تعلق بس اسی حد تک ہے۔ رہا دنیا کا کاروبار تو اس میں ہر شخص آزاد ہے معاشرتی تعلقات یا ضابطہ اخلاق کی اگر کچھ اہمیت ہوتی تو یہ خدا رسیدہ لوگ اس سے کیوں منہ موڑ لیتے؟ پھر چونکہ ان راہبوں کی روش شریعت الٰہیہ کے برعکس تھی لہٰذا نتیجتاً مذہب کا شیرازہ بکھر گیا۔

غرض یہ کہ کلیسا کی تاریخ اور ارباب کلیسا کی سیرت قرآن کی اس آیت کی پوری تفسیر تھی:

''یاایھا الذین امنو ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ ''(40)

ترجمہ: مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق و ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں۔

حکومت وکلیسا کی آویزش

نصرانی کلیسا نے مذہب جیسی عظیم نعمت کو اپنی کج فہمی، تنگ نظری اور خود غرضی کی بناء پر آلودہ کیا اور اس سے وہ کام لیا جو اس کا مقصد کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔یعنی مذہب کو استحصال، ظلم و تشدد، استعمار اور زرگری کے لیے استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات تو مذہب اور ریاست دونوں تباہ ہو گئے اور بعض اوقات مذہب کو عروج حاصل ہوا۔ ڈاکٹر افتخار حسین مملکت روما کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مملکت روما کا زوال مذہب کے عروج اور ریاست کی تباہی کی ایک نہایت عبرتناک مثال ہے چنانچہ مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ: **'میں نے مملکت روما کے زوال کی تاریخ میں مذہب اور بربریت کی فتح کی داستان بیان کی ہے'** گبن کا یہ جملہ طنز اور بے رحم حقیقت پسندی کی وجہ سے ایک کلاسیکی جملہ تسلیم کیا جاتا ہے۔''(41)

گیارویں صدی عیسوی میں حکومت وکلیسا کی کشمکش شروع ہوئی اور اس نے بڑی شدت اختیار کرلی۔ابتدا میں پوپ کو اس جنگ میں فتح ہوئی اور اس کا اقتدار واعزاز بڑھ گیا۔سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''حکومت وکلیسا کی کش مکش میں پوپ کی فتح ہوئی اور شاہ ہنری چہارم (Henry-IV) 1077ء میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کانوسا (Canossa) کے قلعہ میں پوپ کے حضور حاضر ہو، چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا، پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی سفارش پر اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شاہ ننگے پاؤں اون پہنے ہوئے آیا، پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے اس کی غلطی معاف کی۔''(42)

اس کے بعد حکومت وکلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو فتح ہوئی اور کبھی شکست، یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا کو دبنا پڑا۔اس پوری مدت میں لوگ مذہب وسیاست (کلیسا وریاست) کی دوہری غلامی میں پستے رہے۔

کتب مقدسہ میں ردوبدل

پہلے یہود بعد میں نصاریٰ کے علماء حماقت اور رذالت کے جس گڑھے میں گرے اس کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدھم، ثم یقولون ھٰذا من عنداللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون".(43)

ترجمہ: پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو لکھتے ہیں تحریر خود اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔تاکہ حاصل کریں اس کے بدلے میں حقیر معاوضہ۔ سو تباہی ہے ان کے لیے اس بناء پر جو لکھا انہوں نے اپنے ہاتھ سے اور ہلاکت ہے ان کے لیے اس بناء پر جو وہ کماتے ہیں۔

کتب مقدسہ میں الحاق وتبدل کی مختلف وجوہ تھیں یہ تحریف وتبدل خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے بہر حال یہ ایسی خطرناک غلطی تھی جس سے انہوں نے اس مذہب کو جس کے وہ نمائندے تھے اور خود اپنے کو سخت ترین نقصان پہنچایا۔ **انہوں نے اپنی مقدس دینی کتابوں میں ان تاریخی، جغرافیائی اور طبعی نظریات اور مشہورات کو داخل کر دیا جو اس دور کی تحقیقات اور مسلمات تھے اور اسی علم کی آخری حد سمجھے جاتے تھے۔** لیکن یہ ان کی سب سے خطرناک غلطی تھی جس نے آنے والے دور میں مذہب کو سائنس کے بالمقابل کھڑا کر دیا اور نتیجتاً مذہب (مزعومہ) کو بدترین شکست و ہزیمت سے دوچار ہوا پڑا۔ اور یورپ میں اہل مذہب اور مذہبی نظریات کو ایسا زوال ہوا کہ جس کے بعد عروج نہ ہو سکا۔ اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ یورپ مذہب بے زار اور لادینی ہو گیا۔

بدبخت اہل مذہب نے محض تحریف والحاق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام جغرافیائی، تاریخی اور طبعی معلومات کو، جن کا شارحین ومفسرین کتب مقدسہ نے ذکر کیا تھا، دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا اور ان کو مذہبی تقدس کا مقام دے کر ان پر اعتقاد رکھنا فرض قرار دیا۔ اور اس جغرافیہ کو جس کی کوئی آسمانی سند نہ تھی جغرافیہ مسیحی (Christian Topography) کا نام دیا جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا ان کی تکفیر کی اور بدترین ایذا رسانی (Persecution) کا نشانہ بنایا۔

معرکۂ مذہب وسائنس اور اہل کلیسا کا جبر واستبداد

ایک طرف یہ حال تھا کہ مذہبی انتہا پسندوں کی طرف سے صاحب شعور لوگوں کو تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا دوسری طرف یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں عقلیت (Rationalism) انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔ بلکہ بقول بعضے "عقلیت کا کوہِ آتش فشاں پھٹ چکا تھا"۔ علماء طبیعیات اور محققین تقلید کے پٹے اپنے گلے سے اتار چکے تھے۔ انہوں نے تجربات ومشاہدات کی بناء پر ان بے اصل نظریات کی تردید کی جو جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے اور بڑی جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کا علمی تجزیہ کیا اور ان کو غلط ثابت کر کے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ مشہور فرانسیسی سرجن اور نومسلم ڈاکٹر موریس بوکائلے اپنی شہرہ آفاق تصنیف (La Bible le Coran et la Science) جس کا ڈاکٹر موصوف نے الاستیر ڈی پانیل کی شراکت میں The Bible the Quran and the Science کے عنوان سے

انگریزی میں ترجمہ کیا (اور اس کتاب کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"آج کل یہ بات ناممکن ہے کہ بائبل میں سائنسی تسامحات کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے لہٰذا ہم ژین گنیوں (یورپی نومسلم؛ عبدالواحد یحییٰ) سے اس معاملہ میں متفق ہیں کہ "بائبل میں سائنسی تسامحات انسانوں کی غلطیاں ہیں، اس لیے کہ زمانہ قدیم میں انسان عالم طفولیت میں اور سائنس سے نابلد تھا۔"(44)

زمانہ چونکہ نئی کروٹ لے چکا تھا، ذہن انسانی عالم طفولیت سے ارتقائی منازل طے کر کے دور بلوغت میں داخل ہو چکا تھا اس لیے ان محققین نے نہ صرف بائبل کے دعاوی کا انکار کیا بلکہ اپنی تحقیق کے نتائج کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا۔ اب کیا تھا مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہو گئی ارباب کلیسا نے (جو اقتدار کے مالک تھے) ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی (دین سینٹ پال؟) کے لیے ان کا خون بہانے اور ان کے مال و متاع ضبط کر لینے کی اجازت دی۔ احتساب عدالتیں (Inquisition Courts) قائم ہوئیں، جو بقول پوپ کے "ان ملاحدہ اور مرتدین کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ احتساب عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا۔ احتساب عدالتوں کا تھوڑا سا تعارف The Hutchinson Dictionary of Ideas سے Inquisition کی Entry کے تحت درج ہے۔

"Tribunal of the Roman Catholic Church established in 1233 to suppress heresy (dissenting views) originally by excommunication. Sentence was pronounced during a religious ceremony, the auto-da-fe. (act of faith; religious ceremony, including a procession, solemn mass, and sermon, which accompanied the sentencing of heretics by the Spanish inquisition before they were handed over to the secular authorities for punishment, usually burning). The Inquisition operated in France, Italy, Spain and the Holy Roman Empire and was especially active following the refomation; it was later extended to the

Americas. Its trials were conducted in secret, under torture, and penalties ranged from fines, through flogging and imprisonment, to death by burning.

During the course of the Spanish Inquisition, until its abolition 1834, some 60,000 cases were tried. the Roman Inquisition was established in 1542 to combat the growth of Protestantism. The Inqyisition or Holy office (remaned sacred congregation for the Doctrine of the faith 1965, still deals with ecclesiastical discipline." (45)

Oxford Advanced Learner's Dictionary میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

"Inquisition: the organization appointed by the Roman Catholic Chruch to suppress people who opposed its beliefs, esp. from the 15th to the 17th century."(46)

مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''احتساب عدالتوں کے جاسوس براعظم یورپ کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارے میں محکمہ احتساب نے تفتیش وتجسس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ ''ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے'' اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں، جن میں بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔'' (47)

انہیں زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت وطبیعیات کا مشہور سائنسدان برونو (Bruno) (1548-1600) بھی تھا۔ اس کا دردناک قصہ ڈاکٹر ڈریپر کی زبانی سنیے:

''اٹلی کا ایک باشندہ گارڈنیو برونو نامی، ابتداً اس کا مقصد اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گزاری کے لیے وقف کرنا تھا چنانچہ ڈومینیکن فرقہ کے راہبوں میں شامل بھی ہوگیا۔ لیکن مسئلہ عشائے ربانی اور استقرار حمل بلا مرد پر غور کرنے سے تشکیک میں مبتلا ہوگیا۔ بہت جلد

اسے پیشوایان دین کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ فرار ہو کر اول سوئٹزرلینڈ پھر انگلینڈ، بعد ازاں جرمنی میں پناہ لینا پڑی لیکن محکمہ احتساب کے جاسوس کتے اس کی بو سونگھتے پھرے۔ جب وہ واپس اٹلی آیا تو وینس میں گرفتار کر لیا گیا ابتداً پومپی (Pompeii) کے جیل خانہ میں چھ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

برونو نے زمانہ قیام انگلستان میں عوام میں جو لیکچر دیئے تھے ان میں واضح کیا تھا کہ ''اناجیل مقدسہ ہیئت یا طبیعیات کے مسائل کے متعلق ذریعہ استناد نہیں ہو سکتیں خصوصاً ان کی یہ تعلیم تو بالکل ہی غلط ہے کہ زمین ایک سطح مستوی ہے جو ستونوں پر قائم ہے۔ اور آسمان ایک قبہ جامد ہے جو فردوس کا صحن ہے''۔ احتساب عدالت نے پہلے تو اسے مسیحی برادری سے خارج کیا پھر اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ ''اسے **نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے**''۔ اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دشمن اگرچہ اس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں لیکن اس کے خیالات کی اشاعت کو نہیں روک سکتے۔ اس نے ججوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''تمہارے اس فیصلہ کو سن کر میرے لب پر اس خوف کا عشر عشیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دلوں میں اس کے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہوگا'' اس فیصلہ کی تعمیل 16 فروری 1600ء کو ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا۔'' (48)

اسی طرح مشہور طبیعی عالم (Physicist) گلیلیو (Galileo Galilei 1564-1642) کو اس بناء پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے آفتاب کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔ گلیلیو کو احتساب عدالت میں پیش کرنے کا واقعہ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) کے توسط سے:

''زندگی کے آخری حصے میں اس گلیلیو کا مذہبی محاکمہ کیا گیا کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس وقت گلیلیو ستر برس کا تھا، طویل علالت کے باعث اس کی بصارت زائل ہو رہی تھی۔ مذہبی عدالت نے ایک ڈاکٹر ان احکام کے ساتھ بھیجا کہ جونہی وہ سفر کے قابل ہو، اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا جائے۔ جب وہ مذہبی عدالت میں حاضر ہو گیا تو عدالت نے اسے جو سزا سنائی وہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

'' ______ جبکہ تم گلیلیو ولد ونسنڈ یو مرحوم (49) سکنہ فلورنس، عمر 70 برس، 1615ء میں اس مقدس عدالت کے سامنے اپنے باطل نظریہ (سورج ساکن ہے) کی وجہ سے مجرم

ٹھہرائے گئے ہو۔ تم آئندہ اپنے نظریات ترک کردو گے اور نہ ہی تم ان کی تعلیم زبانی یا تحریری طور پر دو گے۔ چنانچہ ہم تمہارے اقرار و اعتراف اور تمہارے کیس کے بغور مطالعہ کے بعد درج ذیل سزا تجویز کرتے ہیں: یسوع مسیح اور کنواری مریم کے انتہائی مقدس ناموں سے آغاز کرتے ہوئے ہم اعلان کرتے ہیں، اے گلیلیو! تم نے خود کو کفر کا مجرم ثابت کر دیا ہے یعنی تم نے صحیفہ مقدس (Scripture) کے برخلاف کہا ہے کہ سورج مرکز کائنات اور ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے اور خود مرکز کائنات نہیں لہٰذا ہماری موجودگی میں اپنے گناہوں اور اپنے کفر پر اظہار ندامت کرو اور قسم کھاؤ کہ اب ان سے تائب ہو گئے ہو، کیونکہ یہ روم کے کیتھولک چرچ سے بغاوت کے مترادف ہے۔''

وہ حلفیہ بیان جسے گلیلیو کو عدالت میں پڑھنے پر مجبور کیا گیا حسب ذیل ہے:

''میں گلیلیو گیلیلی والد ونسنز یو مرحوم سکنہ فلورنس، عمر ستر برس، عدالت میں شخصی طور پر حاضر ہوں، اور عالمی مسیحی جمہوریت کے نامور ترین اور مقدس ترین آقاؤں اور منصفوں کے آگے حالت رکوع میں انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھاتا ہوں کہ میں ہمیشہ یقین رکھتا رہا ہوں اور آئندہ بھی یقین رکھوں گا کہ مقدس گرجے کے تمام ارکانِ ایمان، جن کی تعلیم و تبلیغ کی جاتی ہے، درست ہیں۔ میں سورج کو مرکز کائنات ماننے کے باطل نظریہ سے تائب ہوتا ہوں۔

روم میں منروا کے کانونٹ (Convent) کے اندر 22 جون 1633ء میں گلیلیو نے یہ معافی نامہ اپنے دستخطوں سے داخل کیا۔'' (50)

یہ بات درست نہیں کہ یہ معافی نامہ پڑھنے کے بعد گلیلیو زیر لب مسکرایا اور بڑبڑاتے ہوئے کہا'' تاہم میں اس سے منحرف ہوتا ہوں۔'' گلیلیو نے نہیں بلکہ دنیا نے یہ کہا۔ مذہبی عدالت کی رو سے گلیلیو کی سزا دوسرے لوگوں کے لیے سامان عبرت تھی تاکہ وہ اس طرح کا جرم نہ کر سکیں اس لحاظ سے سزا دینے والوں کو کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ مذہب بیزاری کے جذبات لوگوں میں پروان چڑھنے لگے۔ گلیلیو اور مذہبی عدالت کے درمیان جو تصادم ہوا اس سے مذہبی ہٹ دھرمی نے روشن خیالی کی تحریک کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ تشکک اور بداعتقادی کا تمام یورپ میں چپکے چپکے عمل دخل ہو گیا۔ لوگ ذات باری تعالیٰ، بقائے روحِ انسانی اور اختیار و ارادۂ انسانی کے منکر ہو گئے۔ مذہبی عدالت کا ایک مضحکہ خیز مقدمہ ڈریپر کے الفاظ میں:

''ایک گھوڑے پر، جس کے مالک نے اسے طرح طرح کے کرتب سکھا رکھے تھے، 1601ء میں بمقام لزبن (Lisban) مقدمہ چلایا گیا اور اس جرم کی علت میں کہ اس پر بھوت سوار ہے۔ بیچارے بے زبان جانور کو زندہ جلا دیا گیا۔ ایک عرصہ تک سینکڑوں عورتیں اس الزام میں زندہ جلائی جاتی رہیں کہ وہ چڑیلیں ہیں۔'' (51)

کلیسائی جنونیوں نے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر علماء کا جو حشر کیا، اس کی ایک دردناک مثال ہپاشیا (Hapasia) کی ہے۔ سینٹ تھیافلس کے بعد سکندریہ کی دینی پیشوائی کی خدمت اس کے بھتیجے سینٹ سائی رل کو ملی جو اپنے پُر تاثیر مواعظ کی وجہ سے سکندریہ کے مذہبی حلقوں میں مقبول ہو گیا تھا، حضرت مریم کی پرستش اسی کی کوششوں سے سکندریہ میں عام ہوئی۔ لیکن جو اثر اس کی عام پسند تقریروں نے اہل اسکندریہ کی بے چین طبیعتوں میں پیدا کیا تھا اسے ہپاشیا کی تعلیمات نے بہت کمزور کر دیا۔ یہ ہپاشیا، جس کا باپ تھیون (Theon) اعلیٰ درجے کا انجینئر تھا، نہ صرف افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی شارح تھی بلکہ اپالونیس اور دیگر انجینئرز کی تصانیف پر بھی اس نے عالمانہ شرحیں لکھی تھیں۔ ہر روز اس کے مدرسہ کے سامنے امراء و اعیان کی رتھوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور سکندریہ کے تمام وضیع و شریف اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ وہ عموماً ان موضوعات پر اظہار خیال کرتی تھی ''میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور میرے علم کی حد کیا ہے؟''

سائی رل نے سمجھ لیا کہ اگر یہی انداز رہا تو میری مشائخت کا چراغ گل ہو جائے گا اور یہ سمجھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی بن پڑے اپنے حریف کا خاتمہ کر دے گا۔ آگے کی دردناک کہانی جارج سارٹن کے الفاظ میں:

''ایک دن ہپاشیا مدرسہ کو جا رہی تھی کہ سائی رل کی امت کے ایک گروہ نے یعنی بہت سے پادریوں نے اسے آن گھیرا۔ ان سب نے مل کر بیچ بازار میں اس کے کپڑے نوچ کھسوٹ ڈالے، اسے برہنہ کر دیا اور پھر گھسیٹتے ہوئے ایک گرجا میں لے گئے جہاں عصائے پطرس کی متواتر ضربوں سے اس کا سر توڑا گیا۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے، اور ہڈیوں کو آگ میں جھونک دیا گیا۔ سائی رل جب فوت ہوا تو پوپ لیو سیزدہم نے اسے ولی اللہ قرار دیا اور اس کے امام کلیسا ہونے کا اعلان کیا۔'' (52)

پادریوں کی ایسی ہی کرتوتوں کی وجہ سے ڈاکٹر ڈریپر اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''معرکۂ مذہب وسائنس'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

> ''جب یورپ کی قدیم بت پرستی اپنے ہی نواقص کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تو نہ صرف قیصران روم ہی لوگوں کے روحانی پیشوا بن سکے اور نہ اس زمانہ کے فلاسفہ نے ہی عقائد کا کوئی ضابطہ مرتب کیا۔ بلکہ انہوں نے مذہب کو بحالِ خود چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جاہل اور آلودہ پادریوں، ملکہ گداز نخوں اور غلاموں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔'' (53)

آخرکار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے مذہب و قدامت کے نمائندوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد و جمود اور محکمہ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان کو ان تمام عقائد، علم، اخلاق و آداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی تھی یا اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا تھا۔ ان کے دل میں ابتداً مسیحی مذہب (درحقیقت سینٹ پال کا مذہب) کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ روشن خیالی اور عقلیت کے علم برداروں نے بطور خود یہ طے کر لیا کہ علم اور مذہب ایک دوسرے کی ضد اور مدمقابل ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لیے علم و عقلیت سے وفاداری کے لیے ضروری ہے کہ مذہب سے منہ موڑ لیا جائے۔ ان کے سامنے جب مذہب کا نام آتا تو اچانک ارباب کلیسا اور نمائندگان مذہب کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور مظلوم علما و محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں۔ چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انہوں نے ایک اصول زندگی کے طول پر طے کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی نفرت و کراہت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

اب ہم اس باب کی دوسری فصل میں جائزہ لیں گے کہ روشن خیالی اور عقلیت پرستی کے زیر اثر نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک کس طرح جدیدیت کی پیش رو ثابت ہوئی۔

فصل دوم

نشاۃ ثانیہ (Renaissance)(یورپ میں عقلی بیدار)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے لیے دسویں صدی کا آغاز ایک نیک شگون ہے کیونکہ اس صدی سے ایک نیا یورپ جنم لیتا ہے، پرانا یورپ مر جاتا ہے یا یوں کہیے تاریکی ختم ہو جاتی ہے اور روشنی کا آغاز ہوتا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکل جاتا ہے کہ دنیا ختم ہوئی کہ ہوئی۔ اگر چہ اس خوش فہمی کا کوئی تاریخی جواز نہیں ملتا (فی الحال اسلامی نکتہ نظر ہمارا مقصود نہیں)۔ لیکن دسویں صدی یورپ کی تاریخ میں یقیناً ایک نقطہ انقلاب ہے اس سے پہلے (مذہب کا خوف) یاس و ناامیدی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد یورپ میں ہمت و طاقت آجاتی ہے۔

دور مظلمہ (Dark Ages) کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ علوم کی Rebirth اور Revival ہوتی ہے۔ پہلے فرانس کی تعلیمی درس گاہوں میں تبدیلی آتی ہے جس سے احیاء العلوم کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تحریک اپنے اثرات کی وجہ سے ویسی ہی اہم ہے جیسے فرانسیسی انقلاب یا تحریک اصلاح مذہب (Reformation)۔ یکا یک یورپ کے مدرسے طلباء سے بھر جاتے ہیں۔ تقلید کی بجائے تحقیق و جستجو کا جذبہ ابھرتا ہے۔ صلیبی جنگوں (Crusades) کی وجہ سے یورپ کے مختلف حصے ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اور خود یورپ مشرق کے قریب آجاتا ہے اور اس کے علوم وفنون سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ ایک نیا مذہب اور ایک نیا فلسفہ ابھرتا ہے۔ ارسطو کے عربی تراجم سے لوگ آشنا ہوتے ہیں۔ ارسطو کی کتب کی تفاسیر لوگوں کو دستیاب ہو جاتی ہیں اور بالآخر اصلی ارسطو بھی یونانی زبان میں یورپ کو مل جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق Renaissance کی وضاحت اس طرح ہے:

> "Literally, 'rebirth' the period in European civilization immediately, following the middle Ages, conventionally held to have been characterized by a surge of Interest in classical learning and value. The Renaissance also witnessed the discovery and exploration of new continents, the substitution of the copernican for the

ptolemaic system of astronomy, the decline of the feudal system and the growth of commerce and the invention or application of such potentially powerful innovations as paper, printing, the mariner's compass and gunpowder. To the scholars and thinkers of the day, however, it was primarily a time of the revival of classical learning and wisdom after a long period of cultural decline and stagnation.

The term Middle Ages was coined by scholars in the 15th century to designate the **interval between the downfall of the classical world of Greece and Rome and its Rediscovery at the beginning of their own century,** a revival in which they felt they participating. Indeed, the notion of a long period of cultural darkness had been expressed by Petrarch even earlier. Events at the end of the Middle Ages, particularly beginning in the 12th century, set in notion a series of social, political and intellectual transformations that culminated in the Renaissance. These included the increasing failure of the Roman Catholic Church and the Holy Roman Empire to provide a stable and unifying framework for the organization of spiritual and material life.

The spirit of the Renaissance ultimately took many forms, it was expressed earliest by the intellectual movement called Humanism. (Detail is coming ahead)----The intellectual stimulation provided by Humanists helped spark the Reformation (Detail is coming ahead), from which, however, many Humanists including Erasmus, recoiled. By the end of the 16th century the battle of Refomation and Counter-Reformation had commanded much of Europe's energy and attention, while the intellectual life was

poised on the brink of the Enlightenment (Detail is coming ahead). It was in art that the spirit of the Renaissance achieved its sharpest formulation. **Art came to be seen as a branch of knowledge, valuable in its own right and capable of providing man with images of God.....**

The Renaissance as a unified historical period ended with the fall of Rome in 1527. The strains between Christian faith and classical Humanism led to Mannerism in the latter part of the 16th century."(54)

درج بالا عبارت کا مفہوم ہم فصل کے آغاز میں بیان کر آئے ہیں۔ مزید وضاحت Renaissance کی تاریخ میں بیان کردی جائے گی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کی تین باتیں قابل توجہ ہیں۔ نمایاں (Bold) کیے گئے جملوں سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

1. مذہبی بیزاری کے ردعمل کے طور پر کلاسیکی علوم اور اقدار کو اپنانے کا سیلاب اٹھا جو مذہبی اقدار و اخلاقیات کو بہا لے گیا۔
2. پندرویں صدی کے علما نے ایک ہزار سال بعد یونان و روم کی تہذیب وفکر کو اپنانا شروع کردیا۔
3. یونان وروم کی بت پرستانہ تہذیب کو اپنانے کے نتیجہ میں Art بطور شعبہ علم establish ہوگیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ Art کے نام پر Images of God بنائے جانے لگے۔

چنانچہ نشاۃ ثانیہ کا اصلی مطلب ہے وحی پر مبنی اور نقلی علوم کو بے اعتبار سمجھنا، اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا۔ اسی لیے اس تحریک کا دوسرا نام انسان پرستی (Humanism) ہے۔

The Hutchinson Dictionary of Ideas میں Renaissance کی درج ذیل خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

"The aim of Renaissance education was to produce the complete human being (Renaissance man) conversant in the humanities, mathematics and science; to encourage

the growth of scepticism and free thought, and the study and imitation of Greek and Latin literature and art. The revival of interest in classical Greek and Roman culture inspired artists such as Leonardo Davinci, Michel Angelo and Dijrer.

Figures of the Renaissance include the politician Michiavelli, the poets Ariosto, Shakespeare and Tasso. etc." (55)

اس میں یونانی، رومی اور لاطینی ادب وثقافت کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ مزید اس بات کا انکشاف ہے کہ انسان میں تشکیک کا مادہ بھی اسی دور میں پروان چڑھا اور اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ کیونکہ نشاۃ ثانیہ کی نمایاں شخصیات کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان میں اہم اور قابل ذکر ہستی جس نے دنیا کی سیاست پر گہرے اور انمٹ اثرات مرتب کیے اور آج بھی اس کا نام زندہ ہے وہ حضرت میکیاویلی ہیں۔ اب ہم تحریک احیاء العلوم (نشاۃ ثانیہ) کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔

صلیبی جنگیں (The Crusades)

رسول کریمؐ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے زمانے (622ء) سے وی آنا (Vienna) کے مسلمانوں کے محاصرہ (1683ء) تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال تک تمام یورپ مسلمانوں کے سامنے تھر تھر کانپتا تھا اور ان کے علم وفن کا لوہا مانتا تھا۔ سن ہجرت کے پندرہ سال بعد بیت المقدس (56) کو حضرت عمرؓ نے فتح کیا اور پہلی صلیبی جنگ تک یہ مقام مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد تقریباً نوے سال کے مختصر عرصہ کے لیے مسلمانوں سے چھن گیا۔ پھر ملت اسلامیہ کے بطل جلیل صلاح الدین یوسف بن ایوب المعروف صلاح الدین ایوبی نے معرکۂ حطین میں ہمیشہ کے لیے صلیبیوں سے چھین لیا۔ آج کل پنجۂ یہود میں ہے لیکن اقوام متحدہ (UNO) نے اس قبضہ کو ناجائز قرار دیا ہوا ہے، اور جہاد فلسطین جاری ہے۔ مسلمانوں نے کبھی عیسائیوں یا یہودیوں کو بیت المقدس (یروشلم) کے مقامات مقدسہ کی زیارت سے نہیں روکا اور 720ء سے 1000ء تک بے شمار عیسائی بیت المقدس آتے اور نذرانۂ عقیدت ادا کرتے رہے۔ لیکن 1010ء کے بعد ان زیارتوں میں کچھ

رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ 1071ء میں ترکوں نے بیت المقدس سے عرب گورنر برطرف کر کے وہاں کوئی ترک مامور کر دیا، اس سے تجارت اور القدس کی زیارت میں عیسائیوں کو دقت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ان وجوہات یا ملک گیری کی ہوس کی بناء پر صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ جس کا مقصد یروشلم کو کافروں (Infidels) (صلیبیوں کے مطابق) یعنی مسلمانوں سے آزاد کروانا تھا۔

چنانچہ 1079ء میں قسطنطنیہ کے مقام پر تمام عیسائی حکومتوں نے مل کر ایک فوج تیار کی جس میں پندرہ لاکھ فوجی توپ و تفنگ سے لیس یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کروانے کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے۔ ان فوجیوں کے مذہبی جوش کو کئی جھوٹی سچی کہانیوں سے ابھارا گیا تھا، یہ جنگیں اصل میں اس مہم کا آغاز تھا جو عیسائی یورپ نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے چنگل سے آزاد کروانے اور بالآخر مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے کی۔ دور وسطی (Middle Ages) جس کا ذکر پچھلی فصل میں ہوا) میں، عیسائیوں کے ذہن پر مذہب کا بھوت سوار تھا۔ اس لیے یہ لوگ مسلمانوں کی شان و شوکت اور ان کی وسیع و عریض سلطنت سے جلتے تھے اور چونکہ ان کے مقدس مقامات (جیسے یروشلم، دریائے اردن، صحرائے سینا وغیرہ) مسلمانوں کے قبضہ میں تھے لہٰذا اور بھی آتش زیر پا تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ اس قابل ہوں کہ مسلمانوں سے ٹکر لیں یروشلم کو آزاد کرائیں۔ یورپ سے مسلمانوں کو نکالیں اور ان کے اقتدار کو ختم کریں۔ کوئی آٹھ صلیبی جنگیں لڑی گئیں جن کا یورپ پر اثر ہوا۔ ایک تو اسے فکری آزادی حاصل ہوئی (جیسا کہ ہم انسائیکلوپیڈیا کے آرٹیکل میں پڑھ چکے ہیں) پہلے تو یورپ کے لوگ مذہب اور مدرسیت (Scholasticism) کے تلے دبے ہوئے تھے اب دوسرے ممالک میں جا کر اور مسلم تہذیب سے آشنا ہو کر ان کی تنگ نظری قدرے زوال پذیر ہوئی۔ انہوں نے باہر کی دنیا میں علوم و فنون کی سربلندی دیکھی اور مشرق کی دولت اور رزق کی فراوانی سے واقفیت حاصل کی۔ ان تمام چیزوں نے ان کے ذہن پر خاصا اثر چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب فوجی گھروں کو واپس لوٹتے تھے تو ان اثرات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب ہم دور تاریکی پر نگاہ دوڑاتے ہیں جو روم کی شکست سے شروع ہوتا ہے اور بیت المقدس کے مسلم قبضہ تک جاری رہتا ہے یعنی کم و بیش چھ سو سال تک، تو یہ صلیبی جنگیں یورپ کے لیے اتنی ہی اہم ہیں جتنی کولمبس 1498ء (Columbus) اور اس کے ساتھیوں کی سمندری مہم جوئیاں تھیں۔ جنہوں نے امریکہ دریافت کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور اب مشرق دریافت ہوا۔ صلیبی جنگوں

کا زمانہ 1090ء 1290ء تک ہے یعنی کوئی دو سو سال کا۔ اور یہ بالکل احیاء العلوم (Renaissance) کی تحریک سے چند سال پہلے کا قصہ ہے۔ احیاء العلوم کی تحریک 1290ء کے قریب سے شروع ہو جاتی ہے۔

مدرسیت (Scholasticism)

The Penguin Dictionary of Literary Terms and literary Theory میں Scholasticism کا تعارف اس طرح کروایا گیا:

"The teachers of the liberal arts in the medieval schools were known as doctores scholastici, theologians and philosophers were also so called. Scholasticism now refers, loosely, to the methods and matters of theological and Philosophical thought in the Middle Ages. St. Thomas, Duns Scotus, Peter Lombard and Albertus Magnus were all scholastics the principal luminaries in exceptional constellation of metaphysicians. The influence of scholasticism since the Middle Ages has been enormous, and its spirit has been kept alive in more recent times by T.E Hulme, Jacqúes Maritain, Etienne Gilson and Gabriel Marcel."(57)

The Hutchinson Ditionary of Ideas میں مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"**Scholasticism**: the theological and philosophical systems and methods taught in the schools of medieval Europe, especially in the 12th-14th centuries. Scholasticism tried to integrate orthodox Christian teachings with Aristotelian and some Platonic philosophy. The scholastic method involved surveying different opinions and the reasons given for them, and then attempting solutions of the problems raised using

logic and dialectic.

The 9th century neo-platon-ist Johannes Scotus Erigena is sometimes regarded as an early scholastic. But scholasticism began at the end of the 11th century, when Roscellinus, a supporter of nominalism, and Anselm, a supporter of realism, disputed the nature of universals. In the 12th century, the foundations of universities in Bologna, Paris, oxford and Philosophical Texts, stimulated scholasticism. Notable scholastic philosophers, or 'schoolmen' as they were called, william of champeaux, Abelard, the English monk Alexander of Hales (died 1222) Albert Mangnus, and Peter Lombard. The most important are in the 13th century, Thomas Aquinas, whose works have become classic texts of catholic doctrine and Duns Scotus and in the 14th century, William of Occam, who was the last major scholastic philosopher.

In the 20th century there has been a revival of interest in scholasticism, particularly in the writings of Catholic scholars like Jacques Maritian (1882-1973)" (58)

اوپر دونوں Reference Books کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

گیارھویں صدی کے قریب یورپ کو بیرونی حملہ آوروں کے ڈر سے نجات ملی۔ اس صدی کے بعد صلیبی جنگوں کی وجہ سے یورپ کی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح لوگوں کو سکون قلب اور فارغ وقت مل گیا جس میں انہوں نے اپنے مذہب کی بنیادوں کو کھودنا شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں چرچ اور حکومت کو پڑھے لکھے آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ قابل اور تجربہ کار وکلا اور حکمران درکار تھے۔ لہٰذا لوگوں نے تعلیمی درسگاہوں کی طرف دوڑ لگائی اور فوراً ہی تمام سکول اور کالج طلبا سے بھر گئے۔ یہ تعلیمی درسگاہیں چرچوں کے ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ پیرس میں ایک بڑا استاد بنام ابے لارڈ (Abe Lard 1079-1142ء

) تھا وہ تین سکول چلا رہا تھا بعد میں انہی سکولوں سے پیرس کی یونیورسٹی بنی۔ ان سکولوں میں تمام مسیحی دنیا کے طالب علم حصول علم کے لیے آتے تھے۔ ان مدرسوں میں سات علوم یعنی گرائمر، جدلیات، بلاغت، جیومیٹری، حساب، موسیقی اور فلکیات پڑھائے جاتے تھے۔ قانون اور چرچ میں کامیاب رہنے کے لیے منطق سرفہرست تھی۔ یہ منطق وہی پرانی ارسطوئی منطق تھی۔ ایک مسئلہ جو دور وسطیٰ میں بار بار اٹھا اور مدرسین کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا وہ تھا کلیات (Universals) اور جزئیات (Particulars) کا۔ سوال یہ تھا کہ کیا عمومی تصورات حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں یا محض خدا کے افکار ہیں یا پھر مدرسات کی جماعت بندی کی انسانی کوشش ہے۔

مدرسین کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مسیحی عقائد کو منطقی بنیادوں پر استوار کریں ان کی کوششوں سے ایک طریق کار، ایک زاویہ نگاہ اور ایک فلسفہ ابھرا جسے مدرسیت (Scholasticism) کہا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ پرانی روایت کا سہارا لے کر دلیلیں دیتا تھا۔ مشاہدہ یا تجربہ نہیں کرتا تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد کئی سالوں تک یہ فلسفہ زندہ رہا اور Hutchinson کے مطابق ابھی بھی پوری طرح مرا نہیں ہے۔

جیسا کہ The Penguin اور The Hutchinson میں کہا گیا ہے کہ پارلیمنٹ اور کلیساؤں کی طرح یونیورسٹیاں بھی دور وسطیٰ کی پیداوار ہیں۔ گیارویں اور بارویں صدی میں کلیسائی اور راہبانہ مدرسوں سے یونیورسٹیوں کا آغاز پیرس، بولوگنا (Bologna) آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہوا۔ بعض جگہوں پر یونیورسٹیوں کے ساتھ سکول بھی قائم رہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک علوم وفنون اور سائنس کے فروغ میں یونیورسٹیوں نے بڑا کردار ادا کیا۔ اس دور (نشاۃ ثانیہ) میں مذہب (سینٹ پال کی مسیحیت) کی بالادستی ختم نہیں ہوئی، مثلاً بارویں صدی میں ارسطو کی نئی منطق کا پتہ لگ گیا اور اسے داخل نصاب کر دیا گیا۔ لیکن جب ارسطو کی طبعیات اور مابعد الطبعیات لاطینی زبان میں مل گئیں اور ان پر ابن رشد (انگریزی میں 1198-1126 Averroes c.) (59) کا حاشیہ بھی تو کئی مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اس لیے 1231ء میں یورپ نے حکمأ ارسطو کی تمام کتب سوائے پرانی منطق کے مدرسوں کے نصاب سے نکال دیں۔ لیکن 1245ء میں ارسطو کی تمام ممنوعہ کتب ایم۔ اے کے نصاب میں داخل ہوگئیں۔ ایسا پیرس کی یونیورسٹی میں ہوا۔

جنوبی اٹلی جہاں یونانی ثقافت کے اثرات ابھی باقی تھے وہاں نویں صدی میں سلارنو (Salerno) کے مقام پر ایک میڈیکل سکول تھا، جس کے بارے میں دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ (اگر چہ یہ دعویٰ محل نظر ہے اور جامعۃ الازہر مصر اس سے قبل قائم ہو چکی تھی) اس کے علاوہ شمالی اٹلی میں بمقام بولوگنا ایک لا کالج گیارویں صدی میں قائم تھا۔ جہاں سے بولوگنا کی یونیورسٹی بنی۔ پیرس کی یونیورسٹی نے خود طلبہ کے لیے قواعد وضوابط 1200ء میں بنائے اور بادشاہ نے اسے خصوصی مراعات عطا کیں۔ اس کے کچھ سال بعد یورپ نے ان یونیورسٹیوں کو کارپوریشن کے طور پر مان لیا۔ 1231ء میں یونیورسٹی چارٹر بنا، یہ ابتدائی یونیورسٹیاں ایک قسم کی گلڈ (Guild) تھیں یا تو ماسٹروں کے لیے یا طلبا کے لیے۔ لہٰذا ایسی تعلیمی درس گاہیں جن کا نصاب ہو، جو امتحانات منعقد کرتی ہوں اور ڈگریاں دیتی ہوں انہیں یونیورسٹی کہا جائے گا بشرطیکہ پوپ یا بادشاہ اس حیثیت کو تسلیم کرلے۔ اس کے بعد انہیں خصوصی مراعات اور اختیارات بھی حاصل ہو جاتے تھے۔ پندرھویں صدی تک یونیورسٹیوں کی اپنی عمارتیں نہیں ہوتی تھیں۔ پروفیسر ہی اپنی رہائش گاہوں سے کمرے دے دیا کرتے تھے۔ تجربہ گاہیں (Laboratories) کہیں نہیں تھیں۔

پروفیسر چوہدری عبدالقادر، جان ہے (John Hay) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''دنیا کبھی بھی طلباء کا وہ شاندار اجتماع، جو ان یونیورسٹی شہروں میں ہوا دوبارہ نہ دیکھ سکے گی، کیونکہ اس وقت احیاء العلوم کی تحریک کے فوراً بعد ان کے دلوں میں حصول علم کے لیے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ حتیٰ کہ آکسفورڈ، ہائیڈل برگ اور ہارورڈ یونیورسٹیوں کی داستان بھی بالکل پھیکی پڑ جاتی ہے جب اس کا مقابلہ اس سماجی زندگی سے کیا جائے جو نئے یورپ کے پیدا ہونے پر پاڈوا (Padua)، پیرس اور الکلا (Alcala) میں نمودار ہوئی۔'' (60)

یہ یونیورسٹیاں احیاء العلوم کی پیداوار ہیں۔ یہاں پر اب مندرجہ بالا سات علوم کے علاوہ تین اور مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ یہ تین فلسفے تھے، نیچرل (سائنسی) اخلاقی اور نفسی۔ بعض لوگ تین اور مضامین بھی پڑھتے تھے یعنی قانون، الٰہیات (Theology) اور طب۔ درس وتدریس کا طریقہ کتاب کا پڑھنا اور اسے بیان کرنا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ علم کی اتھارٹی معلوم کی جائے نہ کہ نیچر کی سٹڈی کی جائے۔

اندلس سے علم کی منتقلی

آہستہ آہستہ جو علم یونان اور روم سے یورپ پہنچا اس میں بہت سا اضافی حصہ اس علم کا تھا جو شمالی افریقہ اور اندلس سے مسلمانوں کے ذریعہ یہاں منتقل ہوا۔ 1400ء میں یوکلڈ (Euclid 330-260B.C)(61) کی پہلی پانچ کتب (Stoicheia / Elements) تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوگئیں۔ اس دور میں سائنس کی زبان عربی تھی، گو بطلیموس (Ptolemy, Claudius Ptolemaeus C-100-170) (62) کی المجسطی (Almagest) کا بارویں صدی کے نصف میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس ترجمہ میں ہند سے عربی تھے (یعنی ۱، ۲، ۳، ۴.....)۔ جب اندلس سے مسلمانوں کو بے دخل کیا گیا تو بادشاہ الفانسو دہم نے مسیحی اور یہودی علما کو طلیطلہ (Toledo) میں اکٹھا کیا، ان علما نے الفانسو جداول (Table) تیار کیے جو تین صدیوں تک رائج رہے۔

اگر چہ یورپ احیاء العلوم کے لیے عرب مسلمانوں کا احسان مند ہے لیکن ان علوم وفنون کے علاوہ جو مسلمانوں نے یورپ کو دیئے کئی اور عناصر بھی کام کر رہے تھے جن کی اپنی اہمیت ہے اور وہ بھی احیاء العلوم کی تحریک کو تقویت بخشتے رہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسیحی تعصب اور ہٹ دھرمی کے باوجود غرناطہ، قرطبہ اور سیوال (Savile) کے علوم وفنون پیرس، آکسفورڈ اور کیمبرج آ پہنچے۔

تحریک احیاء العلوم کا آغاز

تیرہویں صدی عیسوی میں یورپ ایک لمبے خواب سے جاگا اس وقت یکلخت علم کی تڑپ پیدا ہوئی اور دور دراز علاقوں میں لوگ علم کے بھوکے نظر آنے لگے۔ یہ طلب پہلے کبھی نہ تھی لیونارڈو (Leonardo da Vinci 1452-1519) شمالی افریقہ سے عربی ہندسے لایا۔(63)

البرٹس میگنس (Albertus Magnus 1206-1280) (64) ایک جید فلسفی نے ارسطو کی شرح اس وقت کی مروجہ سائنس یعنی فلکیات، جغرافیہ، نباتات، حیوانات اور طب کے حوالہ سے کی۔ سینٹ تھامس اکونیاس (St. Thomas Aquinas C-1226-1274) (65) جو البرٹس میگنس کا شاگرد تھا، نے مدرسیتی فلسفہ کو منطقی بنیادوں پر منظم کیا۔ وہ بطلیموس کے نظام

کائنات کو تسلیم کرتا تھا۔ گو کہ اس کا فلسفہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف تھا لیکن اس میں منطق اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ وہ رومن کیتھولک چرچ کے لیے سرکاری حیثیت اختیار کر گیا۔ سینٹ اکویناس کا اصل منشا یہ تھا کہ وہ ارسطوی اور اسلامی علم کی مطابقت مسیحی الٰہیات سے ظاہر کرے اور وہ اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوا وہ اس کے فلسفہ کی مقبولیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس وقت بڑے بڑے گرجا بنے، کئی یونیورسٹیاں بنیں۔ راجر بیکن (Roger Bacon C.1214-1292) (66) پیدا ہوا۔ راجر بیکن کا وجود سائنس کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اسی دور میں لوگوں میں ریاضیات کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ لیونارڈو، جارڈینس نیموریس (Jordanus Nemoraus) اور راجر بیکن ہیں۔ لیونارڈو کی تعلیم باربری (Bar bary) میں ہوئی جہاں اس کا باپ بطور کمرشل ایجنٹ کام کرتا تھا۔ وہاں سے لیونارڈو کو الخوارزمی (67) (780-850) کے الجبرا اور عربی ہندسوں سے واقفیت ہوئی۔ اٹلی واپس آ کر اس نے ایک کتاب (Liber Arabic) لکھی جس میں تفصیل سے اس نے یہ دونوں چیزیں بیان کیں اور یورپ کو ان سے آشنا کیا۔ مدعا یہ تھا کہ لاطینی نسل علم میں پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ کتاب دو سو سال تک ریاضیات کے میدان میں شاہکار سمجھی جاتی تھی۔ الجبرا میں اس نے جیومیٹری کے طریقے استعمال کیے۔ اس نے صحیح اعداد (whole numbers) اور کسور (Fractions) کا عمل بتلایا۔ عربوں سے لیونارڈو کو مصری اور یونانی علم سے واقفیت ہوئی۔ اس کا پتہ ہمیں کسور، مربع اور مکعب کے جذر سلسلہ (Progression) اور غلط مفروضہ کے اصول (Methods of False Assumption) سے ملتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں نے سکندریہ (Alexandria) فتح کیا تو یونانی تہذیب کے کچھ آثار باقی تھے۔

تجربی سائنس کی تاریخ میں بیکن کا نام سرفہرست ہے اس کا استاد رابرٹ گروسے ٹیسٹ (Robert Grosseteste c.1169-1253) تھا، جو ریاضیات اور تجربی سائنس کا دلدادہ تھا۔ اس نے عربی حکما (Philosophers / Scientists) کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ بیکن خود بھی پیرس کی یونیورسٹی میں پڑھتا رہا جو اس زمانہ میں یورپی علم و فن کا گہوارہ تھی۔ یہاں اس نے الٰہیات (Theology) کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ آکسفورڈ پڑھانے لگا۔ یہاں ایک لیبارٹری تھی جس میں کیمیا پر تجربے کیے جاتے تھے۔ یہیں سے وہ ''جادو''

اور" کالے علم" کے لیے بدنام ہو گیا، اسے آکسفورڈ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور پیرس بھیج دیا گیا جہاں اسے بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ 1266ء میں اس نے تین کتابیں، جن کے نام ہیں Opus Minus، Opus Majus اور Opus Tertium لکھیں۔ پوپ نے اس کی کتابیں ممنوعہ قرار دے دیں اور اسے جیل بھیج دیا گیا، جہاں وہ موت سے ایک سال پہلے رہا ہوا (مسیحی مذہبی جہالت وتشدد کا شعلہ بجھتے بجھتے پھر بھڑکتا ہے)۔

اس زمانہ کی اہم کتابیں پانچ سو سال تک چھپ نہ سکیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ عوام الناس کی فہم وفراست سے بالا تھیں، پڑھے لکھے لوگ بھی انہیں ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ان کے مصنفین کو جادوگر کہہ کر جیل میں بند کروا دیتے تھے۔ بیکن بڑی فہم کا مالک تھا۔ اس نے پیش گوئی کی کہ جہاز میکانکی طاقت سے چلیں گے اور گاڑیاں بغیر گھوڑوں کے چلیں گی، جو اس کے بعد پوری ہوئیں۔

ڈانٹے ایلیگیری (Dante Alighieri c.1265-1321) (68) کے بغیر دور وسطیٰ کا ذکر نامکمل رہے گا۔ یہ دور وسطیٰ کی نابغہ روزگار شخصیت ہے۔ اس کے شعروں نے نصرانی تعصب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور احیاء العلوم کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے سائنس پر کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے 'پانی اور زمین کے بارے میں' (On water and the Earth) یہ کتاب دراصل ایک سوال کا جواب تھی۔ سوال یہ تھا کہ آیا زمین کا کوئی حصہ پانی سے اوپر ہے۔

اپنی شہرہ آفاق اور بدنام زمانہ، رسوائے عالم (اسلامی دنیا میں) نظم Divine Comedy میں کھل کر اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنی خباثت اور بغض کا اظہار کرتا ہے۔ اس بد بخت نے محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھی عمرؓ کے ساتھ جہنم میں زنجیروں سے بندھا ہوا دکھایا ہے۔ بعد میں مسیحی دنیا نے اس نظم کی بنیاد پر سٹیج ڈرامے بنا کر اسلام کا خوب مذاق اڑایا۔ غیر مسلم دنیا نے اس نظم کو شاہکار ادب (Master Piece of Literature) کس بنیاد پر قرار دیا ہے؟ ہم مسلمانوں کو ڈانٹے سے بجا طور پر شکایت ہے کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے۔ بات ہو رہی تھی Divine Comedy کی۔ اس نظم میں وہ ارض مرکزی (Geo-centric) فلکیات اور علم النجوم کو تسلیم کرتا ہے۔

تحریک احیاء العلوم پر نظر بازگشت

چودویں صدی عیسوی میں یورپ ایک نہایت ہی دلچسپ اور اہم تحریک سے دو چار ہوا۔ یہ تحریک احیاء العلوم کی تھی۔ جس سے ایک نیا شعور ابھرا اور یورپ نئی ڈگر پر پڑا۔ اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس سلسلہ میں صلیبی جنگوں نے سب سے اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان سے یورپ کا جمود ٹوٹا اور اس کا رابطہ بیرونی دنیا سے قائم ہوا۔ دوسرے نمبر پر عربی اور یونانی علوم کی بازیافت اور اس سے عقلی میدان میں بے پناہ وسعت کا ہونا اور تیسرے نمبر پر راجر بیکن کی تجربی سائنس اور ڈانٹے کا شعری سرمایہ۔ لہٰذا درج بالا مطالعہ سے اس دور (نشاۃ ثانیہ) کی درج ذیل فکری اور عملی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

1. یونانی اور رومی علوم کو دینی علوم پر ترجیح دینا۔
2. چونکہ عوام پر مذہبی رنگ ابھی غالب تھا اس لیے عموماً خدا کے وجود کا انکار نہیں کیا گیا لیکن خدا پر ایمان محض رسمی چیز بن گیا۔
3. آخرت سے بھی انکار نہیں کیا گیا مگر زندگی کا مطمع نظر محض دنیا بن گئی۔ اس رجحان کی بہترین مثال راجر بیکن ہے جسے ''سب سے پہلا جدید مفکر'' کہا جاتا ہے۔
4. یہ خیال بھی اسی زمانے میں مقبول ہوا کہ خدا کی دو کتابیں ہیں، ایک Word of God یعنی انجیل مقدس اور دوسری Work of God یعنی فطرت۔ اور کہنے لگے انجیل کو فطرت کے مطالعے کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ یہ نقطہ نظر گلیلیو کا بھی تھا۔
5. فطرت کے حسن کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی۔ انسان کا فریضہ قرار پایا کہ فطرت کے حسن اور دنیا کی رنگینیوں سے پوری طرح لطف اٹھالو یعنی نفس پرستی کو اصول زندگی بنایا گیا۔
6. مطالعہ فطرت کا طریقہ بھی راجر بیکن نے مقرر کر دیا جس چیز کو ''سائنسی طریق کار'' کہا جاتا ہے وہ اس سے شروع ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں کی حقیقت صرف مشاہدے اور تجربے سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس سے براہ راست منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو چیز مشاہدہ نہ کی جا سکے اور حسی تجربے میں نہ آسکے وہ حقیقی نہیں۔ یہ سوچ بعد میں کیا رنگ لائی

محتاج بیان نہیں۔

7 نشاۃ ثانیہ غیر دینی (Secular) بنیادوں پر ہوئی اور آہستہ آہستہ دین اور عقیدے سے بالکل دور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مسیحیت سے پہلے کی یونانی اور رومی میراث کی طرف پلٹ گئی یعنی جاہلیت جدیدہ تاریک دور سے پہلے کی دو بڑی جاہلیتوں کی طرف پلٹ گئی اور سمجھا یہ کہ ہم تاریکی سے روشنی کی طرف آگئے۔

نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی ساتھ یورپ میں ایک اور تحریک کا تعارف ہو رہا تھا جس نے مذہبی تعلیمات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔

انسانیت پرستی (Humanism)

نشاۃ ثانیہ کے آغاز ہی میں لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں یونیورسٹیاں قائم ہونے لگی تھیں۔ ایک طرف تو بڑے بڑے کالج اور یونیورسٹیاں اٹھ کھڑی ہوئیں اور دوسری طرف اس علم سے وابستگی ہوگئی جو پیٹراک (Petrarch c.1304-1374) کے نام سے منسوب ہے۔ شروع میں یہ احیاء تو ادبی اور فلسفیانہ تھا لیکن بعد میں چونکہ لاطینی زبان میں ارسطو اور دیگر سائنسدانوں کے تراجم ہونے لگے، یہ احیاء سائنس اور دیگر علوم وفنون میں بھی ہوا۔ جیسے ستر ہویں صدی میں ڈانٹے کا نام بڑا اہم ہے اسی طرح چودھویں صدی میں پیٹراک کا نام ہے۔ یہ اٹلی کا شاعر اور عالم تھا اس نے یونانی اور رومی تصانیف پڑھنے پڑھانے پر زور دیا۔ اس کی بدولت اٹلی میں علوم کا احیاء ہوا۔ اگر چہ پیٹراک دور وسطیٰ کا ہے لیکن اس کا ذہن جدید تھا۔ اپنے علم و فضل اور مطالعے سے اس نے احیاء العلوم کی راہیں ہموار کیں۔ اپنے ہم عصروں کو ماضی سے وابستہ کر کے انسانیت پرستی کی تحریک کو تقویت پہنچائی، جو آزادئ فکر، خود شعوری اور ذہنی ترقی پر منتج ہوئی بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر انسان نے اپنی ذات میں اپنا خدا تراش لیا، اپنے آپ کو خود مختار، آزاد بلکہ مختار کل اور قادر مطلق سمجھا، جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتا ہے کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اس پر واجب ہو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے:

"Humanism was initiated by secular men of letters. Its

predecessors were men like Dante and Petrarch. the fall of constantinople in 1453 provided Humanism with a boost, for many eastern scholars fled to Italy, bringing with them important books and manuscripts and a tradition of Greek scholarship. **Humanism had several significant features. First, it took human nature in all of its various manifestations and achievements as its subject. Second, it emphasized the dignity of man.** In place of the medieval ideal of a life of penance as the highest and noblest form of human activity, the humanists looked to the struggle of creation and the attempt to exert mastery over nature. Finally, Humanism looked forward to a rebirth of a lost human spirit and wisdom. **The effect of Humanism was to help men break free from the mental strictures imposed by religious orthodoxy, to inspire the free inquiry and criticism, and to inspire a new confidence in the possibilities of human thought and creations."** (69)

یعنی چند بے دین علماء نے اس تحریک کا آغاز کیا۔ سقوط قسطنطنیہ کے بعد مسیحی علماء یونانی علوم کی کتب لے کر اٹلی پہنچے، جس سے تحریک کو مہمیز ملی۔ اس تحریک کا زور انسانی وجود کی عظمت پر تھا انسانی عقل و شعور کو سب سے بلند مقام پر فائز کیا گیا۔ اس تحریک نے مذہبی نظریات کی زنجیریں توڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور آزادانہ تحقیق و تنقید (چاہے وہ خدا کے بارے میں ہو) پر زور دیا۔ انسانی صلاحیتوں اور عقل کو نیا اعتماد عطا کیا۔

Helican Encyclopaedic Dictionary of Ideas کے درج ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں:

"**Humanism:** belief in the high potential of human

nature rather than in religious or transcendental values." (70)

انسانیت پرستی یقین رکھتی ہے انسانی فطرت کی اعلیٰ صلاحیتوں پر، نہ کہ مذہبی یا الہامی اقدار پر۔

یعنی اس تحریک نے انسان کو مرکز مان کر باقی ہر طرح کی اقدار و ہدایات کا انکار کر دیا۔

ہیومنزم کے پیروکار اور علم بردار کیونکہ یونانی، لاطینی لٹریچر کے طلبا تھے۔ اس لیے ان پر یونانی، لاطینی شعراء، ڈرامہ نویسوں، فلسفیوں، تاریخ نویسوں اور ماہرین لسانیات کی تعلیمات کا براہ راست اور گہرا (incalculable) اثر تھا۔ لہٰذا وہ کلاسیکی Ideals اور قوانین سے گہرا شغف رکھتے تھے۔

ہیومنزم جب یورپ میں پروان چڑھی تو زیادہ نمایاں اور مذہب بے زاری کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ It sought to dignify and ennoble man اس کے متشددین کے نزدیک انسان کو crown of creation قرار دیا گیا۔ شکسپیئر (William Shakespeare) 1564-1616 (71) اپنے مشہور ڈرامے Hamlet میں ڈرامہ کے ہیرو Hamlet کی زبان سے درج ذیل الفاظ ادا کرتا ہے:

"........What a piece of work is man. How noble in reason, infinite in faculty, In forming and moving how express and admirable in action, How like an angel in apprehension, how like a god. The beauty of the world. The paragon of animals." (72)

The Penguin Dictionary of Literary terms and Literary Theory کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں:

"Humanism turned out to be a form of philosophy which concentrated on the perfection of a worldly life, rather than on the preparation for an eternal and spiritual life." (73)

ہیومنزم (مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے) فلسفہ (زندگی) بن گئی جس نے اپنی توجہ دنیاوی زندگی کی تکمیل پر مبذول کر لی اور ابدی (دائمی) وروحانی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آپ نے غور کیا! کہ پہلے تو انسان کو مرکز توجہ بنایا گیا پھر انسان کو ہی خدا بنا کر اس کی دنیاوی آسائشوں کی تکمیل کو عبادت/بندگی قرار دے لیا گیا اور زندگی کا مقصد دنیاوی جنت تخلیق کرنا قرار پایا اور پھر روحانیت اور آخرت کا کھل کر انکار کر دیا گیا۔

ہیومنزم کے تصورات وعقائد (beliefs) نشاۃ ثانیہ کے ادب پر چھائے رہے۔ فیسینو (Ficino c.1433-1499)، پائیکو (Pico Della c.1463-1494)، ایراس مس (Erasmus c.1466-1536)، گلیوم بوڈے (Guillaume Budé c.1468-1540)، سرتھامس (Sir Thomas More c. 1478-1535) [جنہوں نے یوٹوپیا کا تصور دیا تھا] اور مونٹین (Montaigne c.1533-1592) نمایاں انسان پرست (Humanists) شخصیات ہیں۔

اب تک اس دور (نشاۃ ثانیہ) کے جتنے خصائص بیان ہوئے ہیں اور پھر ہیومنزم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک چیز مشترک ہے یعنی فرد کی اہمیت کا اثبات۔ بعد میں جدیدیت کی روح یہی نفس پرستی یا انفرادیت پرستی قرار پائی۔ مذہب ہو یا اخلاقیات، ادب ہو یا سماجیات، واقتصادیات، ہر جگہ آخری معیار فرد اور اس کے تجربے کو سمجھا گیا ہے۔ گزشتہ پانچ سو سال میں مغرب نے گمراہی کی جتنی شاخیں پیدا کی ہیں وہ سب اسی انسانیت پرستی یا انفرادیت پرستی کے بیج سے نکلے ہوئے برگ وبار ہیں۔ یہی وہ اصول ہے جو نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا رشتہ "تحریک اصلاح دین" (Reformation) سے جوڑ دیتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے فوراً بعد بلکہ اسی دوران ہی "اصلاح دین" کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔

تحریک اصلاح دین (Reformation)

جیسا کہ ہم رومن تہذیب کے ذیل میں ذکر کر آئے ہیں کہ مسیحیت پر رومن تہذیب کا اس قدر اثر تھا کہ رومن کیتھولک کلیسا نے بھی انتظامی محکمے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس لیے نظم ونسق اور مالیات کے معاملے میں خرابیاں پیدا ہونا لازمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان خرابیوں کے خلاف وقتاً فوقتاً احتجاجی صدا بلند ہوتی رہی لیکن پندرھویں۔ سولھویں صدی کے آتے آتے یورپ کے حالات پہلے

سے نہیں رہے تھے۔ عقل پرستی اور ہیومنزم کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں، جس نے لوگوں کو مذہب کے خلاف سوچنے کا موقع فراہم کر دیا تھا، لیکن سب سے طاقتور احتجاجی صدا مارٹن لوتھر (74) (Luther, Martin King c.1483-1546) کی تھی۔ تحریک اصلاح دین کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر ڈریپر نے لکھا ہے کہ:

''سینٹ جُبٹین نے لوتھر سے کہا تھا کہ ''تجھ کو اس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ یسوع مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کے کفارۂ ذنوب کے لیے کافی ہے باقی جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا وہ پاپائے روما کو ترکہ میں ملا، تاکہ اس نجات کی روشنی میں ''تذکرات الغفر ان'' (Indulgences; remissions of punishment for sin.) لکھے جا سکیں۔'' اب آزادئ خیال کی ہوا چلنے لگی تھی، اس لیے جُبٹین کی اس ہرزہ سرائی کو اس دلیر جرمن راہب نے حقارت سے رد کر دیا۔ معصیت پر خط عفو کھینچنے کے لیے تذکرۃ الغفر ان کی فروخت کے ناپاک اور شرمناک طریقہ کی ابتداء ان اساقف نے کی تھی جنہیں اپنی اوباشیوں اور عیاشیوں کے لیے جب اور کسی طریقہ سے روپیہ نہ ملتا تو مسیح کے گلے کی کالی بھیڑوں کے ہاتھ پروانہ مغفرت ہی بیچ کر روپیہ وصول کرتے تھے۔ اس طرح ''اصلاح دین'' کی فوری محرک تذکرات الغفر ان ہوئی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ''سبب اصلی'' بھی جو اس کش مکش کی روح رواں تھا ظاہر ہو گیا۔

حقیقی بحث جس پر اس تمام جدوجہد کا دارومدار تھا یہ تھی کہ **''آیا انجیل کی حقیقت کا دارومدار کلیسا پر ہے یا کلیسا کی حقیقت کا دارومدار انجیل پر؟ بالفاظ دیگر معیار حق کا ماخذ ہے تو کونسا؟''**

ڈریپر مزید لکھتا ہے:

''پھر واقعات کا سلسلہ چل نکلتا ہے، لوتھر کا وٹن برگ (Witten berg) (75) کے گرجا کے دروازے پر 95 مسائل کا نصب کرنا۔ اور اس بجھ کی جواب دہی کے لیے روما طلب کیا جانا۔ اس کا پاپائے کو یہ لکھ بھیجنا کہ آپ اس وقت حقیقت حال سے خالی الذہن ہیں۔ اس پر بدعت اور زندقہ کا الزام لگایا جانا۔ ذاتی رائے کے استحقاق (اناجیل کے احکام کے اجتہاد کے بارہ میں) پر اختلاف۔ 1520ء میں لوتھر کا مسیحی جماعت سے خارج کیا جانا یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو مسیحیت میں دو فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی مستقل آویزش کا سبب بن گئے۔''(76)

پوپ لیو (Leo) کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لوتھر کی پیدا کی ہوئی تحریک فروخت تذکرات الغفران کے منافع کی بابت چند شوریدہ سر اور دنیادار پادریوں کا جھگڑا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں بہت زیادہ اندیشہ ناک اور نتیجہ خیز اسباب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے پوری پاپائی قوت کو باغی جماعت کی سرکوبی پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ پاپائے روما کے اس جوڑ توڑ نے وہ خوفناک اور تباہ کن لڑائیاں چھڑوائیں جنھوں نے سالہا سال تک یورپ میں قتل و خونریزی کا ہنگامہ برپا کیے رکھا اور مسیحی اقوام میں مستقل عداوتوں کا بیج بو دیا۔

واقعہ سینٹ برتھالومیو (1572ء) نے جس میں فرانسیسی پروٹسٹنٹوں کا قتل عام ہوا یورپ کو مبہوت و سراسیمہ کر دیا۔ اور کیا پروٹسٹنٹ۔۔۔ کیا رومن کیتھولک۔۔۔ سب کے جسموں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ غدارانہ بدعہدی اور وحشیانہ خونریزی کے لحاظ سے یہ واقعہ تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔(77)

اصلاح کنیسہ (Reformation) کا لب لباب یہ مسئلہ تھا کہ بائبل پر مسیحی المذہب شخص کی ہدایت کے لیے کافی و مکتفی ہے اور یہی مسئلہ تمام پروٹسنٹ کلیساؤں کے مسلمات میں داخل ہو گیا۔ روایت کی بنا منہدم ہو گئی اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ ہر شخص کو بذات خود مذہبی معاملات میں رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ غرض یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کا رستہ آخر انسان کے لیے کھل گیا۔ سادہ لفظوں میں یوں سمجھیے کہ لوتھر نے یہ دعویٰ کیا کہ دینی معاملات میں پوپ کا مکمل اقتدار غلط ہے۔ خدا نے انجیل انسانوں کی رہنمائی کے لیے نازل کی ہے اور ہر عیسائی کی نجات کا دارومدار اس کے انفرادی ایمان اور اعمال پر ہے اس لیے ہر آدمی کو حق پہنچتا ہے کہ براہ راست خدا کا کلام پڑھے اور اپنی فہم کے مطابق اسے سمجھے، خدا اور بندے کا تعلق براہ راست ہے اور پادریوں کو درمیان میں آنے کا حق نہیں۔۔۔ ہر آدمی کا فیصلہ خود خدا کرے گا۔ چنانچہ ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ دینی معاملات میں انفرادی طور پر خود ہی فیصلہ کر لے۔ یعنی مارٹن لوتھر نے فرد کو ذاتی اجتہاد اور تفسیر بالرائے کی پوری آزادی دے دی اور دینی معاملات میں ہر قسم کے استناد سے انکار کر دیا (یہی نظریہ اسلامی متجددین کے ذریعے اسلامی فکر میں داخل ہوا۔)

لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک کی پشت پناہی جرمنی کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے کی۔ اس میں ان کا سیاسی مفاد یہ تھا کہ روم کے کلیسا کا دینی اور سیاسی کردار ختم ہو جائے تو وہ مطلق حکمران بن

جائیں گے۔ چنانچہ سولہویں صدی سے رومن کیتھولک کلیسا کی مرکزیت ختم ہونے لگی اور پروٹسٹنٹ ملکوں میں قومی کلیسا قائم ہونے لگی اس کا مطلب صاف ہے کہ دین قومیت اور سیاست کے تابع ہو گیا دین میں فرد کی خودمختاری اور آزادی کا اصول قائم ہوگیا تو مغرب میں گمراہیاں بڑھتی چلی گئیں اور خود رومن کیتھولک لوگ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پروٹسنٹ تحریک کی کامیابی سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ لوگ فراخ ذہن اور روشن خیال تھے۔ نہیں! بلکہ یہ بھی اتنے ہی متعصب اور عقل وتحقیق کے دشمن تھے جتنے کیتھولک اور ان کو جہاں بھی اقتدار ملا اپنے مخالفین کی ایذا رسانی (persecution) میں رومن کیتھولکوں سے بھی بڑھ گئے۔ ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے:

> ''لوتھر اور ملنکتھان نے جو اصلاح کنیسہ کے بانی مبانی تھے عزم کرلیا کہ فلسفہ کو کلیسا کی سرحد سے خارج کر دیا جائے۔ لوتھر کا بیان تھا کہ ارسطو کی تصانیف کا مطالعہ بے سود ہے۔ ارسطو پر سب وشتم کا اس نے جو جھاڑ باندھا ہے وہ صنعت تبرا کی ایک انوکھی صنف سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اب لوتھر نے اس ضمن میں یوں گوہر افشانی فرمائی ہے''اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ملعون ابدی وشقی ازلی ہے، خبیثانہ ہرزہ سرائی کا موجد ہے، سرگروہ شیاطین ہے۔ فلسفہ کا ایک حرف نہیں جانتا۔ جھوٹا ہے۔ فریبی ہے۔ دغاباز ہے۔ بھتنا ہے۔ بکرا ہے۔ نفس پرست ہے۔ عیاش ہے۔ اس کے پیروکار ٹڈیاں ہیں۔ رینگنے والے کیڑے ہیں۔ مینڈک ہیں۔ جوئیں ہیں۔''

ڈریپر مزید لکھتا ہے:

> ''پروٹسٹنٹوں کے نزدیک اختلاف رائے ایسا جرم تھا جس کی پاداش میں سزائے موت دی جاتی تھی۔ اسی جرم کی پاداش میں سینٹ کیلون نے سروئیس کو جنیوا میں زندہ جلا دیا۔ سروئیس کا جرم صرف اس قدر تھا کہ اس کے عقائد فلسفیانہ تھے یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ مسیحیت کے اصل عقائد نیقیا (Naiceae) کونسل کے انعقاد سے پہلے ہی مٹ چکے تھے۔ اس عقیدے کی پاداش میں سروئیس کو دھیمی آنچ پر کباب کی طرح بھون ڈالا گیا۔'' (78)

حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک کیتھولک مذہب میں اصلاح کے نام پر برپا ہوئی تھی لیکن تعصب، جہالت اور تشدد میں کیتھولک مذہب سے دو قدم آگے نکل گئی۔ نتیجہ یورپ کی گمراہی اور مذہب بے

زاری کی صورت میں نکلا۔ سائنس کے مدمقابل پہلے ایک حریف یعنی کیتھولک چرچ تھا اب دوسرا حریف پروٹسٹنٹ چرچ کی صورت میں سامنے آیا۔ سائنس کو ایک بار پھر کڑی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا یعنی وہ اپنے پاؤں تورات کی اس چادر کے مطابق پھیلانے پر ابھی تک مجبور تھی جو طول میں پروکرسٹیز (Procrastaze) کے ضرب المثل والے فولادی پلنگ سے کم نہ تھی۔"(79)

عقلیت پرستی کا دور

یہ دور تقریباً سترھویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارویں صدی کے وسط تک چلتا ہے۔

سترھویں صدی کے وسط تک یورپ یہ طے کر چکا تھا کہ انسان کی جدوجہد کا میدان یہ مادی کائنات ہے اور انسان کا مقصد حیات محض تسخیر کائنات ہونا چاہیے۔ راجر بیکن نے مطالعہ فطرت کا طریقہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ انسانی صلاحیتوں میں سے کون سی صلاحیت ایسی ہے جو تسخیر کائنات کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ اس دور کے انسان نے یہ فیصلہ کیا کہ "عقل" کیونکہ یہی چیز سارے انسانوں میں مشترک ہے جو اسے دوسری مخلوقات کا حاکم بناتی ہے، لہٰذا یہ طے کر لیا گیا کہ انسان کی راہنمائی بس عقل کر سکتی ہے۔

جس تحریک کو عقلیت پسندی (Rationalism) کہا گیا Webster's Encyclopaedic Dictionary کے مطابق:

> "Rationalism: The doctrine that human reason unaided by divine revelation, is an adequate or the sole guide to all attainable religious truth."(80)

یعنی یہ عقیدہ کہ عقل انسانی سماوی وحی کے بغیر تمام مذہبی صداقتوں کے حصول کے لیے واحد رہنما ہے۔

عقلیت پسندی آہستہ آہستہ مغرب کے اساسی اصولوں میں شامل ہو گئی۔ اہل مغرب کے نزدیک عقلیت پسندی انسانیت کی معراج اور مادی، اخلاقی اور روحانی کمال و آسودگی کا لازمی وسیلہ ہے۔

عقلیت پسندی کا آغاز فرنچ فلاسفر ڈیکارٹ (Descartes c.1596-1650) (81) سے مانا جاتا ہے ڈیکارٹ نے انسانی وجود کی تعریف ایک مشہور لاطینی فقرے میں یوں کی ہے:

Cogito ergo sum (I think, therefore I am) .

وہ مزید کہتا ہے:

Commonsense is the most widely distributed commodity in the world, for everyone thinks himself so well endowed with it." (82)

یعنی عقل عام دنیا میں سب سے ارزاں (عام) جنس ہے۔ کیونکہ ہر کوئی خود ہی سوچتا ہے اس لیے وافر مقدار میں اس سے نوازا گیا ہے۔

گویا اس کے نزدیک وجود کا انحصار ذہن پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی نہ سوچے تو اس کا وجود باقی رہے گا یا نہیں؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ڈیکارٹ سے ایک آدمی نے پوچھا کہ "میرے کتے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" ڈیکارٹ کے ہم عصر فرنچ مفکر پاسکل (Pascal Blaise 1623-1662) (83) نے انسان کو سوچنے والا سرکنڈا Thinking Reed قرار دیا۔ یعنی انسان کے وجود کو جانور کی سطح سے بھی نیچے اتار دیا۔ (مغرب کی ساری جسم پروری کے باوجود مغربی فکر میں جسمانیت سے گھبرانے اور اسے حقیر سمجھنے کا رجحان خاصا قوی ہے اس لیے مغربی معاشرے میں جسمانی تذلیل کے شرمناک مناظر عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔) غرض جسم اور روح، مادے اور روح کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ڈیکارٹ نے مغربی فکر کو ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے، جس سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور مغربی ذہن ہر مسئلے پر روح اور مادے کے تضاد یا تقابل ہی کے لحاظ سے غور کرتا ہے عقلیت پسندی کا دعویٰ ہے کہ انسان کی عقل ہی علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کے مطابق عقل سے مراد دو چیزیں ہیں:

(۱) چند بدیہی سچائیاں (۲) قیاسی منطق (Deductive Logic) کے ذریعہ ان سے اخذ کی گئی تفصیلات۔ عقل، کل حقیقت کا احاطہ کرتی ہے بلکہ جو کچھ عقل کے احاطے میں آ سکے وہی حقیقت ہے باقی محض وہم و خیال ہے۔ عقلی طریقہ سے مرتب ہونے والا بیان حقیقت کا صحیح اور جامع بیان ہے۔

عقل کو حصول علم کا واحد ذریعہ ماننے میں دو پیچیدگیاں (complications) پیدا ہوتی ہیں: اولاً چونکہ عقل حقیقت کی فوق المادہ سطح کا بہت ناقص ادراک کر پاتی ہے۔ چنانچہ اس پر حصر کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت کی ان سطحوں یعنی خدا، ملائکہ، جنت وجہنم، روح انسانی، ملکوت السموات وغیرہ ان سب کا انکار کر دیا جائے۔ ثانیاً عقل خود اپنی حقانیت پر دلیل نہیں رکھتی۔ چنانچہ زیادہ اساسی ذرائع علم یعنی وحی والہام وغیرہ کا انکار کرنے کے نتیجے میں عقل کے اجزاء کو یکے بعد دیگرے ترک کرنا پڑتا ہے اور ذرائع علم، مشاہدے اور پھر اس کا بھی معیار زیادہ ناقص شکلوں میں گراتے چلے جانا پڑتا ہے۔

مغرب کی تاریخ میں یہی ہوا۔ عقلیت پسندی نے اٹھارویں صدی کی نام نہاد روشن خیالی (Enlightenment) (84) تک آتے آتے خدا کا حتمی انکار کر دیا۔ قطع نظر اس کے اسے لاالوہیت (Atheism)(85) کہا گیا یا لاادریت (Agnosticism)(86)، البتہ عقلیت پسندی کے اس ثمرۂ فاسد سے مغرب کو فکر کی بجائے خوشی ہی ہوئی کیونکہ وہ کم از کم چار سو سال قبل ہی خدا بیزاری میں مبتلا ہو چکا تھا۔

لیکن عقلیت پسندی کے دوسرے نتیجے یعنی عقل اور اس سے حاصل ہونے والے علم کی گھٹتی ہوئی حیثیت نے مغرب کو روحانی کرب اور علمی دقتوں میں مبتلا کر دیا۔ مغربی مفکرین نے جوں جوں ڈیکارٹ کی عقلیت پسندی کے دعووں کا محض عقلی بنیادوں پر جائزہ لیا، انہیں یہ دعوے بے بنیاد نظر آنے لگے۔ **ہاں اگر انہوں نے وحی والہام کو ذرائع علم کے طور پر تسلیم کر لیا ہوتا تو عقل کے استحکام کا ثبوت پا لیتے، گو وہ عقل، علم کا واحد اور بنیادی وسیلہ ہونے کی بجائے متعدد ذرائع میں سے ایک ثانوی ذریعہ قرار پاتی۔** لیکن عقلیت پسندی میں چونکہ عقل پرستی کے مثبت داعیے سے زیادہ نہیں تو کم از کم برابر شدت میں انکار وحی و کشف کا منفی داعیہ موجود ہے، اس لیے مغربی مفکرین اس نہج سے عقل کے لیے حاصل ہونے والی حمایت و تائید سے محروم رہے۔ عدم ثبوت کی وجہ سے عقلی ذریعہ علم کے اجزاء ایک ایک کر کے ترک کرنا پڑے اور بیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے ڈیکارٹ کی عقلیت پسندی کی جگہ ایک یاس انگیز تجربیت (Empiricism) (87) نے لے لی۔ جس کے مطابق عقل یا اس کے معذرت کیش مترادف لفظ "عقل عام" (common sense) اور اس سے تائید حاصل کرنے والے تنظیمی علوم (Formal sciences) یعنی منطق (Logic) اور ریاضی

(Mathematics) کا کردار صرف اتنا ہے کہ حسی تجربہ (Sense Experience) سے حاصل ہونے والے احساسات (Perceptions) کو منظم کر کے انہیں زیادہ واضح، قابل قبول اور منفعت بخش بنا سکے۔ مزید براں یہ کہ یہ منظم حسیات اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دیتے کہ ان کے پیچھے کوئی حقیقت ہے جس کی وہ آئینہ داری کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے اس بنیاد پر حاصل ہونے والا علم کائنات نہ تو گہرا اور جامع ہوگا اور نہ یقین ہی پیدا کر سکے گا۔

پھر بھی مغرب کے عملی قائدین یعنی سائنسدان اور سیاستدان عقلیت پسندی ہی کے قائل ہیں، خواہ اس کی حیثیت کتنی ہی گر چکی ہو۔ البتہ مغرب کے علمی اور ثقافتی علماء (Scholars) نے عقلیت پسندی کے نقص کو محسوس کرتے ہوئے عدم عقلیت (Irrationalism) (88) کی نہج اختیار کر لی۔ (اور یہ بھی دور مابعد جدید کا ایک فکری مظہر ہے۔) جس کا سب سے بڑا مظہر وجودی فلسفہ (Existentialism) (89) ہے۔ لیکن اس یاس و افلاس کی قبولیت کے پیچھے بھی وہی عقلیت پسندی سے وفاداری کام کر رہی ہے۔ چونکہ ''عقل'' کے علاوہ کوئی ذریعہ علم نہیں ہے اور یہ ''عقل''، حقیقی معرفت نہیں بخش سکتی، اس لیے نہ حقیقت کوئی شے ہے، اور نہ معرفت کا امکان ہے، اسی پر بحث آنے والی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی عقلیت پسندی کے پیچھے خدا بیزاری چھپی ہوئی ہے۔ یورپ کا انسان پہلے خدا بے زار ہوا۔ اور خدا کو فکر و عمل سے دور رکھنے کے لیے عقلیت پسندی بعد میں ایجاد کی۔ جیسا کہ ہم پیچھے لکھ آئے ہیں کہ مغرب نے اپنا فکری سرمایہ یونان و روم سے اخذ کیا۔ اس لیے مغرب کے فکری امام آج بھی سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عقلیت پسندی کی ابتداء بھی قدیم یونان سے ہوئی۔ ارسطو (Aristotle 384-322 BC) (90) کی فکر میں مادہ پرستانہ عقلیت پسندی کی ابتدائی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ بعد کے فلسفیوں نے اس رجحان کو آگے بڑھایا، پھر عیسائیت کی آمد نے مادہ پرستانہ یونانی فلسفے کو معطل کر دیا۔ لیکن جب مذہب کے علمبردار (پوپ، پادری) خود عیش کوشی اور مادہ پرستی میں گرفتار ہو گئے تو عوام نے بھی تیرھویں صدی کے آخر تک یونانی فلسفے کو اختیار کر لیا اور بہت جلد اس کی محدود مادہ پرستی کو ایک کامل اور مطلق شکل دے دی گئی۔ چنانچہ عقلیت پسندی تو محض ایک ظاہری چیز ہے جس کے پیچھے خدا بیزاری اور دنیا پرستی کا اصل داعیہ کارفرما ہے۔ حالانکہ یہ مادہ پرستی جس نے پانچویں

صدی قبل مسیح میں سر اٹھایا اور پندرھویں صدی عیسوی میں اپنے کمال کو پہنچی۔ یورپ کے ضمیر میں اپنے طور پر پیدا ہوئی، لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یورپ کے ناقص مذہب، پہلے یونانی ورومی بت پرستی اور بعد از اں تحریف شدہ مسیحیت، کی وجہ سے اس داعیے کو تقویت بھی ملی اور روحانیت کے مقابلے میں ایک آسان فتح بھی حاصل ہوئی۔

انقلاب فرانس (French Revolution)

فرانس کے جمہوری انقلاب نے محض فرانس پر ہی اثرات مرتب نہیں کیے بلکہ اس تاریخی واقعہ سے پورا یورپ شدید طور پر متاثر ہوا اور نتیجتاً مشرقی اور افریقی ممالک پر بھی اس کا اثر پڑا، یعنی انقلاب فرانس نے براہ راست دنیا پر اثرات مرتب کیے۔ یہ واقعہ تو 1790ء کے قریب ہوا اور بادشاہ کو قتل کر کے جمہوری حکومت قائم کر دی گئی تھی لیکن اصل اہمیت آزادی، جمہوریت، اور مساوات کے ان اصولوں کی ہے جو اس کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ اس انقلاب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فرانسیسی انقلاب کا دور 1789ء تا 1799ء ہے۔ اس دور میں فرانسیسی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس انقلاب کی ابتداء تو محض ایک قانونی بادشاہت قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ یہ 1792ء کا واقعہ ہے۔ لیکن انقلاب کے پر تشدد واقعات دوسری قوموں کے حملوں اور شدید قسم کے گروہی فسادات نے فرانس کو آخر کار جمہوریہ کا مرتبہ (Status) دلوا دیا۔ فسادات فرد کرنے اور خون آشام وحشت کی حکومت (Reign of Terror) کو ختم کرنے کے بعد فرنچ آرمی نے بیرونی دشمنوں پر بھی فتح حاصل کی۔ اور آخر کار فرانسیسی فوج کے جرنیل نپولین (Napoleon) (91) (1769-1821) نے 1799ء میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

اس سے پہلے 5 مئی 1789ء میں بادشاہ نے جب ٹیکس بڑھانے چاہے تو حکومت کے ارکان (معززین، ممبران کلیسا اور عوام) ورسیلز (Versailles) میں جمع ہوئے۔ لیکن اندرونی خلفشار اور بادشاہ (Louis XVI) کی جابرانہ حکومت کے خلاف عوام نے ہجوم کی صورت میں 10 اگست 1792ء میں پیرس میں شاہی محل پر حملہ کر دیا۔ اور 21 ستمبر 1792ء کو پہلی فرانسیسی جمہوریہ کا اعلان کر دیا گیا۔ 21۔ جنوری 1793 کو لوئی شانزدہم (Louis XVI) کو قتل کر دیا گیا۔

انقلاب فرانس کا نعرہ تھا۔ آزادی، اخوت، مساوات۔ اس انقلاب کو جمہوریت کی فتح

سمجھا جاتا ہے لیکن مغرب کا تصور جمہوریت (Democracy) واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے Chambers Dictionary میں جمہوریت کی تعریف اس طرح کی گئی:

"**Democracy:** a form of Government in which the **supreme power is vested in the people collectively,** state of society characterised by recognition of equality of rights and privileges, political, social or legal equality." (92)

''جمہوریت، حکومت کی ایک شکل ہے جس میں اقتدار اعلیٰ مجموعی طور پر عوام کے پاس ہوتا ہے۔ معاشرے کی ایسی حالت جس کی نمایاں پہچان حقوق کی مساوات ہوتی ہے۔ یہ مساوات سیاسی، سماجی اور قانونی حقوق کی ہوتی ہے۔''

یعنی جمہوریت کی رو سے طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔

ہمارے یہاں عموماً مغربی فکر سے متاثرہ حضرات یہ بات بلند بانگ دعوؤں سے کہتے ہیں کہ اسلام بھی جمہوریت اور مساوات کا پیغام لے کر آیا ہے۔ لیکن سمجھنے والی بات یہ ہے کہ مساوات اور جمہوریت دو ایسی اصطلاحات ہیں جن کا اسلامی لغت میں کچھ اور مطلب ہے اور مغربی کلچر اور فکر کی رو سے بالکل ہی مختلف ہے۔ لہٰذا مغربی مساوات اور جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اس بارے میں پروفیسر حسن عسکری لکھتے ہیں:

"انقلاب فرانس کے وقت تو بظاہر آزادی اور مساوات کا مطلب یہی تھا کہ ''عوام پر جبر نہیں ہونا چاہیے اور قانون کی نظر میں سب کا درجہ مساوی ہونا چاہیے۔'' مگر ان الفاظ میں جو مفہوم پنہاں تھا وہ آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ مغرب والے اس بات کے قائل ہیں کہ ''سارے انسانوں کی جسمانی اور نفسیاتی ضروریات ایک سی ہیں''(93)

یعنی مساوات صرف جسمانی ضروریات یا معاشرتی ضروریات اور انہیں پورا کرنے کے حقوق کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے سارے انسان مساوی ہیں۔ لہٰذا انسانوں کے درمیان درجہ بندی نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ ذہنی استعداد کے لحاظ سے انسانوں میں جو لازمی فرق ہوتا ہے۔ اسے بھی یہ لوگ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اسی اصول کی بناء پر یہ مطالبے ہوتے ہیں کہ، سب لوگوں کو ایک جیسا کھانا، کپڑا، مکان وغیرہ ملیں۔ اس سے بھی زیادہ مہمل مطالبہ یہ

ہوتا ہے کہ سب کو تعلیم بھی ایک جیسی ملے۔ اسی اصول کی بناء پر یہ لغو مطالبہ بھی ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں بھی سب کا درجہ مساوی ہونا چاہیے اور دین کی تشریح/تعبیر کا حق بھی سب کو مساوی طور پر ملنا چاہیے۔

ظاہر ہے مساوات کا یہ تصور انسانی فطرت کے حقائق کے بالکل خلاف ہے اور اس پر کبھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مگر مغرب والے اپنا ''جمہوری'' اصول اور اپنا ''مساوات'' کا تصور بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ صرف ''انسان'' کو بلکہ ''عام آدمی'' (Public opinion) کو ہر چیز کا آخری معیار بنا لیا گیا ہے۔ شعر و ادب ہو یا فلسفہ یا مذہب، ہر جگہ یہی مطالبہ ہے کہ جو بات ہو ''عام آدمی'' کے مطابق ہو اور اس کی جسمانی اور ذہنی ضروریات کو پورا کرتی ہو۔ چونکہ عام آدمی اپنی سطح سے اوپر اٹھنے کی استعداد نہیں رکھتا، اس لیے دوسروں سے کہا جاتا ہے کہ سب کے سب نیچے اتر کر عام آدمی کی سطح پر آ جائیں اور جو چیز عام آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ فضول ہے اس لیے گزشتہ صدی کو ''عام آدمی کی صدی'' کا نام بھی دیا گیا۔

''عام آدمی'' کی پرستش کے ساتھ ساتھ ''عام سمجھ بوجھ'' (Common sense) کی بھی پوجا ہو رہی ہے کہا یہ جا رہا ہے کہ جو چیز عام سمجھ بوجھ کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو وہ غلط ہے، یا لائق توجہ نہیں۔ اس لیے یہ خطرناک مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ جو چیزیں ''عام سمجھ بوجھ'' کے دائرے سے باہر ہوں انہیں یا تو ختم کر دیا جائے یا کانٹ چھانٹ کر عام سمجھ بوجھ کے دائرے میں لے آیا جائے۔ اس کا اثر ہمارے اسلامی معاشرے پر یہ پڑا کہ یہاں بھی مطالبہ کیا جانے لگا کہ ''اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں جو عام آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔ یا عام آدمی کو بھی اسلامی معاملات/ مسائل کی تعبیر و تشریح کا اتنا ہی حق ہے جتنا علماء کو'' اس کے پیچھے یہی ذہنیت کارفرما ہے۔

غرض جمہوریت اور مساوات کے اصولوں کو سیاست، معیشت اور قانون کے دائروں میں محصور نہیں رکھا گیا بلکہ ان دائروں میں بھی عائد کر دیا گیا جہاں ان کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔

جدیدیت (Modernism)

انگلش میں (Modern) کا لفظ عموماً (Traditional) کے مقابل بولا جاتا ہے اور اس سے مراد موجودہ دور کا رجحان اور فیشن ہوتا ہے۔

Chambers Dictionary کے مطابق:

"**Modern:** Characteristic of present or recent time: not ancient or medieval; in education mainly or wholly concerned with subjects of other than Greek and Latin"

اور Modernism کی Entry کے تحت درج ہے۔

"Modern usage, expression or trait; modern spirit or character; a tendency to adjust Christian dogma to the results of science and criticism" (94)

جدید، دور حاضر یا موجودہ زمانہ کی خصوصیت کو کہتے ہیں جو قدیم یا دور وسطیٰ کا نہ ہو۔ تعلیم میں اس سے مراد تمام تر ایسے مضامین جو یونانی یا لاطینی نہ ہوں۔

جدیدیت

"جدید استعمال، طریقہ اظہار یا رسوم، جدید حوصلہ / عزم یا کردار۔ مسیحی عقائد کو سائنسی اور تنقیدی نتائج سے ہم آہنگ کرنے کا رجحان"

The Penguin Dictionary میں مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"A comprehensive but vague term for a movement (or tendency) which began to get under way in the closing years of the 19th c. and which has had a wide influence internationally during much of the 20th c. The term pertains to all creative arts, especially poetry, fiction,

drama, painting, music and architecture. There have been various theories as to when the movement (or its tendencies) was at its height (some suggest the 1920s for this) and as to whether the modernist movement is actually over. Some have suggested that modernism, as an innovative and revivifying movement, was played out by the late 1940s, and that it was then that post-modernism began" (95)

ایک جامع لیکن مبہم اصطلاح ہے جو اس تحریک (یا رجحان) کیلئے استعمال ہوتی ہے، جس کا آغاز انیسویں صدی کے اختتامی سالوں میں ہوا۔ اس تحریک کا وسیع اثر بین الاقوامی طور پر بیسویں صدی میں زیادہ ہوا تھا۔ یہ اصطلاح آرٹس، خاصوصاً شاعری فکشن، ڈرامہ، مصوری، موسیقی اور تعمیرات تمام پر محیط ہے۔ اس تحریک کے دور عروج کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ (بعض کے نزدیک 1920ء کے اردگرد کا زمانہ) اس بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ "جدیدیت" کا اختتام کب ہوا۔ بعض تجویز کرتے ہیں کہ "جدیدیت" تخلیقی اور زندگی سے بھرپور تحریک کے طور پر 1940ء کے قریب سرگرم تھی۔ اور یہی وہ دور تھا جب 'مابعد جدیدیت' کا آغاز ہوگیا"

جدیدیت کیا ہے؟

مابعد جدیدیت / پس جدیدیت دراصل جدیدیت کے ردِعمل کا نام ہے۔ اس لیے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جدیدیت کو سمجھا جائے۔ جیسا کہ ہم نے The Dictionary Penguin کے حوالے سے ابھی پڑھا ہے کہ جدیدیت دراصل ان نظریاتی، تہذیبی اور سماجی تحریکوں کے مجموعہ کا نام ہے جو 17ویں اور 18ویں صدی کے یورپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی استبداد کے ردِعمل میں پیدا ہوئیں۔

اور جب "جدیدیت" کے رجحان کا آغاز ہوا تو یہ وہ دور تھا جب یورپ میں کلیسا کا ظلم اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا (اور جس کے بارے میں تفصیلاً تذکرہ ہو چکا ہے۔) تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفہ اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے کچھ خود ساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے۔ اور ان نظریات کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی آواز کو وہ مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ شاہی حکومتوں کے

ساتھ گٹھ جوڑ کر کے انہوں نے ایسا استبدادی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں کسی بھی آزاد علمی تحریک کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دوسری طرف سپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل (Interaction) کی وجہ سے عیسائی دنیا میں بھی حریت فکر کی ہوائیں آنے لگی تھیں۔قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ تجرباتی سائنس کے درس رنگ لا رہے تھے، اور یورپ کے سائنس دان آزاد تجربات کرنے لگے تھے۔" حریتِ انسانی اور مساوات کے اسلامی تصور" کے اثرات نے جنوبی اٹلی اور صقلیہ (Sicily) میں انسان دوستی اور بعد میں انسانیت پرستی (Humanism) کی جدید تحریکیں پیدا کی تھیں۔ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے استبداد کے خلاف شدید ردِعمل پیدا کیا اور" جدیدیت" کی تحریک شروع ہوئی۔ چونکہ اس تحریک سے قبل یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دور دورہ تھا۔اس لیے اس تحریک نے پورے عہد وسطیٰ کو تاریک دور (Dark Ages) قرار دیا۔ مذہبی (کلیسائی) عصبیتوں، روایت پسندی اور تنگ نظری کے خاتمے کو اپنا اصل ہدف بنایا۔شدید ردعمل نے اس تحریک کو دوسری انتہاء پر پہنچا دیا اور روایت پرستی اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے یہ تحریک مذہب اور مذہبی معتقدات ہی کے خلاف ہوگئی۔

جدیدیت کی اس تحریک کی نظریاتی بنیادیں فرانسس بیکن (Bacon Francis 1561-1626) (96)، رینے ڈیکارٹ (تعارف پیچھے بیان ہوا)، تھامس ہوبز (Hobbes Thomas 1588-1679) (97) وغیرہ مفکرین کے افکار میں پائی جاتی ہیں۔ان مفکرین اور دیگر کے خیالات کے مطالعے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر ان مفکرین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ **"یہ دنیا اور کائنات عقل، تجربے اور مشاہدے کے ذریعے قابل دریافت (knowable) ہے اور اس کے تمام حقائق تک سائنسی طریقوں سے ہی رسائی ممکن ہے"۔ (98) اس نظریہ کا منطقی طور پر لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ" حقائق کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمہ کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا کہیں وجود ہے۔صرف وہی حقائق قابل اعتبار ہیں جو عقل، تجربے اور مشاہدے کی مذکورہ کسوٹیوں پر کھرے ثابت ہوں"۔** جدیدیت کے حامی فلسفیوں نے مابعد الطبیعیاتی مزعومات (Metaphysical Contentions) اور مذہبی دعووں کو اس وجہ سے قابل رد قرار دیا کہ وہ ان کسوٹیوں پر پورے نہیں اترتے۔ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ ڈیکاٹ نے "I think therefore

"I am" کا مشہور اعلان کیا جو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔

عقلیت پرستی (Rationalism) کی ذیل میں ہم پاسکل، مانٹسکیو، ڈیدارات، وسلی، ہیوم اور والٹیر وغیرہ جیسے مفکرین کا تذکرہ کر آئے ہیں، ان مفکرین نے بھی عقل کی لامحدود بالادستی اور واحد سرچشمۂ علم ہونے کے تصور کو عام کیا اور یہی عقلیت پرستی بعد میں جدیدیت کی بنیاد بنی۔ چنانچہ سابقہ مباحث کی روشنی میں ہم جدیدیت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں: **جدیدیت وہ روشن خیالی اور انسانیت پرستی ہے جو کسی بھی ہستی کی بالادستی اور روایت (Tradition) کو مسترد کرتی ہے اور صرف 'عقل اور سائنسی علوم' ہی کی Authority کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ سچائی اور معنی کا واحد منبع (Source) خودمختار فرد کی عقل ہے۔ کارتیسی (Descartes) اصول: فکر کردم پس ہستم۔**

جدیدیت کی تحریک نے قوم پرستی اور قومی ریاستوں کا تصور بھی عام کیا۔ انھی افکار کے بطن سے جدید دور میں جمہوریت (Democracy) نے جنم لیا۔ اور یورپ اور شمالی امریکہ کے اکثر ملکوں میں خودمختار جمہوری قومی ریاستیں قائم ہوئیں۔

معاشی محاذ پر اس تحریک نے اول تو سرمایہ دارانہ معیشت اور نئے صنعتی معاشرے کو جنم دیا جس کی بنیاد ایڈم سمتھ (Adam Smith) کی معاشی فکر تھی جو صنعت کاری، آزادانہ معیشت اور کھلے بازار کی پالیسیوں سے عبارت تھی۔ نئے صنعتی معاشرے میں جب مزدوروں کا استحصال شروع ہوا تو جدیدیت ہی کے بطن سے مارکسی فلسفہ پیدا ہوا، جو ایک ایسے غیر طبقاتی سماج کا تصور پیش کرتا تھا، جس میں محنت کش کو بالادستی حاصل ہو۔

اخلاقی محاذ پر اس تحریک نے افادیت پرستی (Utilitarianism) کا تصور عام کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ **اخلاقی قدروں کا تعلق افادیت سے ہے۔ جو رویے معاشرے کیلئے فائدہ مند ہیں، وہ جائز اور جو سماج کے لیے نقصان دہ ہیں، وہ ناجائز رویے ہیں۔ اور یہ کہ افادیت اخلاق کی واحد کسوٹی ہے۔** افادیت کے تصور نے قدیم جنسی اخلاقیات اور خاندان کے روائتی ادارے کی افادیت کو چیلنج کیا، جس کے نتیجے میں جدید اباحیت (Permissiveness) کا آغاز ہوا۔

جدیدیت ہی کے بطن سے نئے صنعتی معاشرے میں نسائیت (Feminism) کی تحریک پیدا ہوئی، جو مردوزن کی مساوات کی علم بردار تھی۔ اور عورتوں کو ہر حیثیت سے مردوں کے مساوی مقام دلانا اس کا نصب العین تھا۔

انقلاب فرانس، برطانیہ میں جمہوریت کی تحریک، امریکہ کی آزادی کی تحریک اور اکثر یورپی ممالک کی تحریکیں جدیدیت کے ان افکار ہی سے متاثر تھیں۔ ۲۰ ویں صدی کے آتے آتے یورپ اور شمالی امریکہ کے اکثر ممالک ان افکار کے پرجوش مبلغ اور داعی بن گئے۔

جدیدیت کے متعلق چند بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے۔ (Anthropocentricity)

۲۔ آزادی بنیادی آئیڈیل ہے۔ (Freedom is ideal)

۳۔ مساوات بنیادی قدر ہے۔ (Equality is basic value)

۴۔ عقلیت بحیثیت معیار۔ (Reason is the criterion)

جدیدیت کی خصوصیات

اس مقام پر ہم جدیدیت کی ماہیت کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس کا لادینیت یا مذہب دشمنی (Anti Religion Secularization) سے گہرا تعلق واضح ہو جائے۔

(i) حق (Truth) کو جاننے کے دو ذرائع/ماخذات

پیچھے ہم Chambers Dictionary کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ ابتداء میں جب جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا تو اصل میں مسیحی مفکرین کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر بائبل کی تعلیمات اور مسیحی عقائد کو جدید سائنسی تحقیقات سے ہم آہنگ کر سکیں۔ لیکن اس کوشش میں جب بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو جدیدیت نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اور یہ رجحان تھا مذہب بےزاری اور بعد میں انکار مذہب۔ لہٰذا جدیدیت کی فکر مذہب کے خلاف بغاوت ہے۔ اس لیے انتہائی سوچ سمجھ کر مفکرین اور فلاسفہ نے جدیدیت سے پہلے کے دور کو تاریک دور (Dark ages) کہا، کیونکہ اس دور میں علمیت (Epistemology) مذہب سے آرہی تھی یعنی عیسائیت

ــــت۔ عیسائیت کا دعویٰ تھا (اور یہ بدیہی امر ہے) کہ سچائی صرف ایک ہے جسے انسان جنم نہیں دیتا بلکہ صرف دریافت کر سکتا ہے۔ وحی کے ذریعے اور اگر آپ نے وحی کا انکار کیا تو آپ سچائی نہیں جان سکتے (یہی سامی ادیان کا مشترکہ موقف ہے)۔ جدید سوچ نے دعویٰ کیا کہ سچائی تک پہنچنے کے لیے وحی کوئی آخری ذریعہ (Ultimate Source) نہیں ہے۔ انسان کے پاس ایسے ذرائع (Faculties) ہیں جن پر انحصار کر کے وہ حق کو جان سکتا ہے۔ مثلاً عقل (Intellect)، وجدان (Intuition)، حواس (Senses)، تجربات (Experiments)، مشاہدات (Observations) وغیرہ حصول حق کے لیے کافی ہیں۔ اس کے لیے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ Encyclopaedia of Philosophy میں لکھا ہے:

"One of the most and lasting achievements of modernism in all its manifestations is the devaluation of the premise that we occupy an 'objective' reality accessible to but independent of human perception" (99)

لہٰذا جدیدیت پرست حق (Truth) تک رسائی کے لیے دو قدروں پر ایمان رکھتے ہیں یعنی ان کے نزدیک ان دو قدروں کو اپنائے بغیر حق تک رسائی ممکن نہیں:

(۱) آزادی (**Freedom**): ہر انسان مکمل طور پر آزاد ہے کہ وہ اپنے خیر و شر کے پیمانے جیسے چاہے بنا سکتا ہے۔

(۲) عقل (**Rationality**): خیر و شر کے پیمانوں کے لیے بطور کسوٹی عقل کی دلیل دینا ہو گی۔ یعنی آزادی کا نصب العین عقل ہی کے ذریعے ممکن، انسان آزاد اسی وقت ہو گا جب وہ اپنی عقل (Faculty of Reason) کو استعمال کرے۔ ڈاکٹر ایلین ٹورین (Alain Touraine) کے الفاظ ہیں:

"Modernity is not based upon one single principle...... it is the result of a dialogue between reason and subjectivity" (100)

(ii) جدیدیت انسان کی کامل خدائی (آزادی) کا اعلان

جدیدیت کی فکر کے مطابق انسان مکمل طور پر آزاد ہے کہ وہ جو چاہے چاہ سکے، جدیدیت خواہشاتِ نفسانی کی الوہیت کا اعلان ہے۔اس کے خیال میں یہ تمام خواہشات (Subjective) کہلاتی ہیں۔اسے (Modern subjectivism) بھی کہا جاتا ہے۔یعنی اس فکر نے انسان کو خدا کا درجہ دے دیا۔

Encyclopaedia of Philosophy کے مطابق:

"To be autonomous is to be free in th sense of self governing and independent" (101)

(iii) خدا، موت، زندگی کو صرف عقل کے ذریعے جاننے کا دعویٰ

جدیدیت نے انسان کو اہمیت دی اس لیے کہ یہ خود مختار ہے اور عقل کی (Faculty) سے ہمکنار ہے۔اس لیے اس فکر کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ Anthropocentric ہے یعنی انسانی تناظر میں حقیقت کا ادراک کرتی ہے۔اس لیے انہوں نے عیسائیت کا رد کیا اور مابعد الطبیعیاتی حقائق (Metaphysical) کو عقل کے ذریعے جاننے کا دعویٰ کیا۔

کورنیلیا کلنگر (Cornalia Klinger) لکھتی ہے:

"This cleavage between reason, rationality or objectivity on the one hand, and the subject, the collective and individual selfhood or subjectivity on the other, occurs in the aftermath of the decline of a concept of transcendence that shaped the metaphysical wordview of Christianity"(102)

(iv) مذہب اور خدا کے بارے میں تشکیک و انکار

جب مابعد الطبیعیاتی حقائق کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کا رواج چل نکلا تو نتیجہ مذہب اور خدا کے بارے میں تشکیک اور بعد میں دونوں کے انکار کی صورت میں نکلا۔لہٰذا اس تحریک (جدیدیت) نے

مذہبی محاذ پر الحاد اور تشکیک کو جنم دیا۔ والٹیر (Voltair Francois 1694-1778) (103) جیسے الحاد کے علمبرداروں نے مذہب کا کلیتاً انکار کر دیا۔ جبکہ ہیگل (Georg Wilhelm Friedrich Hegel 1770-1831) (104) جیسے متشکک مذہب کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں۔ اور مذہبی حقائق کو بھی دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابل تغیر قرار دیتے ہیں۔ نطشے (Nietzsche Friedrich Wilhelm 1844-1900) جیسا فلسفی (105) خدا کے بارے میں کیسا گستاخانہ نظریہ رکھتا ہے درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے، اپنی تحریر (The Death of God) میں وہ لکھتا ہے:

"New struggle......God is dead; but given the way of men, there may still be caves for thousands of years in which his shadow will be shown".

اسی کتاب کے دوسرے مقام پر خدا کو عقل کے ترازو میں اس طرح تولا گیا ہے:

"The conditions for God..... God himself cannot exist without wise people".

نطشے مسیحی مذہب کے تصور خدا کا یوں انکار کرتا ہے:

"The Christian conception of God, is one of the most corrupt conceptions of God arrived at on earth. God degenerated to the contradiction of life, instead of being its transfiguration and eternal yes; In God a declaration of hostility towards life, nature, the will of life; God the formula for every lie about the next world. In God nothingness deified, the will to nothingness sanctified"(106)

برٹرینڈ رسل (Russell Bertrand 1872-1970)(107) انگریز فلسفی اور ریاضی دان خدا کے بارے میں اپنی تشکیک کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ جدید طبیعیات (Modern Physics)--- میں وحدت (خالق یعنی خدا)-- خواہ یہ کتنی ہی مبہم اور بے نام سی کیوں نہ ہو۔ مابعد الطبیعیات کی حیثیت سے

کوئی گنجائش نہیں۔ عوامی نقطہ نظر سے سائنس آج جتنی فتح یاب ہے شاید کبھی بھی نہ رہی ہو۔"

"اس صورتحال کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بسر کرنے کی خاطر مابعد الطبیعیاتی عقائد اور عملی عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچا جائے۔ مابعد الطبیعیات میں میرا نقطہ نظر بڑا سیدھا اور مختصر ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خارجی کائنات ممکن ہے کہ ایک التباس (Illusion) ہو۔ لیکن اگر یہ موجود ہے تو یہ نہایت مختصر، غیر منظم اور بے ہنگم واقعات سے عبارت ہے۔ تنظیم، ترتیب اور تسلسل انسانی اختراعات ہیں..... کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ کائنات کو ایک خالق نے تخلیق کیا تھا؟ یقیناً نہیں۔ اگر ہم سائنسی استنتاج کی سختی سے پابندی کریں تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس امر کا کوئی جواز موجود نہیں کہ کائنات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ از خود موجود نہیں ہو سکتی۔۔۔

جہاں تک میں جائزہ لے سکا ہوں اس مفروضے میں کہ کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے، کوئی سامان تسکین موجود نہیں" (108)

(v) جدیدیت مذہب دشمن ہے صرف عیسائیت دشمن نہیں

درج بالا اقتباسات سے ذیلی طور پر اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جدیدیت کا پروجیکٹ عیسائیت کو رد کر کے ہی شروع ہوا لیکن جدیدیت کا رجحان محض Anti Christianity تک ہی محدود نہ رہا بلکہ یہ اپنے جوہر (essence) میں مذہب دشمن، خدا دشمن اور وحی دشمن (Anti Religion) ثابت ہوا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مذاہب میں اقدار و حقائق کا تعین انسان خود نہیں کرتا بلکہ حقیقت، معروضیت، حق اور خیر کو روایت (Traditions) یا وحی الٰہی کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ یاد رہے کہ دیگر مذاہب میں روایت بھی وحی کی ایک محرف شکل ہے جبکہ اسلام میں روایت (Traditions) سے مراد حدیث رسول ﷺ (Sayings of the Prophet) ہوتی ہے۔ اور اسلام میں حجیت کے لحاظ سے قرآن کے بعد حدیثِ نبوی ﷺ کا مقام ہے۔ اس بات پر مغربی مفکرین بھی اتفاق رائے قائم کر چکے ہیں کہ جدیدیت لازماً غیر مذہبی رویہ ہی رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ اس کی علمیت (Epistemology) انسان اور عقل ہے۔ جبکہ مذہب کی علمیت وحی ہوتی ہے۔ جو کہ انسان کے چاہنے یا نہ چاہنے اور انسانی عقل پر انحصار نہیں کرتا۔

"Losing hold in traditional religion as a consequence of secularization the subject is forced to take up the god-like position of a transcendental modal point in order to ensure the unity and totality of being and experience" (109)

مغربی مفکرین اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ جدیدیت کی فکر جو کہ عقل کے ذریعے حق کے تلاش کا دعویٰ کرتی ہے کبھی مذہبی قوت کو جس کو جدیدیت نے خیر باد کہہ دیا تھا عقل کے میدان کے ذریعے واپس نہیں لا سکتی۔ جرگن ہیبر ماس (Jurgen Habermas 1929) لکھتا ہے۔

"But the principle of subjectivity is not powerful enough to regenerate the medium of reason. The demotion of religion leads to a split which the Enlightenment cannot overcome by its own power" (110)

(vi) جدیدیت نے انسان کو مرتبہ انسانیت سے گرادیا

جدیدیت کی تحریک کیونکہ Anthropocentric تھی لہٰذا اس نے کائنات، زندگی، انسان اور خالق کائنات وغیرہ کے دائمی اور ابدی سوالات کو انسانی عقل کے تناظر میں حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو اس نے انسان کو خدا کے مرتبے پر فائز کر دیا۔ اور دوسری طرف انسانی خواہشات کی پیروی میں انسان کو محض Animal قرار دے کر انسانیت کے مرتبے سے بھی گرادیا۔

پروفیسر ولیم بیک (Williams Beck) اپنی کتاب Modern Science and the Nature of Life میں لکھتا ہے:

”جب ہکسلے (Huxley) نے انسان کے مورث اعلیٰ کے متعلق اپنے خیالات شائع کیے تو انسان کی مفروضہ تذلیل پر سو سال تک لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے رہے۔ اور پاک بازی اور اخلاق کے علم بردار چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ سائنس اپنی حدود سے تجاوز کر رہی ہے۔ فرائیڈ کے سائنسی نتائج کے اعلان پر بھی ایسا ہی واویلا ہوا۔ بایں ہمہ مرور زمانہ کے ساتھ ارتقاء اور نفسیاتی تجزیہ کے نظریوں نے مقبولیت عامہ حاصل کی۔ حقیقت یہ ہے کہ

ان دونوں نظریوں نے تمام انسانوں کی ثقافت، مذہب، کلچر اور روزمرہ کے خیالات پر بے اندازہ اثر ڈالا۔(111)

جدیدیت کے علمبردار اگرچہ برساتی مینڈکوں کی طرح بے شمار دانشور تھے۔لیکن تین دانشور عظیم ذہنی انقلاب کا باعث بنے۔ نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) کا بانی چارلس ڈارون، نظریہ اشتراکیت (Socialism / Communism) کا علمبردار کارل مارکس اور نفسیات جدید کا بانی سگمنڈ فرائیڈ۔ یہ تینوں حضرات مغربی تہذیب جدید کے بنیادی معمار قرار دیے جاسکتے ہیں۔ان کے پیش کردہ نظریات نے مغربی خیالات کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ان کے جائزہ کے بغیر دانش حاضر کے نزدیک نظریہ حیات کی کوئی بحث مکمل نہیں کہلاسکتی۔

چارلس ڈارون (Darwin Charles Robert 1809-1882)

ڈارون نے نباتات وحیوانات کا برسوں گہرا مطالعہ کیا اور اپنے وسیع مطالعہ کے بعد اس نے 1859ء میں مبدا انواع حیات (Origin of Species) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ۔جس میں اس نے اپنا نظریہ ارتقاء (Theory of Evolution) پیش کیا۔ڈارون کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ جانوروں میں توالد و تناسل کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر ان کی نسلوں کا بہت بڑا حصہ مسلسل ختم نہ ہوتا رہے تو ان کی تعداد ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے گی۔

2۔ اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی رفتار تولید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانوروں میں جہد للبقاء (Struggle for Existence) کا عمل رونما ہو۔کش مکش حیات کا یہی عمل بقا اصلح (Survival of the Fittest) کا باعث بنا کرتا ہے۔

3۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک نوع کے جانوروں کے انفرادی جسموں کی ساخت میں قدرے اختلاف (Individual Difference) ہوا کرتا ہے۔یہ اختلاف نسلوں میں خفیف لیکن مسلسل ردو بدل (Variation) کا باعث بنتا ہے۔

4۔ ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جہد للبقا کی مسلسل کوشش سے اعضاء حیوانی میں جو خفیف ردو بدل پیدا ہوتا ہے وہی مفید ردو بدل آنے والی نسلوں میں قدرتی انتخاب (Natural Selection) کرتا ہے۔مفید ردو بدل کا مسلسل اجتماع ہی باقی رہنے

والی نسلوں میں عملِ ارتقاء (Evolution) کا سبب بنتا ہے۔

5۔ ارتقائی منزل طے کرنے کا یہ عمل نہایت سست رفتار ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا لیکن یہ عمل نباتات اور حیوانات کی ہر نوع (Species) اور قسم (Genus) میں قرن ہا قرن سے جاری چلا آتا ہے۔

6۔ حیوانوں کے انواع واقسام کی اکثر کڑیاں اس قدر مسلسل اور مربوط نظر آتی ہیں کہ ایک نوع دوسری نوع کی ارتقائی شکل نظر آتی ہے۔ اور یہ تسلسل اس بات کی طرف رہبری کرتا ہے کہ انسان بن مانس اور بندر کی ارتقائی شکل ہے۔ اور اس پوری ارتقائی لڑی کی ابتدائی کڑی کوئی واحد خلیہ (Cell) والا خورد بینی، کرم حقیر (Unicellular microscopic organism) ہوگا۔ (112)

گویا کرشمہ حیات ایک ارتقائی عمل ہے جو ایک حقیر کیڑے سے شروع ہو کر حضرتِ انسان تک پہنچا اور اس ارتقائی عمل کے تمام تر اسباب حیاتیاتی کیمیا (Biochemistry) اور میکانی (Mechanical) اصول ہیں۔ عناصر کے کسی ابتدائی اور اتفاقی جوڑ توڑ (Chance) نے صرف ایک خورد بینی خلیہ حیات (Life Cell) پیدا کیا۔ جس میں حیات کی صلاحیتیں نمودار ہوئیں۔ حوادثِ زمانہ سے نبرد آزمائی اور کروڑوں سالوں کے مسلسل قدرتی انتخاب (Natural Selection) اور ارتقائی رجحان (Evolutionary Trend) نے اس کرمکِ ذی حیات (Life Cell) کو انسانی شکل تک ترقی دے دی۔ ارتقاء کی مختلف منزلوں کے دوران جانوروں کی مختلف شکلیں وجود میں آئیں۔ جن میں سے کچھ موجود اور کچھ ناپید ہیں۔

لہٰذا ابتدائی اتفاق (Chance)، جسمانی ساخت میں ردوبدل (Mutation and Variation) کی صلاحیت اور احسن ردوبدل کے قدرتی انتخاب (Natural Selection) کے نتیجہ میں بقا اصلح (Survival of the Fittest) کے اصول نے یہ سب کرشمہ کر دکھایا۔ کسی پس پشت ذی اقتدار خالق کی قدرت، ارادہ اور مقصد کے مفروضہ کے بغیر ہی کائنات کا وجود اور اس کا ارتقاء اس طرح ثابت ہو جاتا ہے اور قدرت، ارادہ اور مقصد کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ کائنات میں حیات کے مختلف النوع مظاہروں کی اس توجیہ نے حیات انسانی کی مذہبی اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا۔ اور شرم وحیا مغربی معاشروں سے رخصت ہوگئی۔ جدیدیت پسند طبعیتیں

مسرور ہوگئیں۔ انہیں اپنے میلان طبع کے مطابق کائنات میں حیات کے وجود کی کیمیاوی (Chemical) اور میکانی (Mechanical) توجیہ (Justification) مل گئی۔ اور ایک اچھے خاصے منطقی اور سائنسی لبادے میں ملی۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ اس نظریہ کی کمزور اور (Missing) کڑیوں کو دانستہ نظر انداز کردیا گیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے مادہ پرستی کو استحکام بخشا اور روحانیت شدید طور پر مجروح ہوگئی۔ انسان جب بنیادی طور پر ایک مادی مشین قرار پایا تو روح اور جسم کے جھگڑے خود بخود طے ہونے لگے۔ روح کے وجود کا تصور سائنس کی نظر میں شروع سے ہی مشتبہ تھا۔ اور ایک واہمہ سے زیادہ کی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ محتاجی صرف اس بات کی تھی کہ جسمانی اور نفسیاتی عمل کی کوئی تشفی بخش توجیہ نہ مل رہی تھی۔ جسمانی عمل کی توجیہ حیاتیاتی کیمیائی، میکانی اصولوں اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے پیش کی تو نفسیاتی عمل کے لیے ایک یہودی ڈاکٹر اور ماہر نفسیات نے بیڑا اٹھایا۔

سگمنڈ فرائیڈ (Freud Sigmund 1865-1939)

فرائیڈ آسٹریا کے ضلع موراویا کی ایک چھوٹی سی بستی فریل برگ (Freil Berg) کے ایک متوسط الحال یہودی گھرانے میں 1865ء میں پیدا ہوا۔ بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کے بعد اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ قوم سمجھتے آئے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کی موعود سرزمین (Promised Land) کا حصول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ وہ جہاں کہیں رہے اسی نصب العین کے پیش نظر اپنی نسلوں کو مناسب قومی تربیت دینے کے لیے علیحدہ اپنے محلے بناکر سادے گھروندوں (Ghettoes) میں رہے۔ بنی اسرائیل کے افراد ایک بڑی تلخ حقیقت کا شکار ہیں۔ پیدا ہوتے ہی ان کے کانوں میں یہ ٹھونسا جاتا رہا ہے کہ وہ خدا کی پسندیدہ اور برگزیدہ قوم ہیں، ایک ایسی نسل جسے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کے لیے مختص کرلیا ہو اور جسے دنیا کی دیگر اقوام پر فضیلت دی گئی ہو۔ لیکن آنکھیں کھولنے اور ہوش سنبھالنے کے بعد وہ ہمیشہ یہی دیکھتے آئے ہیں کہ وہ دنیا کی مغضوب علیہ قوم ہیں۔ جسے ظلم وستم کا تختہ مشق بننے کیلئے چن لیا گیا ہو اور جو تاریخ کے ہر دور میں اقتدار اور فضیلت سے محروم اور مصائب سے دوچار رہی ہو۔

عقیدہ اور مشاہدہ کے اس بیّن تضاد نے بنی اسرائیل کے سمجھدار طبقہ میں ایک طرف خدا سے

مایوسی اور لادینی رجحان کو اجاگر کیا اور دوسری طرف نسلی تعصب کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایسے دانشور پیدا ہونے لگ گئے جو بیک وقت خدا کے منکر بھی ہوتے اور مذہبی راہنماؤں ہی کی سرکردگی میں نسلی تحریک کے پرجوش حامی بھی۔ فرائیڈ بھی اس ماحول کی پیداوار تھا۔ منکر خدا بھی اور نسلی طور پر کٹر یہودی بھی۔ فرائیڈ کا سوانح نگار ڈاکٹر جونز (Ernest Jones) لکھتا ہے:

> ''فرائیڈ خدا اور حیات بعد الممات کے عقائد سے منکر ہی پروان چڑھا تھا اور اس نے ان عقائد کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں کی۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی بیخ و بن میں اپنے آپ کو یہودی سمجھتا تھا۔ اور اپنے یہودی ہونے کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ یہودیوں کے خلاف معمولی اشارہ سے ہی غیر معمولی تاثر لینے کی یہودی حس، اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اس نے بہت ہی کم ایسے لوگوں کو دوست بنایا جو غیر یہودی تھے۔ وہ ایک ایسا دہریہ تھا جو کبھی خدا کا قائل نہ ہوسکا''۔ (113)

ویانا میں فرائیڈ انیسویں صدی کے ربع آخر میں نفسیاتی بیماریوں کا ایک مشہور معالج تھا۔ اس نے نفسیاتی بیماریوں کا ایک جدید طریقہ علاج دریافت کیا جسے نفسیاتی تجزیہ (Psycho Analysis) کہا جاتا ہے۔ فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1۔ انسانی نفس، جبلی جذبات (Instinctive Emotions) کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ حیوانی جذبات آزاد مظاہرہ کے متقاضی ہیں لیکن اخلاق اور تہذیب کی مصلحتیں ان پر قیود اور پابندیاں عائد کرنا چاہتی ہیں۔ ان غیر فطری پابندیوں کے تحت دبے ہوئے جذبات ذہن انسانی میں گھٹن پیدا کرتے اور بغاوت پر مائل ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تحت الشعور میں یہی غیر صحتمند کشمکش نفسیاتی بیماریوں اور الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔

2۔ فرائیڈ کے بیان کے مطابق انسانی ذہن تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک شعور (Conscious)، دوسرا تحت الشعور (Sub Conscious) اور تیسرا لاشعور (Unconscious)۔ شعور کے حصہ میں خارج سے تمام مشاہدات وصول ہوتے اور تحت الشعور کے ذریعہ لاشعور میں جا کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ تمام جذبات لاشعور میں موجود رہتے ہیں اور تحت الشعور کے راستے شعور تک ابھر آنا چاہتے ہیں۔ لیکن تحت الشعور میں عقل و تہذیب کا محتسب نگران موجود ہے وہ نامناسب جذبات کو شعور تک ابھر آنے سے روکتا اور

واپس لاشعور کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اس طرح جذبات کا طوفان لاشعور میں ہی غیر شعوری طور پر متلاطم رہتا ہے۔

3۔ نیند میں شعور نفس خوابیدہ ہوتا ہے۔ تحت الشعور کا محتسب غافل ہوتا ہے اور لاشعور میں مدفون جذبات کو کسی قدر آزادی کا موقعہ ملتا ہے۔ اس لیے وہ خواب میں اپنا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ فرائیڈ کے نزدیک تمام خواب، امنگوں اور آرزوؤں کا مظاہرہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ نفسیاتی اور غیر آسودہ خواہشات کی تمثیلی شکلیں۔

4۔ فرائیڈ نے بتلایا کہ **انسان کے تمام جذبات صرف ایک بنیادی جذبہ سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ سب اسی ایک جذبہ کی ہی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ وہ بنیادی جذبہ، شہوت جنسی کا جذبہ ہے۔ محبت، نفرت، غضب، خوف، ایثار، امید وغیرہ وغیرہ تمام جذبات، جنسی شہوت ہی کے مظاہر ہیں۔** اور یہ تمام ذیلی جذبات موروثی نہیں ہوتے۔ صرف جذبۂ شہوت ہی موروثی جذبہ ہے۔ باقی جذبات بچہ کی نشوونما کے دوران اسی جذبۂ شہوت اور ماحول کے ردعمل سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔

5۔ فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق بچہ پیدائش سے قبل ہی جذبہ شہوت جنسی سے سرشار ہوتا ہے۔ پیدائش کے بعد اسی جذبہ کے تحت وہ اپنی ماں کی طرف راغب ہوتا ہے اور ماں کے ساتھ ناجائز جنسی تعلق (Incest) استوار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ ابھی وہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے رفتہ رفتہ شہوت کا جذبہ ماں کی محبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ادھر بچہ باپ کو اپنا رقیب دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ یوں غصہ اور نفرت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ معصوم بچہ کے متعلق اس تمام شہوانی داستان کا مجموعی نام فرائیڈ نے ایڈی پس کمپلیکس (Oedipus Complex) رکھا ہے۔ (114) بچی کی داستان شہوت بیان کرتے ہوئے فرائیڈ نے بتلایا کہ معصوم بچی اپنے آپ کو قدرتی طور پر خصی شدہ (castrated) پا کر ماں سے نفرت کرنے لگتی ہے کہ اس نے اسے ایسا عیب دار کیوں پیدا کیا۔ پھر وہ اپنے باپ سے ویسے ہی ناجائز تعلقات قائم کرنے کی آرزو میں باپ کی گود میں سکون حاصل کرنے لگتی ہے۔

بیٹے کو ماں اور بیٹی کو باپ سے متہم کرنے کا انکشاف فرائیڈ کی اہم تحقیقی دریافت (Discovery) کہلاتی ہے۔ اس کے بیان سے فرائیڈ کا مقصد یہ واضح کرتا تھا کہ انسان حیوان سے بھی بدتر حیوان (Brute,Beast) ہے۔ عفت، پاکیزگی اور اخلاقی قدریں،

محض چند مخصوص افراد کی انفرادی خیال آرائیاں ہیں جنہیں عام فطرتِ انسانی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

6۔ فرائیڈ کے نظریات کے مطابق تمام اعلیٰ اقدار، ایثار و قربانی کے قابل احترام جذبات، ثقافت و کلچر کے بلند معیار اور مذہبی نظریات و عقائد سب سفلی شہوانی جذبہ جنسی ہی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔(115)

یہ ہے مختصر خلاصہ ان نفسیاتی نظریات کا جو فرائیڈ نے پیش کیے اور جنہیں پروفیسر ولیم بیک نے مذکورہ بالا حوالہ میں ''سائنسی نتائج'' اور جن کے خلاف احتجاج کو 'واویلا' قرار دیا ہے۔ ان نظریات نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے ساتھ مل کر لادینی اور مادہ پرستی کے رجحان کو پوری تقویت بخشی۔ مذہبی عقائد کو توہم پرستی بتلایا اور انسانیت کے اعلیٰ منزل مقصود کے خیال کو خام قرار دیا۔ ڈارون کے نظریات نے انسان کی روحانی اقدار کو مجروح کیا اور فرائیڈ کے نظریات نے اخلاق حمیدہ پر تیر چلایا۔ تو کارل مارکس نے سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کو ہوا دی۔ اب ہم مذکورہ موصوف کے تعارف اور نظریات کو پیش کرتے ہیں۔

کارل مارکس (1818-1883)

کارل مارکس ایک جرمن نژاد یہودی تھا جس نے صنعتی میدان میں سرمایہ دار اور مزدور کی روز افزوں کشمکش کے مطالعہ کے بعد ''سرمایہ'' (Das Capital) کے نام سے تین جلدوں میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ''ترقی پذیر تمدن کے مشینی دور نے پیداوار کے ارزاں میکانی طریقوں سے ایک طرف سرمایہ کے ارتکاز کو تقویت دی تو دوسری طرف گھریلو صنعت کو تباہ کر کے بیروزگار کاریگروں کی جمعیت کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ سرمایہ داروں کے کارخانوں میں روزانہ اجرت پر مزدوری کیا کریں۔ جہاں انہیں پوری اجرت نہیں مل سکتی۔ سرمایہ دار، ان کے حق الخدمت کا بڑا حصہ خود دبا لیتے ہیں اور ان کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن مزدور اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کو بھی پورا نہیں کر پاتے مذہبی تعلیم ایک طرف تو افیون کا کردار ادا کر کے لوگوں کو مدہوش رکھتی ہے دوسری طرف مذہب کے اجارہ دار سرمایہ داروں کے کارندے بن کر الٹا مزدوروں ہی کو صبر و شکر کی تلقین کرتے اور طبقاتی جدوجہد سے باز رکھتے ہیں۔ اس طبقاتی تضاد کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک نہ ایک دن مزدور متحد ہو کر نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹ دیں گے

اور ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالیں گے جس میں سرمایہ داری کے دوبارہ جنم لینے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ مارکس نے بتلایا کہ ارتقاء معیشت کا فطری قانون یہی ہے کہ بام عروج پر پہنچ کر سرمایہ داری خود ہی اپنی موت کا سامان پیدا کرے۔

مارکس اور اس کے ساتھی انجلز نے اس انقلابی خیال کی مسلسل اشاعت کی اور مزدوروں کو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عملی طور پر منظم کرنے کے لیے 1874ء میں پہلی کیمونسٹ لیگ (Communist League) کی بنیاد رکھی اور اس کا دستور العمل کیمونسٹ مینی فیسٹو (Communist Manifesto) جاری کیا جس میں بتلایا کہ:

''ہم طبقات اور طبقاتی مخاصمتوں سے لبریز قدیم بورژوائی معاشرہ کی جگہ ایک ایسا معاشرہ قائم کریں گے جس میں ہر فرد واحد کی انفرادی آزادانہ نشوونما پورے معاشرے کی ترقی کی اولین شرط ہوگی'' (116)

کارل مارکس کی تحریک نے مختلف مقامات پر مختلف اثرات پیدا کیے۔ کہیں مزدوروں نے متحد ہوکر اپنے حقوق طلب کرنے کے لیے ٹریڈیونین (Trade Union) بنالیں، کہیں سرمایہ داروں نے مزدوروں کو مراعات دینے میں ہی اپنی عافیت دیکھی اور کہیں لوگوں نے مارکس کے پیغام کے بنیادی اصول کو ہی مضبوطی سے پکڑا کہ نظام سرمایہ داری کا خاتمہ ہی سرمایہ دار اور مزدوروں کی جنگ کا واحد علاج ہے۔ مؤخر الذکر خیال کے حامیوں نے مختلف ممالک میں مارکسسٹ (Marxist) پارٹیاں بنا بنا کر مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف برسرپیکار کردیا اور اس کشمکش کے ذریعہ ایک معاشی انقلاب کا خواب دیکھنے لگے۔

روس میں لینن (Lenin Vladimir Ilyich 1870-1924) نے مارکس کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا اور ان نظریات کی ترمیم شدہ شکل کا نام مارکسزم لنن ازم (Marxism-Leninism) رکھا گیا۔ یہی عرف عام میں سوشلزم، کمیونزم یا اشتمالیت، اشتراکیت کہلاتی ہے۔ اشتراکیت تین اجزاء ترکیبی پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم رشتہ میں مربوط ہیں۔ اول لادینی مادہ پرستی کا نظریہ حیات، دوم سوشلزم کا لائحہ عمل اور سوم کیمونسٹ جنت ارضی کی منزل مقصود (یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ روس (USSR) میں کیمونسٹ انقلاب کے ایک صدی سے بھی کم عرصے میں اشتراکیت بری طرح ناکام ہوگئی اور گزشتہ

صدی کی نوے کی دہائی میں روس سے اس کا جنازہ نکل گیا۔لینن کے مجسمے کو ماسکو کے چوک میں گلے میں رسی ڈال گھسیٹا گیا،روس کے ٹکڑے ہو گئے اور اشتراکیت کو ماسکو کی گلیوں میں بھی پناہ نہ مل سکی)۔(117)

ڈارون،فرائیڈ اور مارکس کی یہی تعلیمات ہیں جو مغربی نظریہ حیات اور جدیدیت کے بنیادی پتھر ہیں جن پر لادینی مادہ پرست مدنیت کی عمارت استوار کی گئی ہے اور مغربی تہذہب کا سرچشمہ ہے۔اسے روشن خیالی (Enlightenment) اور نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام بھی دیے گیے اور بڑی طاقتوں کی پشت پناہی سے روشن خیالی کا منصوبہ ایک عالمی منصوبہ بن گیا۔

چنانچہ ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ممالک کا واحد نصب العین "تیسری دنیا میں **روایت پسندی سے مقابلہ کرنا اور جدیدیت کو فروغ دینا**" قرار پایا۔آزادی، جمہوریت، مساوات مرد و زن، **سائنسی طرز فکر، سیکولرزم وغیرہ جیسی قدروں کو دنیا بھر میں عام کرنے کی کوششیں کی گئیں**۔معاشی فکر کے معاملے میں مغرب سرمایہ دارانہ اور کیمونسٹ دھڑوں میں ضرور منقسم رہا،لیکن سیاسی، سماجی اور نظریاتی طور پر جدیدیت کے افکار بالاتفاق جدید مغرب کے رہنما افکار بنے رہے۔جن کی دنیا بھر میں اشاعت اور نفاذ کے لیے ترسیل و اشاعت کے علاوہ ترغیب و تنفیذ کے تمام جائز و ناجائز طریقے اختیار کیے گئے۔تیسری دنیا میں ایسے پٹھو حکمرانوں کو بٹھایا گیا جو عوام کی مرضی کے خلاف زبردستی ترقی کے جدید ماڈل ان کے سر تھوپنے پر مامور رہے۔اسلامی دنیا میں خصوصاً اسلامی تہذیبی روایات کی بیخ کنی کو جدیدیت کا اہم ہدف سمجھا گیا۔ترکی، الجزائر، تیونس اور سابق سویت یونین میں شامل وسط ایشیا کے علاقوں میں مذہبی روایات سے مقابلے کیلئے ایک سخت ظالمانہ اور استبدادی نظام قائم کیا گیا۔

حاصل بحث

دنیا پر اس وقت مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ ہے اور مغرب اپنی تہذیب کی عالمگیریت کے لیے ہر ممکن طریقے سے کوشاں ہے۔مغرب کے تہذیبی ارتقاء کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی تہذیب و فکر کے ڈانڈے یونان و روما کی تہذیبوں سے جا ملتے ہیں۔مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں

تو ترقی کر رہا ہے لیکن فکر وعقائد کے لحاظ سے اس کا سفر معکوس سمت میں جاری ہے۔ تہذیب جدید کو محمد قطبؒ جاہلیتِ جدیدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب نے یونانی تہذیب سے ورثہ میں جو چیزیں پائیں ہیں وہ ہیں بت پرستی، مادیت پرستی، لذت پرستی اور عقلیت پرستی وغیرہ۔ رومی تہذیب سے دنیاوی اور ظاہری امور پر توجہ، فنون لطیفہ، شاعری، موسیقی، مذہب سے بے رغبتی اور شہوانیت وغیرہ کے نظریات وراثت میں پائے

پھر مسیحیت اور کلیسا کا دور آیا تو مسیحیت بھی ڈاکٹر ڈریپر کے الفاظ میں ''سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت رومۃ الکبریٰ نے دنیا کیلئے چھوڑا۔ مسیحیت کی تعلیمات بھی بہت جلد آلودہ ہوگئیں اور مغرب کی بدقسمتی ہے کہ بت پرست رومنوں نے دین مسیح کا حلیہ بگاڑ دیا۔ بت پرست رومنوں نے شرک کی آمیزش کی تو غالی اور دنیا دار عیسائی راہبوں نے مذہب کو چیستاں اور ناقابل عمل بنا دیا۔ رہبانیت کے نام پر وہ غلاظت اور ریاضت مذہب میں داخل کر دی کہ لوگ مذہب کے نام سے ڈرنے لگے۔ عقل دشمن کلیسا نے پہلے تو کتبِ مقدسہ میں ردوبدل کیا پھر عالمانِ وقت اور سائنسدانوں کو وحشیانہ اور عبرت ناک سزائیں دیں جس کی وجہ سے عقل اور مذہب میں ٹھن گئی اور سائنسی علم نے مذہبی تعلیمات کی تغلیط کرنا شروع کر دی۔

مذہب وسائنس کی اس معرکہ آرائی میں آخری فتح سائنس وعقل کی ہوئی اور مذہب/عیسائیت کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کا مسلمانوں سے تصادم اور پھر بعد میں تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ سپین اور سسلی کے راستے فرانس اور بعد میں یورپ کے دیگر ممالک میں اسلامی سائنس اور یونانی فلسفہ پہنچ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یورپ انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے اور دسویں صدی کے بعد نشاہ ثانیہ یعنی یورپ میں عقلی بیداری کی تحریک شروع ہو جاتی ہے۔ یورپ مشرق کے قریب آ جاتا ہے اور اس کے علوم سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ بعد میں ارسطو یونانی زبان میں بھی یورپ کو دستیاب ہو جاتا ہے اور مذہب بے زاری کی تحریک شروع ہو جاتی ہے۔ اس ردعمل کے طور پر کلاسیکی یعنی یونانی ورومی افکار واقدار اپنانے کا سیلاب اٹھتا ہے جو مذہبی اقدار واخلاقیات کو بہا لے جاتا ہے۔ پندرویں صدی کے علما یونان وروم کی تہذیب کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

عقلیت پرستی کے زیر اثر مدرسیت کی تحریک برپا ہوئی جس کا مقصد ارسطوئی منطق اور جدید علوم وفلسفہ کی بنیاد پر آرتھوڈوکس عیسائی افکار کی حقانیت کو ثابت کرنا تھا۔ اس تحریک کے نتیجہ میں پیرس، بولوگنا، آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد ہیومنزم کی تحریک برپا ہوئی۔ یہ چند بے دین اور مذہب بے زار علما کی تحریک تھی جس کا مقصد انسانی وجود کی عظمت کا ثبوت اور انسانی عقل وشعور کو بلند مقام پر فائز کرنا تھا۔ اس تحریک نے مذہبی/مسیحی نظریات کی زنجیریں توڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔

رومن کیتھولک پادریوں کی دولت پرستی اور کلیسا کے مذہبی جبر کے خلاف مارٹن لوتھر نے تحریک اصلاح دین شروع کی جس کا مقصد الہامی متون کی تشریح کا حق ہر شخص کو ہے نہ کہ محض کلیسا کو، یعنی ہر شخص کو اجتہاد کے مرتبے پر بٹھا دیا گیا اور لوتھر نے یہ دعویٰ کیا کہ دینی معاملات میں پوپ کا مکمل اقتدار غلط ہے اور ہر انسان انجیل سے براہ راست ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ اصل میں اس کے پیچھے بھی عقلیت اور ہیومنزم کے اثرات کارفرما تھے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس میں بظاہر تو بادشاہت کا خاتمہ کر کے جمہوری حکومت قائم کی گئی مگر اس انقلاب کے پیچھے جمہوریت، آزادی اور مساوات کے اصول کارفرما تھے۔

انیسویں صدی میں زور وشور سے برپا ہونے والی تحریک، جدیدیت ہے۔ جدیدیت کے آغاز میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ مسیحی عقاید کو سائنس اور عقل سے ہم آہنگ کیا جائے یعنی ابھی مذہب سے محبت کی چنگاری خاکستر میں دبی ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں سائنس کی اجارہ داری قائم ہو گئی اور یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا کہ حقائق کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمہ کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کہیں اس کا وجود ہے۔ صرف وہی حقائق قابل اعتبار ہیں جو عقل، تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پورے اتریں۔ جدیدیت کے حامی فلسفیوں نے مابعد الطبیعیات اور مذہبی مزعومات کو اسی لیے رد کر دیا کہ وہ ان کسوٹیوں پر پورے نہیں اترتے۔

جدیدیت کی تحریک نے قوم پرستی، افادیت پرستی، نسائیت، انسان کی کامل آزادی، مذہب کا رد وغیرہ کے نظریات کو عام کیا۔

چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مغرب نے آزادی، جمہوریت، مساوات مرد وزن،

سائنسی طرز فکر اور سیکولرزم وغیرہ جیسی قدروں کو دنیا میں عام کرنے کیلیئے بے دریغ وسائل استعمال کیے۔ اس استبداد کے نتیجے میں مغرب میں ہی ایک فکری تحریک برپا ہوئی جس کا فی الحال نام پوسٹ ماڈرنزم تجویز ہوا ہے۔

حواشی (باب اول)

(1) محمد قطب، جاهلية القرن العشرين (جدید جاہلیت ترجمہ از: ساجد الرحمٰن صدیقی)، البدر پبلی کیشنز لاہور، 1980ء، ص 28

(2) ایضاً، ص 29

(3) خورشید احمد پروفیسر، سوشلزم یا اسلام، مکتبہ چراغ راہ کراچی س ن ص 21

(4) ان اصطلاحات کا مناسب اردو مترادف مجھے نہیں مل سکا اور میری تمنا ہے کہ ہماری قوم اس لعنت اور اردو لغات اس لفظ سے محفوظ رہے۔

(5) نعیم احمد، پروفیسر ڈاکٹر، فلسفے کی ماہیت، ادارۂ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، مئی 1997ء، ص 33

(6) حسن عسکری پروفیسر، جدیدیت، ادارہ فروغ اسلام لاہور، 1997ء، ص 20

(7) ندوی سید ابوالحسن علی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين (ترجمہ از مصنف: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی س ن ص 235

(8) سی اے قادر، تاریخ سائنس، ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور بحوالہ Legacy of Greece

1983ء،ص15

(9) حسن عسکری، جدیدیت، ایضاً ص22

(10) نعیم احمد، پروفیسر ڈاکٹر، فلسفے کی ماہیت، ایضاً ص11

(11) The Hutchinson, Dictionary of Ideas, Helicon Publishing Ltd. Oxford 1994, p.427

(12) جارج سارٹن، قدیم علوم اور جدید تہذیب، دارالشعور لاہور 2005ء، ص 62

(13) George Sarton, Introduction to the History of Science (اردو ترجمہ مقدمہ تاریخ سائنس از سید نذیر نیازی) مجلس ترقی ادب لاہور، 1968ء، ص 127

(14) محمد قطب، جاهلية القران العشرين (جدید جاہلیت) ایضاً، ص32

(15) Draper, Dr. John William, A History of the conflict Between Religion and Science, Al Faisal Nashran (اردو ترجمہ: مولانا ظفر علی خاں) Lahore, 2004, p.98

(16) ندوی، سید ابوالحسن علی، ماذ خسر العالم بانحطاط المسلمین ایضاً، ص236

(17) حسن عسکری، جدیدیت، ایضاً، ص26

(18) ندوی، سید ابوالحسن علی، ایضاً، ص237

(19) افتخار حسین، ڈاکٹر آغا، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب لاہور، 1999ء، ص4

(20) ایضاً۔ ص11

(21) تاریخ اخلاق یورپ، ص127 بحوالہ ندوی، سید ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ایضاً، ص245

(22) ایضاً

(23) ایضاً

(24) Draper, Dr. John William, A History of the Conflict Between Religion and Science. Ibid, p.134

(25) انجیل کے معنی خوشخبری ہیں یہ نام غالباً کتاب مقدس کو اس لیے دیا گیا تھا کہ حضرت مسیح لوگوں کو آسمانی بادشاہت کے قریب آنے کی خوشخبری دیا کرتے تھے۔

(26) آل عمران: ۵۰

(27) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکہ مذہب وسائنس، ایضاً، ص132

(28) مقالہ نگار سینٹ ہلینا کا تعارف ان الفاظ میں کرواتا ہے:

Helicon Encyclopaedic Dictionary of Ideas: Helena, St (c.248-328) Roman Empress, mother of constantine the Great, and a convert to Christianity. According to legend, she discovered the true cross of Jesus in Jerusalem. Her feast day is 18 Aug. (p.240)

(29) جارج سارٹن، قدیم علوم اور جدید تہذیب، ایضاً، ص148

(30) Helicon Encyclopaedic Dictionary of Ideas, Helicon Publishing Ltd. Oxford 1994, p119.

(31) ڈریپر، ڈاکٹر جان، ولیم، معرکۂ مذہب وسائنس، ایضاً، ص144

(32) ایضاً، ص147

(33) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1981ء، ج5، ص328

(34) سورہ الحدید:27

(35) ابن کثیر، ابوالفداء عمادالدین، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)، مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2003ء، ج5، ص335

(36) جصاص، امام ابوبکر احمد بن علی الرازی الحنفیؒ، احکام القرآن بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد 1999ء، ج6، ص496

(37) کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن، مکتبۃ السلام لاہور 2003ء، ج6، ص384

(38) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکۂ مذہب وسائنس، ایضاً، ص271

(39) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ایضاً، ج5، ص325-333

(40) التوبہ:۳۴

(41) افتخار حسین، آغا، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، ایضاً، ص17

(42) ندوی، سید ابوالحسن علی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ایضاً، ص261

(43) البقرہ:79

(44) بوکائیے، موریس The Bible, The Quran and the Science (اردو ترجمہ: بائبل، قرآن اور سائنس، ثناء الحق صدیقی)، وقاص پبلشرز، سیالکوٹ، 2000ء، ص8

(45) The Hutchinson Dictionary of Ideas, Ibid, p269.

(46) Editor crownther, Jonathan, Oxford Advanced Learner's Dictionary Oxford university Press 1998, p615.

(47) ندوی، سید ابوالحسن علی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ایضاً، ص265

(48) ڈریپر، ڈاکٹر جان، ولیم، معرکۂ مذہب وسائنس ایضاً، ص288-89

(49) یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یورپی ممالک میں ہر قسم کی دستاویزات (Documents) میں ولدیت کا خانہ (Column) ختم کر دیا گیا ہے۔ اگر انتہائی ناگزیر ہو تو ولدیت کے خانے میں ماں کا نام لکھا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اکثر بچوں کو والد کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ مغرب میں کسی سے اس کے باپ کا نام پوچھنا offensive ہو سکتا ہے۔ یہ بھی مابعد جدیدیت کا ایک مظہر (Phenomenon) ہے۔ پچھلے دنوں مجھے Glosgow University سے Ph.D کا Admission Letter ملا تو اس میں صرف میرا نام تھا۔ ولدیت کا خانہ نہیں تھا، اسی طرح مغربی ممالک کی درجن بھر یونیورسٹیوں کے داخلہ فارم پر کیے اور کسی فارم میں ولدیت کا کالم نہیں تھا۔

(50) Russel, Bertrand, The Scientific Outlook, (اردو ترجمہ، سائنسی نقطہ نظر از نعیم احمد) Urdu Science Board Lahore 2003, p25-27 یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ پچھلے برسوں میں کلیسا نے گلیلیو کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے اس کی قبر پر جا کر معافی مانگی (دیباچہ، کتاب مذکور)

(51) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکۂ مذہب و سائنس، ایضاً، ص433

(52) جارج سارٹن، قدیم علوم اور جدید تہذیب، ایضاً، ص154

و ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکۂ مذہب و سائنس، ایضاً، ص152

(53) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، ایضاً، ص88

(54) Encyclopaedia Britanica, p.1019

(55) The Hutchinson Dictionary of Ideas, Ibid, p.443

(56) یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مقدس شہر کا نام مسلم تاریخ نویسوں اور جغرافیہ دانوں کے نزدیک بیت المقدس ہی ہے، نبی کریمؐ نے ہرقل (قیصر روم) کو جو خط لکھا تھا اس میں اسے 'ایلیا' کہا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فتح کے موقع پر جو امان نامہ تیار کروایا تھا اس میں بھی اسے 'ایلیا' ہی لکھا گیا ہے۔ بعد میں یہودی، نصرانی لٹریچر میں اسے یروشلم (Jerusalem) لکھا جانے لگا اور مسلمانوں میں بھی یہی نام رواج پا گیا۔ بہر حال، ہمیں اپنی تاریخ اور اسلوب کو نہیں بھولنا چاہیے اور شہر کو 'بیت المقدس' ہی لکھنا چاہیے۔

(57) Cuddon, J.A., The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, Penguin Books, 1992, p.837.

(58) The Hutchinson Dictionary of Ideas, Ibid, p.467.

(59) ابن رشد مسلم/عرب فلسفی جس نے مادہ کے ازلی ہونے اور فنائے روح کے دلائل مہیا کیے اس کی فلسفیانہ تحریریں ارسطو کی تحریروں کی تفاسیر اور افلاطون کی جمہوریہ (Republic) کی شرح پر مشتمل ہیں، لاطینی تراجم کے ذریعہ مغرب ابن رشد کی فکر سے آشنا ہوا۔ نشاۃ ثانیہ میں اس کی تحریروں نے یہودی، عیسائی علماء کو شدید متاثر کیا اس نے یونانی اور اسلامی فکر (Thought) میں مطابقت، فلسفیانہ اور عقلی بنیادوں پر مہیا کی۔ سینٹ تھامس اکوئیناس (St. Thomas Aquinas) نے ابن رشد کے خلاف دلائل مہیا کیے

اور اس کی پوزیشن کو چیلنج کیا۔ لیکن کئی صدیاں بعد بھی فلسفہ ابن رشد (Averroism) پیرس اور دیگر یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا رہا۔

(60) John Hay, Castilian Days, p.289 بحوالہ سی اے قادر، تاریخ سائنس، ایضاً ص 54

(61) یوکلڈ (Euclid) یونانی ریاضی دان، جو سکندریہ میں رہتا تھا اس نے ریاضی اور جیومیٹری پر 13 کتب لکھی تھیں جن میں سے 9 کتب مستوی جیومیٹری سے متعلق ہیں۔ یوکلڈ کی جیومیٹری تقریباً دو ہزار سال تک استعمال ہوتی رہی۔

(62) بطلیموس (Ptolemy): مصری ماہر فلکیات (ہیئت دان) اور جغرافیہ دان جس نے سکندریہ میں کام کیا، اس نے اپنی کتاب المجسطی میں یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین مرکز کائنات ہے اور سورج، چاند، ستارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ حتی کہ 1543ء میں پولینڈ کے سائنس دان کوپرنیکس نے اس کے برعکس نظریہ پیش کیا۔ بطلیموس کی المجسطی سولہویں صدی عیسوی تک معتبر آخذ علم (Standard Source) رہی۔

(63) لیونارڈو (Leonardo) اطالوی نژاد مصور، سنگتراش، ماہر تعمیرات، مہندس اور سائنسدان۔ اطالوی نشاۃ ثانیہ کی عظیم ہستی، وہ فلورنس (Florence) اور میلان (Milan) میں سرگرم عمل رہا بعد ازاں 1516ء میں فرانس چلا گیا جب وہ واپس میلان آیا تو اپنا شاہکار مونالیزا (Monalisa) Paint کیا۔

(64) سینٹ البرٹس میگنس (St. Albertus Magnus): مسیحی الٰہیات (Theology) کا جرمن سکالر تھا۔ فلسفہ (خصوصاً ارسطو کی فلاسفی) نیچرل سائنسز، کیمیا اور فزکس میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ بولوگنا اور پاڑوا میں پڑھا۔ کولون (Cologne) اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے۔ سینٹ تھامس اکونیا اس کا شاگرد تھا۔

(65) سینٹ تھامس اکونیاس (Aquinas St. Thomas) اطالوی فلسفی اور مسیحی الٰہیات کا ماہر، مدرسیت کی سب سے نمایاں شخصیت۔ 1879ء میں اس کی تعلیمات کو کیتھولک الٰہیات کی بنیاد پر قرار دیا گیا۔ اس کی کتاب Summa Contra Gentiles/Against the error of the Infidels عقل اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ تھامس کی فلاسفی کو تھامسزم کہا جاتا ہے۔

(66) راجر بیکن (Roger Bacon) انگریز فلسفی اور سائنسدان آکسفورڈ یونیورسٹی میں استاد تھا۔ وہ کیمیا، حیاتیات، جادو اور طبیعات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بہت سی ایجادات اس کی مرہون منت ہیں جن میں مکبر عدسے (Magnifying Lens) بھی ہیں اس نے بارود، مشینی کاروں، دخانی کشتیوں اور ہوائی جہازوں کی پیشین گوئی کر دی تھی اگرچہ بارود کا فارمولا عرب مسلمانوں کے توسط سے اسے معلوم ہوا۔

(67) محمد بن موسیٰ الخوارزمی: مسلمان، ایرانی ریاضی دان خوارزمہ (اب خیوہ، ازبکستان) میں پیدا ہوئے، بغداد میں زندگی گزاری، اس نے الجبراء پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے عنوان الجبراء سے انگریزی اصطلاح

algebra وجود میں آئی۔ اس کتاب کی مدد سے مغرب عربی اسلامی اعداد (Decimals) 1,2,3,4, سے متعارف ہوا۔ لاگرتھم انگریزی میں Algorithm اسی کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے،اس نے فلکیاتی جداول تیار کیے، عربوں اور بعدازاں مغرب کے توسط سے ساری دنیا کو زیرو صفر (0) کا تصور بھی اسی نے دیا۔

(68) ڈانٹے الیگیری (Dante Alighieri) اطالوی شاعر اس کی شاہکار La Divina Commedia / The Divine Comedy ایک رزمیہ نظم (epic) ہے جس میں وہ اپنے سفر کو تین حصوں میں بیان کرتا ہے۔ پہلے جہنم کا سفر کرتا ہے۔ پھر اعراف (Purgatory) اور آخر میں فردوس میں داخل ہوتا ہے۔ دوران سفر شاعر ورجل (Virgil) اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ ڈانٹے فلورنس میں پیدا ہوا۔ وہیں سیاست میں بھی حصہ لیا، اس کے مخالفین اقتدار میں آئے تو اسے پہلے جیل پھر موت کی سزا سنائی گئی اس کی عدم موجودگی میں فلورنس سے بھاگ نکلا، بقیہ زندگی جلاوطنی میں گزاری۔

(69) Encyclopedia Britanica p.1021

(70) Helicon Encyclopaedia Dictionary of Ideas. Abid. p.255

(71) ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) انگریزی زبان وادب کا باوا آدم اور نشاۃ ثانیہ کی نمایاں ترین شخصیت ہیومنزم کو پروان چڑھانے والا اور The comedy of errors, love's labour's lost. Romeo and Juliet, the Merchant of Venice, Julius Caesar, Hamlet, Othello. King Lear, Macbeth. Antony and Cleopatra etc. جیسے شاہکار اور لازوال ڈراموں کا خالق۔

(72) Shakespeare William, Hamlet, Cambridge University Press 2000, p.127

(73) Cuddon j.a., The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory Ibid p. 432.

(74) مارٹن لوتھر (Martin Luther) جرمن نژاد مسیحی کلیسا کا مصلح تحریک اصلاح دین کا روح رواں۔ تذکرۃ الغفران کا منکر اور مسیحی کلیسا کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والا۔ لوتھر آئی سل بن (Eisleben) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک کان کن تھا۔ ایرفرٹ (Erfurt) یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ بطور راہب آگسٹینین (Aufgustinian) خانقاہ میں تین سال رہا اور 1507 میں اسے پادری (Priest) بنا دیا گیا۔ پھر وٹن برگ یونیورسٹی میں بطور استاد پڑھاتا رہا۔ 31 اکتوبر 1517 کو وٹن برگ کے گرجا کے دروازے پر 95 سوال نصب کیے۔ اس کا مقصد پاپائی نظام کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ بعد میں رومن کیتھولک فرقہ کے ساتھ مسلسل حالت جنگ میں رہا۔ 1530 میں آگس برگ کے اعتراف (confession) میں وہ تبدیلی protestant قیادت سے دستبردار ہوگیا۔

(75) وٹن برگ (Witten berg) جرمنی کا ایک متوسط درجہ کا شہر ہے جو دریائے البب کے داہنے کنارے پر واقع ہے۔ 31 اکتوبر 1517 کو لوتھر نے اس شہر کے گرجا کے دروازے پر وہ مشہور استغاثہ کیلوں سے جڑ دیا، کے 95 مسائل نے مسیحی دنیا کو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دو فرقوں میں تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی۔ لوتھر اس گرجا میں دفن ہے۔ 1858 میں گرجا کے دروازے بدل دیئے گئے اور کانسی کے نئے دروازے لگائے گئے جن میں 95 مسائل کندہ ہیں۔

(76) ڈریپر، جان ولیم، معرکہ مذہب و سائنس، ایضاً، ص 326

(77) مولانا ظفر علی خاں، معرکہ مذہب و سائنس میں اس واقعہ کے تحت درج ذیل حاشیہ لکھتے ہیں:

"یہ قتل عام جو ڈیڑھ مہینے تک جاری رہا اور جس میں پچاس ہزار پروٹسٹنٹ مارے گئے 24 اگست 1502ء کی شام شروع ہوا جو ایک مسیحی بزرگ سینٹ برتھا لیمسو کے عرس کی تاریخ ہے۔ اس زمانہ میں چارلس نہم (Charles-IX) فرانس کا بادشاہ تھا لیکن حکومت کی باگ اصل میں اس کی ماں ملکہ کیتھرائن مڈیسی (Catherine Medici) کے ہاتھ میں تھی جو تعصب کی پتلی اور جور و بے عنوانی کی زندہ تصویر تھی۔ کیتھولک فریق نے ملکہ کی شہ پاکر یہ منصوبہ گانٹھا کہ پروٹسٹنٹوں کے سرداروں کو جمع کر کے قتل عام کیا جائے اور اس کے بعد ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ ملکہ کیتھرائن نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر تمام بڑے بڑے پروٹسٹنٹ امراء و اعیان کو دعوت دی، جب یہ سب پیرس میں جمع ہو گئے تو آدھی رات کے وقت شاہی محل سے گھنٹہ بجا اس کا مطلب تھا کہ قتل عام شروع ہو، چنانچہ کیتھولک تلواریں لے کر اٹھے اور جس پروٹسٹنٹ کو جہاں پایا ذبح کر دیا۔ یہ ہنگامہ پیرس تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مملکت فرانس میں جہاں جہاں پروٹسٹنٹ تھے لکڑی کی طرح کاٹ ڈالے گئے، پاپائے گریگوری سیزدہم اس وقت جلوہ افروز مسند قدس و عصمت تھے۔ اس قتل عام کی خبر جب آپ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا اور گرجا میں جا کر شکرانہ کی نماز پڑھی اور اس مبارک واقعہ کی یاد میں ایک تمغہ تیار کرایا جو مومنین پاک یعنی پروٹسٹنٹوں کے قاتلوں کو عطا فرمایا۔ (کتاب مذکور، ص 338)

(78) ڈریپر، جان ولیم، معرکہ مذہب و سائنس، ایضاً، ص 329

(79) پروکرسٹیز (Procrastaze): ایک یونانی ڈاکو تھا جو مسافر اس کے ہتھے چڑھ جاتا تھا اسے ایک فولادی پلنگ پر لٹا دیتا تھا اور بدنصیب مسافر کا قد اگر اس پلنگ سے چھوٹا ہوتا تھا تو اس کے جسم کو شکنجے میں یہاں تک کھینچتا تھا کہ وہ پلنگ کے برابر ہو جاتا تھا اور اگر بڑا ہوتا تھا تو اس بے چارے کی ٹانگیں اسی نسبت سے کاٹ ڈالتا تھا اسی لیے پروکرسٹیز کے پلنگ سے استعارتاً ناجائز زیادتی یا کمی مراد لی جانے لگی۔

(80) Webster's Encyclopaedic Unabridged Dictionory Edn. 1994

(81) رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes) فرانسیسی فلاسفر اور ریاضی دان۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ عام تسلیم شدہ

علم مشکوک ہوتا ہے۔وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ تمام مادی کائنات کو ریاضیاتی فزکس کی اصطلاحات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔کارتیسی کوآرڈی نیٹ (Cartesian Coordinates) اسی کی طرف منسوب ہیں۔ عدسیاتی سائنس،فلکیات اور جانوروں کے رویہ (Animal Behaviour) وغیرہ کے نظریات پیش کیے۔ٹورس (Tours) کے قریب پیدا ہوا۔فوج میں بھی خدمات سرانجام دیں۔یورپ میں سفر کے دوران ریاضیاتی Methods کو مابعد الطبعیات اور سائنس پر اطلاق کرنے کے بارے میں غور کرتا رہا۔مسیحی مذہبی جبر سے بچنے کے لیے ہالینڈ میں رہنے لگا اور سٹاک ہام (Stockholm) میں وفات پائی۔

(82) Descartes Rene, Discourse on method, Mcligen Inc.2001, p.432

(83) پاسکل (Blaise pascal) فرانسیسی فلاسفر اور ریاضی دان،فزکس اور ریاضی میں بہت سے نظریات پیش کیے۔

(84) Webster's ڈکشنری کے مطابق روشن خیالی/تحریک تنویر (Enlightenment):

"A philosophical movement of the 17th and 18th centuries characterized by belief in the power of human reason and by innovation in political religious and educational doctrine"

جبکہ Longman Contemporary English Dictionary میں اس طرح تعریف کی گئی ہے:

"A period in the 18th century when many writers and scientists believed that Science and Knowledge, not religion could improve people's lives."

Encyclopaedia Britannica کے مطابق خرد افروزی (Enlightement) کی وضاحت کچھ یوں ہے:

"A European intellectual movement of 17th and 18th centuries in which ideas concerning God, reason, nature and man were Sythesized into a world view that gained wide assent and that instigated revolutionary developments in art, philosophy and politics central to enlightenment thought Were the use and the celebration of reason the power by which man understands the universe and improves his own condition the goals of rational man were considered to be knowledge, freedom, and happiness" (Encyclopaedia Britannica 2003)

''عقلیت پرستی کی تحریک 17ویں اور 18ویں صدی کی دانشورانہ تحریک تھی جس میں الوہیت، عقلیت، فطرت اور اشرف المخلوقات سے متعلق نظریات کی تجزیاتی پرکھ کی گئی تھی۔ جس کی بنا پر یہ تحریک، فن وفلسفہ اور سیاسیات کے میدان میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس انقلاب کی تمام تر بنیاد عقل پر مبنی ہے۔ یہ تحریک زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ منطق و استدلال کی روشنی میں کرتی ہے۔ غرض اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عقلیت پسندی کا سہارا لیتے ہوئے کائنات میں علم، آزادی اور خوشی حاصل کی جائے۔''

روشن خیالی کی تحریک کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہالینڈ اور فرانس سے ہوا اور بعد میں یہ تحریک مغربی ممالک میں پھیل گئی۔

(85) لاالوہیت (Atheism)۔ The Hutchinson Dictioanry of Ideas کے مطابق:

"Atheism: non belief in or the positive denial of the existence of a God or gods."

''الحاد یا زندقہ خدا، یا معبودوں کے وجود کا انکار اور کسی عقیدے کا نہ ہونا۔''

(86) لاادریت (Agnosticism) مذکورہ بالا ڈکشنری کے مطابق:

"Belief that the existence of God cannot be proved: that in the nature of things the individual cannot know anything of what lies behind or beyond the world of natural phenomenon."

''یہ یقین کہ خدا کے وجود کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، فطری مظاہر کی دنیا میں کوئی فرد یہ نہیں جان سکتا کہ اشیا کی فطرت میں کیا پوشیدہ ہے یا ان مظاہر سے پرے کیا ہے؟''

(87) تجربیت (Empiricism)۔ Webster's Dictionary کے مطابق:

"Empiricism; in philosophy, the belief that all knowledge is ultimately derived from sense experience. It is Suspicious of metaphysical schemes based on 'a priori' propositions Which are claimed to be true irrespective of experience."

''فلسفہ میں تجربیت سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ ہر قسم کا علم آخرکار حواس کے تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ (تجربیت) مابعد الطبیعیاتی سچائیوں میں شک کرتی ہے جو بغیر تجربہ کے سچا ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔''

یعنی ایمپیریسزم کا مطلب یہ ہے کہ حق صرف وہ ہے جو تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو سکے اور جو عقل و دلیل کے مطابق ہو۔ یہ اصول مغرب میں سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد بنا اور مابعد الطبیعیات (مذہبی و اخلاقی اصولوں) کے رد کا باعث ٹھہرا، کیونکہ اس سے وحی، ایمان اور عقیدے

کی نفی ہوتی ہے۔

تجربیت ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں پروان چڑھی۔ جان لاک، جارج برکلے، اور ڈیوڈ ہیوم کی تحریروں نے اسے پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

(88) عدم عقلیت (Irrationalism) کے بارے میں The Hutchinson Dictionary of Ideas کہتی ہے:

"Irrationalism feature of many philosophies rather than a philosophical movement. Irrationalists deny that the world can be comprehended by conceptual thought and often see the human mind as determined by unconscious forces."

''عدم عقلیت کوئی فلسفیانہ تحریک نہیں بلکہ مختلف فلسفوں کا ملغوبہ ہے، عدم عقلیت کے علمبردار اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ محض تصوراتی خیال سے دنیا کو سمجھا جا سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اکثر انسانی ذہن لاشعوری قوتوں کے زیر اثر فیصلے کرتا ہے۔''

(89) وجودیت/وجودی فلسفہ (Existentialism) کے بارے میں The Penguin Dictionary of Literary Terms کہتی ہے:

"The term existentialism means pertaining to Existence. philosophically, it now applies a vision of the condition and existence of man, his place and function in the world and his relation-ship or lack of one with God."

''وجودیت کی اصطلاح کا مطلب ہے، وجود کے متعلق۔ فلسفیانہ طور پر اب اس کا اطلاق ہوتا ہے، حالت کے احساس کے بارے میں اور انسان کا دنیا میں مقام کیا ہے اور مقصد وجود کیا ہے؟ خدا سے اس کے تعلق کے بارے میں یا تعلق نہ ہونے کے بارے میں۔''

اس کی ابتدا عموماً ڈنمارک کے فلسفی کیر کے گارڈ (Kierkegard) سے سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے اہم نام مارٹن ہائیڈگر (Martin Heidegger) اور جین پال سارتر (Jean-Paul Sartre) ہیں۔

(90) ارسطو (Aristotle) یونانی فلسفی جس نے عقل اور استدلال کی وکالت کی۔ اس نے منطق کے باضابطہ (Systematic) مطالعہ کا آغاز کیا۔ اس کی کتاب Ethics معیار تسلیم کی جاتی ہے۔ اس نے سیاسیات، مابعد الطبیعیات فزکس، فلکیات، حیاتیات، نفسیات اور ادبی تنقید وغیرہ میں اہم نظریات پیش کیے۔ ارسطو نے ہی یہ نظریہ پیش کیا کہ حصول علم کے لیے حسی تجربہ اور عقل دونوں ضروری ہیں۔ اسی نے سب سے پہلے کہا کہ انسان سماجی اور اخلاقی حیوان ہے لیکن حسب مراتب۔

ارسطو مقدونیہ کے نزدیک سٹیگرا (Stagira) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بادشاہ کا طبیب تھا 347-367 ق م میں اس نے ایتھنز میں افلاطون کی اکیڈمی میں شمولیت اختیار کی، بعد ازاں سکندر اعظم (342 ق م) کا اتالیق مقرر ہوا۔ سکندر کے بادشاہ بننے کے بعد ایتھنز میں اس نے اپنا مدرسہ (Lyceum) کھول لیا۔ سکندر کی وفات کے بعد اسے چلسز (Chalcis) فرار ہونے پر مجبور کیا گیا، جہاں اس کی وفات ہوگئی۔

(91) نپولین بونا پارٹ (Napoleon Bonopart) فرانس کا حکمران اور 1804ء سے 1815ء فرانسیسی فوجوں کا جنرل رہا۔ 1796 سے انقلابی جنگوں میں فوجوں کی کمان کی۔ 1799ء میں اس نے حکومت (Ruling Directory) سے اقتدار چھین لیا۔ 1803ء و مابعد اس نے اکثر یورپ کو فتح کر لیا۔ اور اپنے بھائیوں کو کٹھ پتلی حکمران مقرر کیا۔ 1812ء میں ماسکو سے پسپائی پر اسے جزیرہ ہلینا (St.Helena) میں جلاوطن کر دیا گیا۔

(92) Chambers 20th Century Dictionary, p.343

(93) حسن عسکری، جدیدیت، ایضاً، ص 57

(94) Chambers 20th Century Dictionary, .98

(95) Cuddon J.A., The Penguin Dictionryof Literary Terms and Literary Theory, Ibid. p.550

(96) سر فرانسیس بیکن: انگریز فلسفی، مضمون نگار اور سیاست دان فلسفہ سائنس کی ترویج میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ اس نے ارسطوئی اور افلاطونی سائنسی طریقہ کار پر شدید تنقید کی اور تجربی سائنس پر زور دیا۔ 1618ء میں اسے لارڈ چانسلر بنایا گیا اور اسی سال رشوت لینے پر اعتراف جرم کے بعد چالیس ہزار برطانوی پاؤنڈ جرمانہ کیا گیا۔ اس کی تصنیفات یہ ہیں:

Essays 1597, The Advancement of Learning 1605. The Novum Organum 1620,
The New Atlantis 1626.

مشہور مزاحیہ اور طنزیہ شاعر الیگزنڈر پوپ (Alexander Pope) نے بیکن کے بارے میں درج ذیل دلچسپ Remarks دیے ہیں:

"The wisest, brightest and meanest of mankind." (Alexander Pope, the Rape of the Lock, Oxford University Press 1996, p.17)

(97) تھامس ہوبز: انگریز فلسفی اور ارسطو کے بعد یہ پہلا شخص تھا جس نے نیچر (Nature) کے بارے میں جامع تھیوری کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے "مادہ اور حرکت" کی اصطلاحات میں ہر چیز بشمول انسانی رویہ، ہر چیز کا تجزیہ کیا۔ اس نے "معاہدہ عمرانی" (Social Contract) کی بنیاد پر انسان کی

absolute sovereignty کا تصور دیا۔

(98) تفصیل کے لیے دیکھئے:

Nasr Syed Hossein(1993), A young Muslim's Guide to the Modern World, Cambridge University Press, p.156.

(99) Routledge Encyclopaedia of Philosophy, Routledge, London, 1993, p.641

(100) Alain Touraine(1995), Critique of Modernity, Cambridge Blackwell, p.432.

(101) Routledge Encyclopaedia of Philosophy, Ibid. p.643

(102) Cornalia Klinger(2004), From Freedom without Choice to Choice without Freedom; The Trajectory of the Modern Subject, Blackwell Publishing Ltd., p.218

(103) والٹیر: فرانسیسی ادیب جس نے اپنے آپ کو رواداری، انصاف اور انسانیت پرستی کے نظریات کے پرچار کیلئے وقف کر دیا تھا۔ وہ ڈی ازم (Deism) پر یقین رکھتا تھا۔ ڈی ازم اگر چہ وجود عظیم (Supreme being) پر یقین رکھتی ہے۔ لیکن دراصل فطری مذہب (Religion of Nature) پر یقین رکھتی ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے اگر چہ خدا (Law of nature) کا منبع ہے لیکن دنیا کے معاملات سے اسے براہ راست کوئی سروکار نہیں، اور انسان کا مذہبی فریضہ محض یہ ہے کہ وہ نیکی کرے۔

(104) ہیگل: جرمن فلسفی اور متشکک جس نے شعور اور خارجی اشیاء کی وحدت اور ایک دوسرے کے بغیر عدم تکمیل کا تصور دیا۔ اس کے نزدیک ذہن اور فطرت ایک ناقابل تقسیم وحدت کے اجزاء ہیں۔ اس کا یقین تھا کہ ترقی کا انحصار (۱) جدلیاتی منطق (Dialectic)، (۲) دعویٰ (Thesis)، (۳) ردِ دعویٰ (Antithesi) Contradiction، اور (۴) حل ردِ دعویٰ (Synthesis) پر ہے۔

ہیگل اپنے فلسفہ جدلیت کی وجہ سے مشہور ہے۔ مذہب اور سرمایہ داری کے رد کے لیے کارل مارکس جیسے مفکرین نے ہیگل کے Dialectic ہی کا سہارا لیا تھا۔

(105) نطشے: جرمن فلسفی جس نے مسیحی اخلاقی اقدار کو رد کیا۔ اس نے دلائل دیے کہ 'خدا مر چکا ہے' (نعوذ باللہ) لہٰذا لوگ اپنی اقدار کی تخلیق کے لیے آزاد ہیں۔ اس کا آئیڈیل superman / ubermensch تھا جو کمزوروں اور نکموں پر اپنی مرضی زبردستی ٹھونس سکے۔ نطشے نے یہ لغو دعویٰ بھی کیا کہ علم کبھی خارجی / حقیقی نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ کسی غرض یا لاشعوری مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ (The Hutchinson Dic.)

(106) Novak Philip, (1996), The vision of Nietzsche, Element, Brisbane, pp.57,114

(107) برٹرینڈ رسل: انگریز فلسفی اور ریاضی دان جس نے جدید حسابی منطق کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا

کیا۔ سماجی ایشوز پر بھی اس نے کثرت سے لکھا۔ منکر خدا اور متشکک تھا۔ مذہب بیزاری کا کھل کر اظہار کرتا تھا۔ اس نے درج ذیل کتب تصنیف کیں:

i) Principia Mathematica, ii) The Problems of Philosophy, iii) A History of Western Philosophy,

آخری عمر میں Nuclear Disarmament اور امن پسندی کا پرچار کرتا رہا۔

Russell Bertrand, The scientific outlook (108)

(ترجمہ سائنسی نقطہ نگاہ، ڈاکٹر نعیم احمد، اردو سائنس بورڈ لاہور 2003 ص 87,73

(109) Cornalia Klinger, From Freedom without choice to choice without Freedom, The Trajectory of the Modern subject. Ibid, p.311

(110) Habermas Jurgen, (1987), The Philosophical Discourse of Modernity: Twelve Lectures (tr.Fredrick Lawrance), The MIT Press, p.198

(111) Williams Bech, Modern Science and the Nature of Life, p 35.

بحوالہ محمد اسماعیل سید، رسول عربیؐ اور عصر جدید، احمد پبلی کیشنز لاہور 2003 ص 176

(112) ڈارون کے نظریات کے لیے درج ذیل ذرائع (Sources) سے اخذ و استفادہ کیا گیا:

(i) Darwin Charles, (1996),The Origin of Species, Oxford University Press

(ii) William s Beck, (2001), Modern Science and the Nature of Life, The Penguin,

(iii) Isac Asimov,(1967),The Genetic Code,Paperboard,

(iv) www.darwinistsinmourning.com

(v) www.Wikipedia.org

(113) Jones Ernest, (2003), The Life and works of Sigmund Freud Imperials London, p.49

بحوالہ محمد اسماعیل سید، رسول عربیؐ اور عصر جدید، ایضاً ص 207

(114) ایڈی پس (Oedipus) یونانی دیومالا (Greek Mythology) کا ایک افسانوی کردار ہے۔ تھیبس (Thebes) کے بادشاہ لوئیس اور اس کی ملکہ جوکاسٹا کو نجومیوں نے بتلایا کہ ان کا پیدا ہونے والا بچہ اپنے باپ کو قتل کرے گا اور ماں سے شادی کرے گا۔ بادشاہ نے ملکہ کو حکم دیا کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی مروا ڈالے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی ممتا بچے کا قتل تو گوارہ نہ کر سکی البتہ اس نے بچے کو پہاڑ کی چوٹی پر پھینکوا دیا۔ یہی بچہ ایڈی پس کہلایا۔ اس کی پرورش ایک اور بادشاہ کے ہاں ہوئی۔ نوشتہ تقدیر کے مطابق

ایڈی پس نے بڑا ہو کر لڑائی میں ناواقفیت کے عالم میں اپنے باپ کو بھی قتل کیا اور اپنی ماں جوکاسٹا سے شادی بھی کی۔ لیکن جب ماں بیٹے کو حقیقت حال کا علم ہوا تو اس نادانستہ گناہ کی ندامت میں ایڈی پس نے خودکشی کرلی۔

(Sophocles, (1996), Oedipus Rex,Book Home Delhi)

(115) فرائیڈ کے نظریات درج ذیل ذرائع سے اخذ و ترجمہ کیے گئے:

(i) R.S.Wood worth, (1998) Psychology, Routledge London.

(ii) Jones Ernest, (2003), The Life and works of Sigmund Freud. Imperials UK.

(iii) Sigmund Freud. The Interpretation of Dreams www.durham.edu.uk.

(iv) شہزاد احمد، فرائیڈ کی نفسیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2006ء

(116) Soviet Socialist Democracy, Moscow, p.163

بحوالہ: محمد اسماعیل سید، رسول عربی اور عصر جدید، ایضاً، ص 241

(117) کارل مارکس کے نظریات کے لیے ہم نے درج ذیل ذرائع کی طرف رجوع کیا:

(i) Karl Marks, (1983), Das Capital, OUP

(اردو ترجمہ: سرمایہ از کامریڈ لال خاں، بک ہوم لاہور 2003)

(ii) Lenin. Selected Works, Moscow, 981

(iii) www.Wikipedia.org

باب دوم

فصل اول

مابعد جدیدیت۔۔۔ایک تعارف

مابعد جدیدیت، پس جدیدیت یا جدیدیت کے بعد اصل میں انگریزی اصطلاح Postmodernism کا اردو ترجمہ ہے۔ Postmodernism کو مختصر طور پر pomo بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح آج کے دور کا فلسفہ، ترقی یافتہ معاشروں کا عقیدہ، طرزِ زندگی، معاشرتی صورت حال اور نظریۂ حیات کا نام ہے۔ مابعد جدیدیت کا لفظی معنی ہے جدیدیت کی تحریک کے بعد، جبکہ جدیدیت بذاتِ خود ایسی شے کو کہتے ہیں جو دورِ حاضر یا لحہ موجود سے متعلق ہو! جدیدیت کی تحریک اور اس کے مابعد یا جدیدیت کے ردعمل (Reaction) کے طور پر برپا ہونے والی فکری تحریک یا معاشرتی رجحان (Tendency) کو مختلف انداز یا تناظر (Perspectives) میں بیان کیا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی اصطلاح عموماً تنقیدی نظریہ (Critical Theory) میں استعمال ہوتی ہے اور اس سے مراد ادب، ڈرامہ، فنِ تعمیر، سینما، ڈیزائن، مزید برآں مارکیٹنگ اور بزنس وغیرہ میں ترقی وارتقا کی سمت مراد لی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کی اختتامی دہائیوں میں یہ اصطلاح تاریخ، قانون، کلچر اور مذہب کی وضاحت (Interpretation) کیلئے بھی استعمال ہونے لگی۔ Wikipedia انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

"Postmodernism is used in critical theory to refer to a point of departure for works of literature drama,

architecture, cinema and design, as well as in marketing and business and in the interpretation of history, law, culture and religion in the late 20th century. Postmodernism is an aesthetic, literary, political or social philosophy, which was the basis of the attempt to describe a condition, or state of being, or something concerned with changes to institutions and conditions as postmodernity. In other words, postmodernism is the "cultural and intellectual phenomenon," especially since the 1920's new movements in the arts, while postmodernity focuses on social and political outworkings and innovations globally, especially since the 1960s in the west." (1)

یعنی مابعد جدیدیت ادب، آرکی ٹیکچر، ڈراما، سینما، ڈیزائن وغیرہ کے رجحان کی سمت ظاہر کرتی ہے۔ مزید برآں تاریخ، مارکیٹنگ، کاروبار، مذہب، قانون اور کلچر کی وضاحت کے لیے بھی مابعد جدیدیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ایسا بیسویں صدی کے اختتام سے ہونے لگا ہے۔ مابعد جدیدیت، جمالیاتی، ادبی، سیاسی اور سماجی فلسفۂ حیات کا نام بھی ہے۔

مابعد جدیدیت ایسی کوشش کا نام ہے جو حالت، وجود یا اداروں میں تبدیلی کو بیان کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت سماجی اور فکری مظہر ہے، جبکہ پوسٹ ماڈرنیٹی سماجی اور سیاسی کارہائے نمایاں اور بین الاقوامی ایجادات پر اپنی توجہ مرتکز کرتی ہے۔ The Compact Oxford English Dictionary کے مطابق:

Postmodernism: "a style and concept in the arts characterized by distrust of theories and ideologies and by the drawing of attention to conventions." (2)

یعنی مابعد جدیدیت ایسے تصور اور طرز زندگی کا نام ہے جو نظریات وعقائد پر بے یقینی (distrust) کی وجہ سے ممتاز ہے، جبکہ Merriam-Webster آن لائن ڈکشنری میں Postmodernism کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

"either of, relating to, or being an era after a modern one"

or "of, relating to, or being any of various movements in reaction to modernism that are typically characterized by a return to traditional materials and forms (as in architecture), of relating to, or being a theory that involves a radical reappraisal of modern assumptions about culture, identity, history, or language."(3)

یعنی ماڈرن دور کے متعلقہ یا بعد کا زمانہ، جدیدیت کے ردعمل میں (جنم لینے والی) تحریک۔

درج بالا تعریف کی رو سے قابل توجہ تقریباً یہی بات ہے۔ اسی اصطلاح کو The American Heritage Dictionary اس طرح بیان کرتی ہے:

"of or relating to art, architecture, literature that reacts against earlier modernist principles, as by reintroducing traditional or classical elements of style or by carrying modernist styles or practices to extremes." (4)

یعنی آرٹ، آرکی ٹیکچر یا ادب (کی تحریک) جو جدیدیت کے پرانے اصولوں کے خلاف ردعمل ظاہر کرتی ہے اور سٹائل کے روایتی یا کلاسیکل عناصر کو از سرنو پیش کرتی ہے۔ یا جدید انداز واطوار کو شدت سے پیش کرتی ہے۔

یہ اصطلاح، آرٹ، موسیقی، ادب اور سماجیات کی ان بہت سی تحریکات کیلئے استعمال ہوتی ہے جو جدیدیت کے ردعمل میں ظاہر ہوئیں۔ لہٰذا typically اس اصطلاح یا تحریک سے مراد Revival of traditional elements and techniques ہوتی ہے۔

The Hutchinson Dictionary of Ideas میں Postmodernism کا تعارف درج بالا تعریفات سے قدرے ہٹ کر دیا گیا ہے:

"Late 20th century movement in architecture and the arts that rejects the preoccupation of modernism with purity of form and technique. Post-modern designers and architects use an amalgam of style elements from the past, such as the classical and Baroque, and apply them

in a witty and parodic way that emphasizes surface rather than depth.

The implication is that in an age of mass media and multiculturalism, clarity and coherence of meaning are. no longer possible. This collapse of progress and signification is seen by some cultural critics. For instance Jean Baudrillard and Jean-Francois Lyotard, as symptomatic of society as a whole." (5)

درج بالا اقتباس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ" ماس میڈیا اور کثیر الثقافتی دور میں معنی کا انسلاک اور اشیاء کا واضح وجود اب ممکن نہیں رہا۔ مجموعی طور پر معاشرہ میں ترقی اور معنویت/مقصدیت کا انہدام بہت سے ثقافتی نقادوں کا موضوع رہا ہے، خاص طور پر جین بادریلا اور جین فرینکوس لیوٹارڈ وغیرہ۔

درج بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ Postmodernism کی بطور نظریہ (Theory) کوئی جامع تعریف (Definition) سامنے نہیں آسکی اور صورتحال ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مابعد جدیدیت روایتی (classical) معنوں میں کوئی Theory ہے ہی نہیں، بلکہ بعض نقادوں کے نزدیک یہ ایک Anti-theory ہے۔ اس پر بحث اپنے مقام پر آئے گی، فی الحال pomo کی مزید وضاحت کے لیے ہم The Penguin Dictionary of Literary Terms کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کے مطابق:

"A general (and sometimes controversial term used to refer to changes, developments and tendencies which have taken place (and are taking place) in literature, art, music, architecture, philosophy etc, since the 1940 or 1950s. Postmodernism is different from Modernism, even a reaction against it. It is not easier to define than many other 'isms'. Like them, it is amorphous by nature.

The burgeoning of Marxist, feminist and psychoanalytic criticism since the 1970s is yet another aspect of post modernism. It also refers to a critical position in

criticism, in which a complete relativism exists, hence its proximity to post structuralism. Perhaps most important of all are the revolutionary theories in philosophy and literary criticism expressed in structuralism and deconstruction." (6)

یعنی ایک عام لیکن متنازع اصطلاح جوادب، آرٹ، موسیقی، فنِ تعمیر اور فلاسفی وغیرہ کی تبدیلیوں، ترقیوں اور رجحانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت 1940-50 کے بعد جدیدیت سے علیحدہ (نظریہ) ہے۔ بلکہ مابعد جدیدیت، جدیدیت کا رد ہے۔ دیگر ازموں (isms) کی طرح مابعد جدیدیت کی تعریف کرنا آسان نہیں کیونکہ فطرتاً یہ بے شکل اور بے ڈھانچہ ہے۔

1970ء سے مارکسسٹوں کی بورژدائیت، آزادیٔ نسواں کی تحریک اور نفسیاتی تحلیلی تنقید مابعد جدیدیت کے مزید پہلو ہیں۔ مابعد جدیدیت تنقید کے باقاعدہ رجحان یا تحریک کا نام بھی ہے۔ ایک ایسا رجحان جس میں اضافیت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، لہٰذا اس کے ڈانڈے پس ساختیات سے بھی جا ملتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کی سب سے نمایاں خصوصیات غالباً اس کے انقلابی نظریات، فلسفہ اور ادبی تنقید کے حوالہ سے ہیں، جنہیں 'ساختیات' اور 'ردتشکیل' میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ Postmodern Age کی پروڈکٹ اور عصرِ حاضر کا جامِ جم یعنی Internet ہمیں pomo کے بارے میں مزید معلومات اس طرح مہیا کرتا ہے:

"**Postmodernism:** A general and wide-ranging term which is applied to literature, art, philosophy, architecture, fiction and cultural and literary criticism, among others, postmodernism is largely a reaction to the assumed certainty of scientific or objective, efforts to *explain reality. In essence, it simply mirrored in human* understanding of it, but rather is constructed as the mind tries to understand its own particular and personal reality. For this reason, postmodernism is highly skeptical of explanations which claim to be valid for all groups, cultures, traditions, or races, and instead focuses on the

relative truths of each person. In the postmodern understanding, interpretation is everything: reality only comes into being through our interpretations of what the world means to us individually. Postmodernism relies on concrete experience over abstract principles, knowing always that the outcome of one's own experience will necessarily be fallible and relative, rather than certain and universal.

Postmodernism is 'post' because it denies the existence of any ultimate principles, and it lacks the optimism of there being a scientific, philosophical or religious truth which will explain everything for everybody a characteristic of the so called 'modern' mind. The paradox of the postmodern position is that, in placing all principles under the scrutiny of its skepticism, it must realize that even its own principles are not beyond questioning. As the philosopher Richard Tarnas states, postmodernism cannot on its principles ultimately justify itself any more than can the various metaphysical overviews against which the postmodern mind has defined itself." (7)

درج بالا عبارت کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ مابعد جدیدیت ایک عام لیکن وسیع اثر رکھنے والی اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ادب، آرٹ، فلسفہ، فن تعمیر، فکشن وغیرہ کے علاوہ ثقافتی اور ادبی تنقید پر بھی ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت اصل میں سائنسی اور تجربی مزعومہ دعاوی کے خلاف ردعمل ہے جو حقیقت (Reality) کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختصراً، مابعد جدیدیت اس تسلیم ورضا کا نام ہے کہ حقیقت محض انسان کے فہم وادراک سے منعکس نہیں ہوتی بلکہ انسانی ذہن اپنے ذاتی فہم سے خود حقیقت کی تعمیر کرتا ہے۔ یعنی حقیقت (Reality) خارجی نہیں بلکہ داخلی کیفیت کا نام ہے۔ اسی لیے مابعد جدیدیت ان تمام وضاحتوں، تشریحات وتفاسیر اور نظریات کو رد (Skeptical) کرتی ہے جو تمام فرق، ثقافتوں، روایات، رسوم ورواج یا اقوام وملل کے لیے یکساں لاگو (valid) ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔

مابعد جدید ذہن کے نزدیک وضاحت (Interpretation) ہی سب کچھ ہے۔ حقیقت اسی وقت وجود میں آتی ہے جب دنیا کے ذاتی تجربے سے افراد اپنے لیے اس Experience کو Interpret کریں۔

مابعد جدیدیت مفروضہ/ مزعومہ اصولوں کی بنیاد پر ٹھوس تجربات پر انحصار کرتی ہے۔ اگرچہ یہ بات یقینی ہے کہ انفرادی اور ذاتی تجربات کا نتیجہ غلطی سے مملو اور اضافی ہوتا ہے نا کہ یقینی اور آفاقی۔

مابعد جدیدیت اس لیے "مابعد" ہے کہ یہ کسی بھی حتمی اصول اور آفاقی سچائی کے وجود کا انکار کرتی ہے۔ یہ کسی بھی سائنس، فلسفیانہ اور مذہبی صداقت کی منکر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس، فلسفہ اور مذہب آفاقی ہیں جبکہ مابعد جدیدیت اضافیت اور انفرادیت کی مدعی ہے۔

مابعد جدیدیت کا ایک واضح تضاد (paradox) یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے حتمی اور آفاقی اصولوں ونظریات کو رد کرتی ہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ پھر اس کے اصول ودعاوی کیونکر قابل تسلیم اور شک سے بالا ہو سکتے ہیں؟ مشہور معاصر مغربی فلسفی رچرڈ ٹارنز جو کہ مابعد جدیدیت کے نقادوں میں سے ایک ہیں، یہی رائے رکھتے ہیں کہ مابعد جدیدیت اپنے اصولوں کی بنیاد پر خود کو ہی ثابت نہیں کر سکتی جبکہ مابعد الطبیعیات نظریات کے دعاوی کے ثبوت موجود ہیں جن کا مابعد جدیدیت کے حامی انکار کرتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے بانیوں میں ایک نمایاں اور اہم ہستی جین فرینکوس لیوٹارڈ (Jean-Francois Lyotard) ہیں۔ موصوف نے فرانسیسی زبان میں ایک مختصر لیکن قابلِ تقلید (Trend-setter) کتاب لکھ کر مابعد جدیدیت کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا، اس کتاب کا نام ہے:

The Postmodern Condition: A Report on Knowledge

اس کتاب کے آغاز کے دو پیراگراف اس طرح سے مابعد جدید صورتحال کا تذکرہ کرتے ہیں:

"Our working hypothesis is that the status of knowledge is altered, as societies enter what is known as the

post-industrial age and cultures enter what is known as the postmodern age. This transition has been under way since at least the end of the 1950s which for Europe marks the completion of reconstruction. The pace is faster or slower depending on the country, and within, countries it varies according to the sector of activity. The general situation is one of temporal disjunction which makes sketching an overview difficult. ......scientific knowledge is a kind of discourse and it is fair to say that for the last forty years the 'Leading' sciences and technologies have had to do with language: phonology and theories of linguistics, problems of communication and cybernetics, modern theories of algebra and informatics, computers and their languages, problems of translation and the search for areas of compatibility among computer languages, problems of information storage and data banks, telematics and the perfection of intelligent terminals, to paradoxology. The facts speak for themselves (and this list is not exhaustive)."

لیوتارڈ مابعد جدیدیت کو کوئی تحریک، نظریہ یا تھیوری نہیں کہتے بلکہ عصر حاضر کی صورتحال ان کے نزدیک مابعد جدیدیت کا مظہر ہے۔ علم کے میدان میں انقلاب برپا ہونے کی وجہ سے علم قابل فروخت commodity بن چکا ہے اور علم محض برائے رہنمائی نہیں بلکہ ڈیٹا بنکوں کے سٹوریج نظام کی وجہ سے معلومات کا ذخیرہ بن چکا ہے اور معاشرے (خاص طور پر مغربی معاشرے) The producers and users of knowledge دو گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔ مغربی معاشرے سماجی لحاظ سے Postindustrial اور ثقافتی لحاظ سے Postmodern دور میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ تبدیلی 1950ء سے جاری ہے۔ تبدیلی کا عمل مختلف ملکوں میں مختلف ہے اور اس کا انحصار ملکوں کی ترقی پر ہے۔ ایک دور (جدیدیت) سے دوسرے دور (مابعد جدیدیت) کی بے ربط انقلابی تبدیلی کو لیوتارڈ زمانی بے ربطی (Temporal Disjunction) قرار دیتے ہیں۔

سائنسی علم ایک طرح کا ڈسکورس ہے اور گزشتہ چالیس سالوں سے لیڈنگ سائنسز اور ٹیکنالوجی نے زبان پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ صوتیات، لسانیات کے نظریات، کمیونی کیشن کے مسائل، سائبر نیٹکس، الجبرا اور انفارمیشن کے جدید نظریات، کمپیوٹرز اور اس کی زبانیں، ترجمانی کے مسائل اور کمپیوٹر کی زبانیات میں موزونیت، ڈیٹا بنک اور معلومات کے ذخائر کے مسائل، جدید ذرائع مواصلات اور معلومات کے نظام کی کاملیت وغیرہ معاشروں میں عجیب تضاد کی صورتحال رونما ہو چکی ہے۔

آگے چل کر اسی کتاب کے پانچویں باب بعنوان The Nature of the Social Bond: The postmodern perspective میں لیوٹارڈ لکھتا ہے:

> "What is new in all of this that the old poles of attraction represented by nation-states, parties, professions, institution and historical traditions are losing their attraction. And it does not look as though they will be replaced, at least not on their former scale. The trilateral commission is not a popular pole of attraction. "Identifying" with the great names, the heroes of contemporary history, is becoming more and more difficult........ But then again, it is not exactly a life goal. It depends on each individual's industriousness. Each individual is referred to himself, And each of us knows that our self does not amount too much.
>
> **This breaking up of grand narratives leads to what some authors analyse in terms of the dissolution of the social bond and the disintegration of social aggregates into a mass of individual atoms thrown into the absurdity of Brownian motion. Nothing of this kind is happening: this point of view it seems to me, is haunted by the paradisaic representation of a lost "organic" society."(8)**

مابعد جدید صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لیوٹارڈ لکھتا ہے کہ قومی ریاستوں، پارٹیوں، پیشوں، اداروں اور تاریخی روایات کے پیش کردہ دلکشی کے مراکز اپنی اہمیت وافادیت کھوتے جارہے ہیں۔ ہمارے لیے قابلِ غور اور قابلِ اعتراض (Challengeable) لیوٹارڈ کا یہ دعویٰ ہے کہ Historical traditions are losing their attraction. اگر بات محض مغربی معاشروں تک محدود ہوتی تو ہمارے لیے قابل اعتراض نہ تھی۔ لیکن کتاب کے افتتاحی پیراگراف میں ہی موصوف یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ تبدیلی کی یہ ہوا پورے کرۂ ارض میں چل چکی ہے اور اس کی زد سے کوئی بھی معاشرہ محفوظ نہیں۔ کیا مسلم معاشروں میں بھی ''ادارے اور تاریخی روایات'' اپنی اہمیت کھو چکے ہیں؟ آگے چل کر ہم اس پر سیر حاصل بحث کریں گے۔

موصوف کے نزدیک اگر تثلیثی روایات اپنی دلچسپی کھو چکی ہوں تو یہ کونسا تعجب کی بات ہے۔ جدیدیت اور اس سے پہلے نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ کا سب سے اہم کارنامہ ہی مذہب بےزاری، دوسرے الفاظ میں عیسائیت کا رد رہا ہے۔ لیکن اسلام کی صاف ستھری اور فطری تعلیمات سے یورپ بے بہرہ رہا ہے تو اس کے قصوروار بھی مسیحی مذہب کے ٹھیکیدار ہیں جو اسلام کے پیغام کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے!

لیوٹارڈ کو عظیم شخصیات اور ان کے کارناموں پر بھی اعتراض اور تشکیک ہے۔ اگر مارکس اور اینجل اپنے دعوے میں ناکام رہے ہیں یا کمیونزم ناکام ہوگئی ہے تو یہ ان کا پرابلم ہے۔ اگر کمیونزم ناکام ہوا ہے تو اس مایوسی کی چادر تلے چھپ کر دیگر ہستیوں کے کارناموں کا انکار کرنا کہاں کی دانائی ہے؟

درج بالا اقتباس میں سب سے قابلِ اعتراض اور چیلنج کرنے والا یہ دعویٰ ہے کہ:

> This breaking up to grand Narratives.... مہابیانیوں (عظیم صداقتوں) سے اعتماد اٹھ جانے سے معاشرہ سماجی انتشار میں مبتلا ہو گیا ہے، اور سماجی اجتماع کے ادارے فضا میں بے ترتیب بکھرے جواہر (Atoms) کی طرح ہیں جو براؤنی (بے ترتیب) حرکت میں پھرتے ہیں۔ (9)

یہ تھا لیوٹارڈ جین فرینکوس کے مغربی معاشروں میں مابعد جدید صورتحال کے بارے میں اپنے

مشاہدات اور احساسات کا حاصل مطالعہ: پروفیسر ڈگلس کیلنر (Douglas Kellner) مابعد جدیدیت کا تجزیہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"On the terrain of everyday life, new youth subcultures of resistance are visible throughout the world, as are alternative subcultures of women, gays and lesbians, blacks and ethnic minorities, and other groups that have resisted incorporation into the hegemonic mainstream culture. British cultural studies has accordingly explored both mainstream hegemonic cultures and oppositional subcultures since the 1970s. It has focused on articulations of class, race, gender, sexual (preference), ethnicity, region, and nation in its explorations of concrete cultural configurations and phenomena in the postmodern age." (10)

پروفیسر کیلنر کے مطابق مابعد جدیدیت کے مظاہر ہمیں روزمرہ زندگی میں نمایاں اور عام دیکھنے کو ملتے ہیں اور نئے نئے کلچر اور ماتحت کلچر پروان چڑھ رہے ہیں، اور یہ معاملہ ساری دنیا میں ہے۔ پروفیسر موصوف اس کی مثالیں مردانہ اور زنانہ ہم جنس پرستی کے کلچر اور ان کو قانونی تحفظ ملنا، کالے لوگوں (حبشیوں) کے کلچر اور نسلی اقلیتوں کے کلچر وغیرہ کی مثال دیتے ہیں کہ یہ کلچر اپنی علیحدہ پہچان بنا چکے ہیں اور کسی بھی سوسائٹی کے مرکزی اور غالب کلچر میں ضم ہونے سے مزاحم ہیں۔ جس طرح کہ برٹش کلچرل سٹڈیز کے تحت 1970ء سے اس کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ یہ سٹڈیز اپنی توجہ مختلف کلچرز پر مرکوز رکھے ہوئے ہے مثلاً گروہ بندی، نسل، جنس، جنسی ترجیحات، نسل پرستی، علاقائیت و قومیت وغیرہ کے کلچر کس طرح ٹھوس بنیادوں پر استوار ہو رہے ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ پروفیسر موصوف نے اس بات کا تذکرہ کرنا شاید دانستہ طور پر مناسب نہیں سمجھا کہ مذہبی شدت پسندی اور مشرق کے مقابلے میں مغرب کی برتری کے کلچر کو بھی برٹش کلچرل سٹڈیز میں فوکس کیا گیا ہے۔

بہرحال پروفیسر کیلنر کے مطابق مابعد جدیدیت کا ایک مظہر مختلف sub اور alternative کلچرز کا قائم ہونا بھی ہے، اور ان میں افسوسناک بات یہ ہے کہ کچھ ایسے کلچرز متعارف اور مقبول

ہو چکے ہیں جن کا وجود انسان کی معلومہ تاریخ کے کسی دور میں بھی نہ تھا۔ مثال کے طور پر Lesbian اور Gay کلچر کا رواج پانا۔ یہ بات تو قابل تسلیم ہے کہ بائبل اور قرآن کے مشترکہ بیان کے مطابق سدوم کی بستیوں میں اغلام بازی (لواطت) عام تھی۔ لیکن پھر بھی اسے قانونی شادیوں کی صورت نہ دی گئی تھی اور قانون نے ہم جنس پرست جوڑے کو حق وراثت بھی نہ دیا تھا۔ یہ فعل بہر حال مذموم خیال کیا جاتا تھا جبکہ آج یہ صورتحال ہے کہ پورے طمطراق کے ساتھ Homosexual شادیاں ہورہی ہیں۔ پروفیسر کیلو نے اس طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ یہ کلچر ساری دنیا میں عام ہورہے ہیں۔ مسلم معاشرے توفی الحال اس کلچر سے محفوظ ہیں، لیکن یہ خطرناک اور شرمناک رجحان تیسری دنیا کے مشرقی ممالک میں بھی پرورش پا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور بتاریخ 3 جولائی 2009ء کی یہ خبر چونکا دینے والی ہے کہ کس طرح مشرق بھی مابعد جدیدیت کی زد میں ہے، خبر کی سرخی اور تفصیل درج ذیل ہے:

> سرخی: نئی دہلی ہائیکورٹ نے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیدیا۔ اس سرخی کے نیچے ایک تصویر جمائی گئی ہے جس میں عورتوں کو اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور کیپشن میں لکھا ہے۔۔۔ نئی دہلی: خواتین ہم جنس پرستی کو قانونی قرار دیئے جانے پر خوشی کا اظہار کررہی ہیں اور خبر کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:
>
> ''نئی دہلی (نیوز ایجنسیاں) نئی دہلی کی ہائیکورٹ نے بھارتی آئین کی دفعہ 377 کی نئی تشریح کرتے ہوئے باہمی رضامندی سے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیا ہے۔ عدالت نے اس فیصلے کے ذریعے بھارتی آئین کی دفعہ 377 کی نئی تشریح کردی ہے۔ اس سے قبل اسی دفعہ کے تحت ہر قسم کی ہم جنس پرستی کو غیر قانونی اور قابل سزا جرم قرار دیا گیا تھا۔ تاہم عدالتی فیصلے کے تحت اب اس دفعہ کا اطلاق صرف زبردستی سے ہم جنس پرستی کرنے والے افراد پر ہوگا۔ چیف جسٹس کی قیادت میں قائم بینچ نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ ہر قسم کا امتیاز انصاف اور مساوات کے اصولوں کے منافی ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ باہمی رضامندی سے جنسی تعلقات قائم رکھنے پر پابندی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ بی بی سی کے مطابق عدالت کے اس فیصلے سے ملک کے لاکھوں ہم جنس پرستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔
>
> بھارتی اداکارہ اور ہم جنس پرستی کی علمبردار سلینا جیٹلی نے عدالتی فیصلے کو تاریخی قرار دیا

اور کہا میں اس پر بہت خوش ہوں۔" (11)

اب تک ہم مختلف حوالوں سے مابعد جدیدیت کے بارے میں مطالعہ کر چکے ہیں۔ اگر ہم درج بالا اقتباسات کی روشنی میں گفتگو کو سمیٹنا چاہیں تو مابعد جدیدیت کا تعارف کچھ اس طرح کروا سکتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت کے علم برداروں نے اپنے مخصوص افکار پر جس شدومد کے ساتھ اصرار کیا اور ان افکار کے نفاذ کے لیے جس طرح طاقت اور حکومت کا بے دریغ استعمال ہوا اس نے فکری استبداد کی وہی صورتحال پیدا کر دی جو عہد وسطیٰ کے یورپ میں مذہبی روایت پسندی نے پیدا کی تھی اور جس کے ردعمل میں جدیدیت (Modernism) کی تحریک پیدا ہوئی تھی۔ اس استبداد کا لازمی نتیجہ شدید ردعمل کی شکل میں رونما ہوا اور یہی ردعمل مابعد جدیدیت (Postmodernism) کہلاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی متفقہ تعریف تو سامنے نہیں آسکی لیکن اس بات پر تقریباً تمام مفکرین کا اتفاق ہے کہ مابعد جدیدیت، جدیدیت کے ردعمل کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی۔

لہٰذا مابعد جدیدیت دراصل ان افکار کے مجموعے کا نام ہے جو جدیدیت کے بعد اور اکثر اس کے ردعمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس کے علم بردار نہ تو کسی منظم نظام فکر کے قائل ہیں اور نہ منظم تحریکوں کے۔ اس لیے یہ فکر اشتراکیت یا جدیدیت کی طرح کوئی مبسوط یا منظم فکر نہیں ہے اور نہ اس کی پشت پر کوئی منظم تحریک ہی موجود ہے۔ بلکہ مابعد جدیدیت کے علم بردار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کسی نظریے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس عہد کا نام ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں اور ان کیفیتوں کا نام ہے جو اس عہد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم لیوٹارڈ اور پروفیسر ڈگلس کیلز کے خیالات پڑھ چکے ہیں۔ (12) ظاہر ہے کہ یہ محض دعویٰ ہے اور چونکہ وہ اپنے خیالات کی تائید میں کتابیں لکھ رہے ہیں، فلسفیانہ مباحث چھیڑ رہے ہیں اور بحثیں کر رہے ہیں اس لیے دنیا ان کے خیالات کو نظریہ حیات (Ideology) یا طرز زندگی ماننے پر مجبور ہے۔

اس مقام پر اس بات کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ اکثر امور میں مابعد جدیدیت کے مفکرین میں اتفاق رائے بھی نہیں ہے اور علمی حلقوں میں یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال ہوتی

رہی ہے (اس کے بارے میں آگے وضاحت ہوگی) اس لیے اس کی تعریف بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ تاہم بعض خیالات مابعد جدیدیت مفکرین میں مشترک بھی ہیں اور یہی مشترک فکر ان کا امتیاز ہے۔ لیوٹارڈ، جس کا اس فکر کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے اس نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"I define postmodernism as incredulity towards metanarratives." (13)

(میرے نزدیک مابعد جدیدیت کا مطلب عظیم بیانات پر عدم یقین ہے)۔

مابعد جدیدیت کے حامی کہتے ہیں کہ جدیدیت نے عقل کی بالاتری، آزادی، جمہوریت، ترقی، کھلی منڈی اور اشتراکیت (Communism) جیسے خیالات عالم گیر سچائیوں (Metanarratives) کی حیثیتوں سے پیش کیے۔ یہ ایک کھلا فریب تھا۔ زمانہ کے امتداد نے ان ساری خود ساختہ حقیقتوں کا جھوٹ واضح کر دیا ہے، اس لیے اب اس عہد میں اس طرح کے عظیم بیانات Metanarratives / Meganarratives / Grandnarratives نہیں چلیں گے۔ یہ اس عہد کا خاصہ ہے کہ اس میں جدیدیت کے تمام دعووں کی عمارت ڈھادی گئی ہے۔ اور اس عہد کی یہ خصوصیت ہی مابعد جدیدیت ہے۔ دیکھیے Wikipedia مابعد جدید عہد کی خصوصیات اس طرح بیان کرتا ہے:

"Postmodernist ideas in philosophy and the analysis of culture and society expanded the importance of critical theory has been the point of departure for works of literature architecture, and desig[illegible] as well as being visible in marketing / business and the interpretation of history, law and culture. These developments re-evaluation of the entire western, value system (love, marriage, popular culture, shift from industrial to service economy)

Postmodernism was originally a reaction toward modernist ideology. Largely influenced by the western European "disillusionment" induced by world war-II. Postmodernism refers to a cultural, intellectual, or artistic

state lacking a clear central hierarchy or organizing principle and embodying extreme complexity, contradiction, ambiguity, diversity, interconnectedness or interreferntiality, in a way that is often indistinguishable from a parody of itself. It has given rise to charges of fraudulence." (14)

مابعدجدیدیت: اصطلاح کی تاریخ (History of the Term)

جہاں تک مابعدجدیدیت بطور اصطلاح کے آغاز کا تعلق ہے۔ 1870ء کے قریب اسے مختلف شعبہ جات (Fields) میں استعمال کیا گیا۔ مثال کے طور پر (John Watkins) نے لکھا:

"A postmodern style of painting to get beyond French Impressionism."(15)

پھر J.M.Thompson نے 1914ء میں اپنے آرٹیکل میں اس اصطلاح کو استعمال کیا جو The Hibbert Journal (a quarterly philosophical review) میں چھپا۔ یہ اصطلاح اس نے عقاید و نظریات کے بدلتے رجحان کو بیان کرنے کیلئے استعمال کی۔ اس کے الفاظ تھے:

"The raison detre (D'être) of post-Modernism is to escape from the double mindedness of modernism by being thorough in its criticism by extending it to religion as well as theology, to catholic feeling as well as to catholic tradition."(16)

1917ء میں Rudolf pannwitz نے اس اصطلاح کو فلسفیانہ سمتی ثقافت (philosophically oriented culture) کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا۔ Pannwitz نے postmodernism کا آئیڈیا اصل میں نطشے کے جدیدیت کے تجزیہ (analysis of modernity) سے مستعار لیا تھا اس نے کہا تھا:

"Overcoming the modern human would be the post human."(17)

1921ء اور 1925ء میں اسے آرٹ اور موسیقی کی نئی شکلوں (forms) کے ذکر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ بعد میں 1926ء میں B.I.Bell نے اپنے مضمون Postmodernism and other میں اس اصطلاح کو استعمال کیا۔ Charles Jencks (18) نے اپنی کتاب What is Post-Modernism? (London 1989) میں لکھا ہے کہ غالباً Post-Modernism کو سب سے پہلے مشہور مورخ Arnold J. Toynbee نے اپنی شہرہ آفاق کتاب A story of History میں تاریخی ادوار کے معنی میں استعمال کیا۔ ٹائن بی کے الفاظ تھے:

> "Our Post-Modern age has been inaugurated by the general war of 1914-1918." (19)

یہ کتاب 1947ء میں شائع ہوئی لیکن نو برس پہلے 1938ء میں لکھی جا چکی تھی۔ Encyclopaedia Britannica کے مطابق:

> "In 1949, it was used to describe a dissatisfaction with modern architecture, leading to the postmodern architecture movement." (20)

فنون لطیفہ میں 'مابعد جدیدیت' کی اصطلاح سب سے پہلے آرٹ تھیوری میں رائج ہوئی، عمرانیات اور ادبیات میں اس کا رواج بعد میں ہوا۔ ادبیات میں اس کا استعمال سب سے پہلے عرب امریکی ادیب اور سکالر اہاب حسن نے کیا۔ اہاب حسن (Ihab Hassan) کی کتاب ہے:

> The Dismemberment of Orpheus: Towards a Post-Modern Literature (1976)

تقریباً اسی زمانے میں اس اصطلاح کا استعمال فرانس میں بھی عام ہو گیا اور Baudrillard, Deniel Bill اور Lyotard نے Postmodernism سے بطور تھیوری یا صورتحال بحث کرنا شروع کیا۔ لیوتار کی کتاب جس کا ذکر ہم پیچھے کر آئے ہیں اور مزید بھی ہو گا یعنی The Postmodern Condition: A Report on Knowledge مابعد جدیدیت پر بنیادی حوالے اور Bible کا درجہ رکھتی ہے۔ Lyotard کے علاوہ فرانسیسی نظریہ

ساز J.Habermas دے لیوز اور گواتری (Deleuze and Guattari) نیز امریکی مفکر فریڈرک جیمسن (Jameson, Fredrick) نے بھی مابعد جدید صورتحال سے اپنی اپنی تھیوری میں بالوضاحت بحث کی ہے، جس کا ذکر آئے گا۔ مزید یہ کہ مدن سروپ (Madan Sarup) نے اپنی کتاب Madan Sarup, An Introductory to Post- Structuralism and Postmodernism (Athens, Georgia 1989) میں آخری باب postmodernism کیلئے وقف کیا ہے۔ اگرچہ مدن سروپ بنیادی طور پر Marxism کا دفاع کرتا ہے تاہم فرانسیسی مفکرین کے افکار کا اس نے بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔ اسی موضوع پر لیوٹارڈ کی ایک اور کتاب بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ جس کا نام ہے:

The Postmodernism Explained to Children. Tr. by Don Berry (Turnaround 1992)

اس کتاب میں لیوٹارڈ نے اپنی تھیوری کو سادہ زبان میں خطوط کی صورت میں لکھا ہے)۔ ایک اور امریکی مفکر Gilbet Adier نے Postmodern culture سے بحث کی ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ مغرب کی بعض جامعات میں مابعد جدیدیت کی بحث cultural studies کے طور پر بھی جاری ہے۔ اس طرح مابعد جدیدیت کی اصطلاح تقریباً ڈیڑھ صدی پرانی ہے مگر ایک Phenomenon کے طور پر مابعد جدیدیت نصف صدی سے زیادہ عمر نہیں رکھتی۔ پاکستان میں اردو ادبی تنقید کے حوالے سے نقادانِ فن نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں رؤف نیازی، شفیق احمد، ضمیر علی بدایونی، ناصر عباس نیر، احمد سہیل، افضال حسین قاضی، ایاز محمود سید، فہیم اعظمی وغیرہ۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اردو زبان وادب کو مابعد جدیدیت سے متعارف کروانے کا سہرا ہندوستانی مفکر اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سر ہے جنہوں نے اس موضوع پر ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' نامی کتاب لکھ کر اردو میں اس بحث کا آغاز کیا۔ بعد میں ان کی اس موضوع پر مزید کتب مثلاً اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، جدیدیت کے بعد اور جدیدیت، ترقی پسندی، مابعد جدیدیت وغیرہ اور مقالات بھی سامنے آئے۔ پھر ہندوستانی اردو نقادوں مثلاً وہاب اشرفی، ابرار رحمانی، ابوالکلام قاسمی، اسلم حنیف، خورشید اکبر، دیوندر اسر، ساجدہ زیدی، سلیم شہزاد، شرجیل احمد خان، صدیق عالم، معراج رعنا، ضیاء الدین سردار

وغیرہ نے اس موضوع پر مقالات میں تعرض فرمایا۔ پاکستانی نژاد امریکی پروفیسر فلم میکر، ایمبیسیڈر ادیب اور مفکر ڈاکٹر اکبر صلاح الدین احمد کے تذکرہ کے بغیر بات تشنہ رہے گی جنہوں نے اس موضوع پر ایک نہایت مفید کتاب تحریر فرمائی جس کا نام ہے:

Akbar S. Ahmad, Postmodernism and Islam: Predicament and Promise, Routledg London(1992)

اوپر درج کیے گئے مصنفین، مفکرین اور نقادوں میں سے کسی نے بھی مابعد جدیدیت کا اسلامی حوالے سے جائزہ نہیں لیا--سوائے اکبر صلاح الدین احمد کے، اور تاسف کی بات یہ ہے کہ ان کے خیالات سے کلی اتفاق کرنا نہایت مشکل ہے--اس کا تذکرہ بھی ہم مناسب مقام پر کریں گے۔

بہر حال ہمارے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اردو زبان وادب اس نام اور اصطلاح یعنی مابعد جدیدیت سے اجنبی نہیں رہے اور کسی نہ کسی حوالے سے متعارف ہو چکے ہیں۔ سوال اصل میں متعارف ہونے یا نہ ہونے کا نہیں۔ اگر کوئی کیلشیم سائنائڈ (Ca CN) کا مہلک زہر حلق سے اتار لے اور وہ کیمسٹری کا پروفیسر ہو یا کسی دور افتادہ گاؤں کا جاہل نوجوان، دونوں پر اس کے اثرات ایک سے مرتب ہوں گے۔ اس طرح اس اصطلاح سے متعارف (ادبی حوالے سے) اور غیر متعارف لوگوں پر اثرات ایک سے ہی مرتب ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مابعد جدیدیت کے چیلنج سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور اس حوالے سے اسلامی تعلیمات سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کی Awareness کو عام کیا جائے تاکہ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کی رو میں بہہ کر مسلمان نوجوان اپنی عاقبت کا نقصان نہ کر لیں اور اس مقالے میں ہم اسی کی کوشش کریں گے۔ انشاءاللہ!!!

اپنی اس گفتگو کو ہم پروفیسر والٹر اینڈرسن (Walter Truett Anderson) کے درج ذیل الفاظ پر سمیٹتے ہیں جس میں انہوں نے مابعد جدیدیت کو دنیا کے موجودہ نظریات میں سے ایک کے طور پر شناخت کیا ہے۔ Wikipedia میں Postmodernism آرٹیکل کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"Walter Anderson identifies pomo as one of four world views these four world views are the postmodern ironist, which sees Truth (Capital T) as socially constructed, the scientific rational........"(21)

لیوٹارڈ کی کتاب The Postmodern Condition: A Report on Knowledge پر جب تک سیر حاصل گفتگو نہ کر لی جائے ہماری بات تشنہ رہے گی۔ اس لیے ہم ایک بار پھر کتاب مذکور کی مدد سے مابعد جدیدیت یا مابعد جدید صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

برقیاتی علم: نئی ذہنیت

کتاب کے پہلے باب میں لیوٹارڈ لکھتا ہے:

"Data Banks are the encyclopaedia of tomorrow; they are 'nature' for postmodern men and women. We can predict that anything in the constituted body of knowledge that is not translatable in this way will be abandoned and that the direction of new research will be dictated by the possibility of its eventual results being translatable into computer language."(22)

لیوٹارڈ کہتا ہے کہ علم کی نوعیت بدل گئی ہے کیونکہ معاشرے مابعد صنعتی (Postindustrial) دور میں داخل ہو چکے ہیں اور ثقافتیں (cultures) مابعد جدید عہد میں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں اس تیزی سے رونما ہوئی ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے، معاشرے کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ٹیکنالوجی اور ٹیلی مواصلات کا انقلاب اس نوعیت کا ہے کہ آج پوری دنیا میڈیا سوسائٹی بن گئی ہے۔ دور دراز کے معاشرے جہاں پہلے تبدیلیاں دیر میں پہنچا کرتی تھیں یا نہیں پہنچتی تھی، یا جو معاشرے 'محفوظ' سمجھے جاتے تھے اب وہ بھی غیر محفوظ ہیں اور اس انقلاب کی زد میں آ چکے ہیں۔ لیوٹارڈ نے اپنی کتاب میں ان تمام تبدیلیوں اور ان کے اثرات سے بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کمپیوٹر زدہ (Computerised) معاشرے میں علم (Knowledge) کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ مابعد جدید معاشرے یا معاشروں کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے وہ تین امور پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

(۱) پچھلے چالیس پچاس برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں سب سے زیادہ عمل دخل زبان کا ہے۔ کمپیوٹر برقی ذہن کے لیے زبان وضع کرنا، اس زبان کے ذریعے معلومات کو جمع کرنے اور پانے کا عمل، مصنوعی مشینی زبان، اور مشینی ترجمہ، معلومات کی ذخیرہ اندوزی اور

برقیاتی معلوماتی بنکوں کا قیام وغیرہ۔۔۔معاشروں کے مابعد جدید دور میں داخل ہونے کی وجہ سے،علم کا وہ حصہ جو برقیاتی ذہن کو ہضم نہیں کرایا جاسکے گا یا جس کی برقیاتی تحلیل نہ ہوسکے گی، طاقِ نسیاں میں دھرا رہ جائے گا۔علم جو پہلے ذہن انسانی کو جلا دینے یا شخصیت کو سنوارنے نکھارنے کے لیے حاصل کیا جاتا تھا،اب فقط اس لیے پیدا کیا جائے گا کہ کی منڈی معیشت میں اس سے نفع حاصل ہو سکے یا اس کو طاقت کے ہتھیار کے طور پر برتا جاسکے۔

(2) برقیاتی ٹیکنالوجی کے اس انقلاب سے علم کی نوعیت میں جو تبدیلی آئی ہے اس سے علم اب اپنا جواز آپ نہیں رہا۔ بلکہ علم پوری طرح کمرشل قوتوں کے زیر سایہ آگیا ہے۔علم اب شخصیت کا جزو نہیں بلکہ منڈی کا مال ہے جسے خریدا اور بیچا جاسکتا ہے۔ پہلے حصول علم کے لیے زندگیاں وقف کی جاتی تھیں۔اب علم مارکیٹ Commodity ہے جو Mass scale پر پیدا(produce) کیا جارہا ہے اور صابن، شیمپو کی طرح بکاؤ ہے،علم اب حاکم نہیں محکوم ہے۔علم کی تصغیریت (Miniaturisation) کے بعد اس کا کمرشل استحصال روزمرہ زندگی کا مشاہدہ اور مظاہرہ ہے۔

سائنسی علم: بیانیہ اور مہا بیانیہ

"I define postmodernism as incredulity towards Metanarratives." (23)

(3) لیوٹارڈ اسی پر اکتفا نہیں کرتا،وہ علم کی دو قسمیں بیان کرتا ہے۔ایک کو وہ سائنسی علم کہتا ہے اور دوسرے کو'بیانیہ'(Narrative)۔اس کا کہنا ہے کہ سائنسی علم اور بیانیہ میں تضاد و کش مکش کا رشتہ ہے اور یہ کش مکش ہمیشہ سے رہی ہے۔لیوٹارڈ کے بیانیہ سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''بیانیہ سے لیوتار کی مراد ثقافتی (مذہبی) روایت کا وہ تسلسل ہے جو میتھ (Myth) دیومالا، اساطیری (اسرائیلیات، مذہبی داستانیں) اور قصہ کہانیوں میں ملتا ہے۔'' (24)

لیوٹارڈ بیانیہ میں فلسفے کی روایتوں کو بھی شامل کرتا ہے۔ حالانکہ بیانیہ ایسی صداقت ہے جس سے معاشرتی کوائف وروابط نیک وبد، صحیح وغلط کی پہچان اور ثقافتی رویوں کے معیار طے ہوتے ہیں۔ بیانیہ نہ صرف کسی بھی معاشرے میں انسانی رشتوں کے نظم وربط کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ فطرت اور

ماحول سے انسان کے روابط کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں حسن، حق اور خیر کے معیار اسی سے طے ہوتے ہیں اور عوامی دانش وحکمت بھی اسی سرچشمے کی دین ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بھی ثقافت میں معاشرتی کوائف وضوابط اور معاشرتی رویوں کی تشکیل وتہذیب جس سرچشمۂ فیضان لیتی ہے وہ 'بیانیہ' ہی ہے۔

لیوٹارڈ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی یلغار کے 'بیانیہ' (Mininarrative) کا وجود برقرار ہے۔ یہ دونوں (سائنسی علوم اور بیانیہ) متضاد حقیقتیں ہیں، دونوں کے علم کے اپنے اپنے طور اور وٹگنسٹائن کی اصطلاح میں اپنی اپنی لسانی چالیں (Language Games) ہیں۔ سائنسی علوم میں جہاں ثبوت ضروری ہے، بیانیہ میں ثبوت یا دلیل ضروری نہیں۔ سائنسی روایت بیانیہ پر ہمیشہ معترض رہتی ہے، وہ بیانیہ کو نیم وحشی، نیم مہذب، قدامت پسند، پس ماندہ، توہم پرست، ظلمت شعار، جہالت کا شکار، مملوکیت سند وغیرہ کہتی ہے۔ گویا سائنسی علم کی رو سے بیانیہ سرے سے علم ہی نہیں۔'' (25)

یہاں رک کر گزشتہ باب کے اس مقام کا مطالعہ مفید رہے گا جہاں مسیحیت/کلیسا اور سائنس کے تصادم کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور پھر اس کے نتیجہ میں جدیدیت کی تحریک اور جدیدیت پسندوں کی طرف سے مذہب یا مسیحیت پر لگائے گئے الزامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیا لیوٹارڈ کے گنوائے گئے الزامات انہی الزامات کی بازگشت نہیں؟ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر بھی کتاب تو لکھتا ہے۔۔۔ مسیحیت اور سائنس کے درمیان تصادم کی، اور نام اس کا رکھتا ہے ''معرکۂ مذہب وسائنس''، بدقسمتی یہ ہے کہ گزشتہ تاریخ میں یورپ کا یہ ذہن بن چکا ہے کہ مذہب سے مراد محض Christianity ہے اور مسیحیت کا سقوط مذہب کی شکست ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے لے کر جدیدیت تک تمام تحاریک نے کھلم کھلا مذہب/مسیحیت سے بغاوت کا اعلان کیا لیکن مابعد جدیدیت کے دور میں بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مذہب کو معمولی اور غیر اہم مسئلہ سمجھ کر اس کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لیوٹارڈ کے درج بالا اقتباس کو دیکھئے۔ بیانیہ کے ضمن میں مذہبی روایات کا ذکر ناگزیر تھا۔ مگر اس نے مذہب کے بجائے Cultural Tradition کی اصطلاح استعمال کی اور مذہب کا لفظ Bypass کر گیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مذہب جیسی ''غیر اہم'' شے کا تذکرہ محض تضیع اوقات تھا۔ یا للعجب!

عالمی فکری روایتوں، مذہبی اور عالمی صداقتوں کو لیوٹارڈ مہابیانیہ (Metanarrative) کہتا ہے اور جیسا کہ پیچھے ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی پہچان ہی یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی صداقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے اس کے نزدیک تاریخ کے بڑے رزمیے یا میتھ دو ہیں:

اول انسان کی آزادی وحریت کا خواب اور دوسرے علوم انسانی کی کلی وحدت کا خواب! ان کو وہ مہابیانیہ بھی کہتا ہے۔ پہلا مہابیانیہ نوعیت کے لحاظ سے عملی سیاسی ہے جس کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا۔ اسے وہ Narrative of Emancipation کہتا ہے۔ دوسرا مہابیانیہ نوعیت کے اعتبار سے فکری ہے اور اس کا آغاز ہیگل کی جرمن روایت سے ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ اصلاً یہ دونوں مہابیانیہ آمرانہ ہیں اور انسان کی آزادی چھیننے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان ان فریب خوردگیوں کے خلاف نبرد آزما رہا ہے۔ شالن ازم کی متھ یا مہابیانیہ یہی تھا کہ انسان سوشلزم کی طرف گامزن ہے۔ لیوٹارڈ ان مثالوں کی روشنی میں ہر طرح کے مہابیانیہ کا کلی انکار کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے الفاظ ہیں:

> ''لیوتار تنبیہ کرتا ہے کہ مابعد جدیدیت میں کسی نوع کے مہابیانیہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مہابیانیہ خواہ فکری ہو یا سیاسی، مہابیانیہ کا اعتبار جاتا رہا۔''(26)

دیکھیے! لیوٹارڈ ہر قسم کے مہابیانیہ کا منکر ہے۔۔۔ فکری مہابیانیہ میں کیا مابعد الطبیعیاتی صداقتیں نہیں آتیں؟ بہر حال لیوٹارڈ کا دعویٰ درست ہے کہ عصر حاضر کے معاشروں کا مسئلہ اب مابعد الطبیعیاتی حقائق اور وحی والہام نہیں رہا بلکہ وہ اسے کلی طور پر رد کر چکے ہیں۔ اسی لیے تو موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ساری توجہ ایسی ایجادات پر ہے جن کی نوعیت مقصود End کی نہیں بلکہ ذرائع (Means) کی ہے (ان کے مطابق) مستقبل کی فریب خوردگیوں (حشر نشر، جزا سزا، جنت دوزخ وغیرہ) کے لیے آج کے انسان کے پاس وقت نہیں!

مابعد جدید مفکرین پر نطشے (Nietzsche) کا اثر

لیوٹارڈ، مشل فوکو، دے لیوز اور گواتری ہو یا فریڈرک جیمی سن چاہے وہ کارل مارکس کی زبان

بولیں یا ہیگل اور ہیبر ماس کی تائید کریں یا فرائیڈ کے نظریات کی تصدیق کریں، مابعد جدید مفکرین میں ایک بات مشترک ہے، وہ یہ کہ ان کا فلسفیانہ موقف نطشے کی جھلک رکھتا ہے۔ نطشے نے کہا تھا:

"Empirical facts do not seem to warrant the belief that history is a story of progress."(27)

مابعد جدید مفکرین بہت سی باتوں میں نطشے کے ہم نوا ہیں، مثلاً نطشے تاریخ کو لازماً ترقی کا سفر نہیں کہتا۔ انسانیت کا منتہا زوال کے آخری سرے پر واقع ہو یہ ضروری نہیں بلکہ نطشے اصرار کرتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جدید معاشرہ قدیم زمانے سے بہتر ہو! صداقت کے بارے میں نطشے کہتا ہے کہ صداقت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ نطشے ہمیشہ قائم رہنے والے تصور کا بھی قائل نہیں، وہ سیاسی نظام کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ نطشے کے ان خیالات کی گونج اکثر نئے فلسفیوں اور مفکرین کے یہاں ملتی ہے۔ نیز مابعد جدید صورت حال پر اس طرز فکر کے اطلاق کی مختلف شکلیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً فوکو تارتخیت کا کڑا احتساب کرتا ہے۔ تاریخ کا سفر تاریکی سے روشنی کی طرف ہو اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ وہ مزید یہ بھی کہتا ہے کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے، اس کو ہمیشہ مقتدر طبقہ طے کرتا ہے اور صداقت دراصل طاقت کا کھیل ہے۔ فوکو کا مشہور قول ہے کہ:

''فقط سچ بولنا ہی کافی نہیں ہے، سچائی میں شامل ہونا ضروری ہے۔(28)

بعد کے مفکرین نے فوکو کی اس سوچ سے خاصا اثر قبول کیا ہے۔ دریدا کے معنی کی طرفیں کھولنے اور صداقت کو بے مرکز ثابت کرنے میں بھی نطشے کے خیالات کی جھلک ملتی ہے، لیوٹارڈ بھی جو کسی زمانے میں غالی مارکسی تھا، کمیونزم کے سقوط کے بعد علی الاعلان نطشے کا ہم نوا ہو گیا۔ یہی حال دےلیوز اور گواتری کے خیالات کا ہے۔

لہٰذا ہماری اب تک کی بحث کی روشنی میں یہ بات بلاخوف و تردد کہی جاسکتی ہے کہ مغربی تہذیب اپنے مادی مظاہر اور فکری حاصلات سمیت ایک نئے اور مختلف مرحلے (phase) میں داخل ہو چکی ہے۔ اس مرحلے کا نام فی الحال تو مابعد جدیدیت تجویز کیا گیا ہے۔ بعد میں مفکرین کچھ اور نام بھی سامنے لا سکتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کی تعریف، دائرہ کار مقاصد اور مضمرات پر عمومی اتفاق رائے موجود نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، عمومی اتفاق رائے خود مابعد جدیدیت کی روح کے خلاف بھی ہے تاہم اتنی بات طے ہے کہ مابعد جدیدیت مغربی سائنس، معیشت، بشریات،

مذہبیات، لسانیات، سیاسیات، آرکی ٹیکچر، فلم، میڈیا، آرٹ، شاعری، فکشن، تنقید، فلسفہ، فلسفۂ حیات، نفسیات وغیرہ میں سرایت کر چکی ہے۔

موجودہ طبعی اور سماجی سائنس، آرٹ، فلسفہ ادب اور میڈیا وہ نہیں جو نصف صدی پیشتر تھا، نہ صرف ان کی نوعیت، ان کے وسائل اور ذرائع میں زبردست تبدیلی واقع ہو چکی ہے بلکہ ان کے مطالب و مقاصد بھی بدل چکے ہیں۔ نوعیت اور مقاصد میں ہونے والی تبدیلی، اتنی بنیادی اور ہمہ گیر ہے کہ موجودہ ثقافتی صورتحال اور علوم اور آرٹ کو نصف صدی قبل کی جدید صورت حال سے ممیز کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔ مگر جو لوگ ابھی جدیدیت یا جدید صورت حال کا فہم کامل نہیں رکھتے، انہیں مابعد جدیدیت کی ثقافتی لرزشوں اور فکری انقلابات کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے میں دقت بہر حال ہو گی۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مابعد جدیدیت، اپنی اصل میں تو مغربی مظہر (Phenomenon) ہے۔ مگر چوں کہ بیشتر دنیا مغرب سے براہ راست متاثر یا بالواسطہ منسلک ہے، اس لیے اس مفہوم میں مابعد جدیدیت عالمی صورت حال بھی ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ مغرب (اور مغرب میں یورپ اور امریکا) میں اور دنیا کے دوسرے ممالک میں مابعد جدید صورت حال یکساں نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت بیک وقت صورتِ حال اور تھیوری بلکہ اینٹی تھیوری بھی ہے اور ان دونوں کے باہم ربط سے عبارت بھی۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صورت حال سے مراد 20 ویں صدی کے آخری حصے کی مجموعی ثقافتی صورتحال ہے اور تھیوری سے مراد وہ فکر ہے جو جدیدیت اور فرانس میں 1968ء میں طلبا کی بغاوت کے بعد سامنے آئی۔ روشن خیالی پر مبنی جدیدیت کے یورپی پروجیکٹ پر شبہات کا اظہار بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہی کیا جانے لگا تھا یوں مابعد جدیدیت کی فکر ساٹھ کے عشرے میں متشکل ہونے لگی تھی۔ تاہم مغربی جامعات کے مطالعے کا موضوع یہ اسی کی دہائی میں بنی۔ اردو میں مابعد جدیدیت پر بحث و تمحیص بیسویں صدی کے آخری عشرے میں شروع ہوئی جو تا حال جاری ہے۔'' (29)

مابعد جدیدیت میں مہابیانیہ کا انکار، دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ، سچائی کی اضافیت، ردِ تشکیل کثرت، تعدد، تنوع اور لامرکزیت کے نظریات در آنے میں جن عوامل نے اہم کردار ادا کیا

ہے ان ہی سے کچھ کا تذکرہ لیوٹارڈ کے حوالے سے ہم پیچھے کر آئے ہیں۔مزید کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

الف۔میڈیا(Media):

پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا موجودہ عہد کی مرکزی قوت ہے جو تعداد کے اعتبار سے ہی غیر معمولی نہیں، اثر کے لحاظ سے بھی فقید المثال ہے۔میڈیا متعدد اور متنوع مقاصد کے لیے سرگرم عمل ہے۔معلومات، تعلیم، تفریح، پروپیگنڈہ، تبلیغ وغیرہ کے لیے بلکہ اب تو محض معلومات کا تصور بھی نہیں رہا معلومات (خبروں) کے ساتھ تفریح کو شامل کر کے ایک نئی اصطلاح(Infotainment)وضع کر لی گئی ہے۔مابعد جدید ذہنیت Infotainment سے لطف اندوز ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ افغانستان، فلسطین، پاکستان، عراق یا دنیا کے دیگر کمزور اور غریب ممالک پر امریکی واتحادی افواج کی بربریت کے مظالم مغربی اقوام حظ نفس کے لیے دیکھتی ہیں اور انسانوں کے چیتھڑے ان کے لیے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔بات ہو رہی تھی میڈیا کے مقاصد کی! چونکہ کوئی انسانی عمل خالی از قدر یا Value free نہیں ہوتا، اس لیے میڈیا کے ان مقاصد کے پس پردہ بعض ''ان کہے'' مقاصد یقیناً کارفرما ہوتے ہیں۔اطلاعات اور تعلیم کے پس پردہ آئیڈیالوجی کی ترویج اور ترسیل کا مقصد ہو سکتا ہے اور تفریح کے نقاب میں اپنی ثقافت واقتدار کا فروغ اور کاروباری عزائم کارفرما ہو سکتے ہیں۔علاوہ ازیں آج جس عالمگیریت (Globalization) کا چرچا ہے، اس کا تصور میڈیا نے ہی پیدا کیا ہے۔میڈیا نے زمان ومکان کے پرانے خیالات اور تجربات کو ہی بدل ڈالا ہے۔

میڈیا کے ذریعے مورتوں(Images) کی کثرت اور فوٹو کی فوٹو یا نقل در نقل (Copy to Copy) کے عمل نے دنیا کے غیر حقیقی ہونے کے نظریہ کو عام کیا ہے۔میڈیا ہی کے Talk Shows نے نظریات وآرا کی تکثیریت کو عام کیا ہے۔نیز میڈیا حقیقت کے سطحی، عارضی اور اضافی ہونے پر بھی زور دیتا ہے۔مابعد جدید فکر کا اصرار بھی دال (Signifier) پر ہے، مدلول (Signified) پر نہیں۔دال(Signifier)میڈیا جو بیّن(Clear and Present)سامنے اور حسی ہے، میڈیا کے امیج کی طرح۔

مشینوں کی تصغیریت (Miniaturization) اور ادغام (Submersion) کو بھی میڈیا کے انقلاب اور توسیع میں شمار کرنا چاہیے۔ گھڑی جب ایجاد ہوئی تھی تو اتنی بڑی تھی کہ ایک درجن آدمی مل کر اٹھاتے تھے اور اب لوگوں کے Stud پر بھی گھڑی ہوتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ٹیلی فون سیٹ تار سے منسلک تھا۔ اب انسانی ہتھیلی سے چار گنا چھوٹے سائز کے موبائل فون آگئے ہیں جن میں ٹی وی، انٹرنیٹ، کلاک، کیلکولیٹر، میموری کارڈ، کیمرہ، موودی میکر اور بے شمار Function ہوتے ہیں۔ جس نے ہم مشرق کے مسکینوں کو حیران کر دیا ہے لیکن مغرب سے درآمدہ یہ مشینری محض افادیت مہیا نہیں کرتی بلکہ اپنے ساتھ اثرات بد (Side effects) بھی لاتی ہے۔ قبرستان سے لے کر مسجد تک ہر جگہ فون کی گھنٹی موسیقی کی ملعون صدا کے ساتھ بجتی ہے اور ہمارے سادہ لوح اور احمق عوام بڑے شوق سے بے ہودہ گانوں کی Tone پر بیل سیٹ رکھتے ہیں۔

انٹرنیٹ بھی میڈیا کی توسیع شدہ صورت ہے جس نے زمان و مکان کے فاصلوں کے روایتی تصور کو تہ و بالا کر دیا ہے اور ابلاغ و رابطے اور خیالات و معلومات کی ترسیل کے عمومی طریقوں کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ اس انقلاب کے غیر معمولی اثرات تجارت، تعلیم، مذہب، ثقافت، ادب، آرٹ، شخصی روابط، تفریح اور باقی تمام شعبوں میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انٹرنیٹ نے جغرافیائی، نظریاتی، ثقافتی اور سیاسی سرحدوں کو چیلنج بھی کیا ہے اور ملٹی کلچرل سماج کا تصور ابھارا ہے۔ متعدد اخلاقی اور مذہبی امتناعات (Taboos) اس الیکٹرونی انقلاب کی زد پر ہیں۔۔۔۔ اس ساری صورتحال کا ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ معروضی اور موضوعی، خارجی اور تخیل، الوہی اور الہامی (مابعد الطبیعیاتی) حقیقت کی جگہ ایک نئی حقیقت (Hyperreality) نے لے لی ہے۔ ''عکسی، تصویری حقیقت جس کا کوئی ایک متن ہے نہ کوئی بنیادی کاپی (Master print)۔ جس کی سب کاپیاں بیک وقت بنیادی کاپیاں بھی ہیں اور مثنیٰ (Duplicate) بھی۔ یعنی یہ ''حقیقت'' لامرکز ہے جس کے حصار میں مابعد جدید انسان رہ رہا ہے اور جس کی رو سے اپنا تصور ذات قائم کرنے پر مائل ہے۔ چنانچہ اس کا واضح اثر یہ ہے کہ جو سطحیت میڈیا کے امیج میں ہے وہی انسان کے تصور ذات میں پیدا ہو چکی ہے۔

ب۔ میٹروپولس (Metropolis):

بڑے شہر مسلسل پھیل رہے ہیں، اس لیے کہ تعلیم، روزگار اور شہری آسائشوں کی کشش کی وجہ سے ایک بڑی انسانی آبادی شہروں کی طرف مسلسل اُمڈی چلی آرہی ہے، یہ آبادی مختلف ثقافتی اور فکری پس منظر کی حامل ہوتی ہے۔ جس سے شہر میں ثقافتی اور فکری مرکزیت پیدا نہیں ہوتی۔ شہر کا استحکام ثقافت وفکر سے زیادہ انتظامی اور معاشی عوامل پر ہوتا ہے۔ شہروں میں ہونے والی بیش تر ثقافتی سرگرمیاں معاشی مقاصد کی حامل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثقافت سے محض مراد ناچ گانے اور بھانڈ میراثیوں کی حرکتیں ہوتی ہیں جسے مہذب سوسائٹی آرٹ کا نام دیتی ہے۔ اسلامی تناظر میں اگر بات کی جائے تو مسلم امہ کی ابتدائی تاریخ اور خلفائے راشدین کے عہد سے ہی دعوت وارشاد کا باقاعدہ محکمہ ہوتا تھا اور اسلامی حکومتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام سرکاری سطح پر کرتی تھیں۔ نیتجتاً مسلمان کاشغر سے لے کر نیل کے ساحل تک ایک ہی ثقافت اور تہذیب وتمدن کا مظاہرہ کرتے تھے، مقامی ثقافتیں دب گئیں۔ لیکن جب ملوکیت اور اقتدار کے بھوکے حکمران قوم پر مسلط ہو گئے تو انہوں نے عوام کو محض ٹیکس جمع کرنے کا وسیلہ سمجھا اور ان کی دینی تعلیم سے بے پرواہ ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی ثقافتیں اور رسوم رواج جو شریعت اسلامیہ کی تعلیمات کے منافی تھے پنپنے لگے۔

چونکہ بڑے شہروں میں مقامی اور عالمی مہاجرین کثرت سے ہوتے ہیں، اس لیے ہر شہر بالائی سطح پر بین الاقوامیت کا شائبہ ابھارتا ہے، مگر زیریں سطحوں پر ہر بڑے شہر میں چھوٹے چھوٹے نسلی، وطنی، مذہبی، لسانی اور قومیتی گروہ وجود رکھتے اور سرگرم ہوتے ہیں جس سے ان بڑے شہروں میں جڑوں کی تلاش ایک اہم رجحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شہر کی کاروباری ذہنیت اگر شہر کو Dehumanize کرتی ہے تو جڑوں کی تلاش اسے انسانی سطح سے مربوط کیے رکھتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت میں یہ دونوں متضاد عناصر یعنی (Dehumanization) اور ماضی کی بازیافت جسے روایت پسندی، بنیاد پرستی، قدامت پسندی یا مذہبیت کے مختلف نام دیے جاتے ہیں۔ موجود ہیں۔ نسلی اور مذہبی احیا پسندی کو اسلامی تناظر میں مغرب مختلف ناموں سے یاد کرتا ہے اور آج کل مذہبی دہشت گردی یا اسلامی دہشت گردی کو مسلم امہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسے بھی مابعد جدیدیت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مذہبی بنیاد پرستی بھی دراصل جدیدیت

اور مابعد جدیدیت کے جبر کا نتیجہ ہے یعنی مغرب کا یہ ایجنڈا ہے کہ مذہب اور مذہبی روایات کو اتنا بے وقعت کر دیا جائے کہ لوگ مذہب کے نام سے شرمانے لگیں۔ اگر امریکہ، اتحادی افواج اور اسرائیل مسلمانوں کی بستیاں اور شہر Pre emptive war کے نام پر صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور Thermoberick اور کئی ہزار من وزنی Daisy Cutter بم برسائیں تو اسے کوئی ریاستی دہشت گردی تسلیم نہ کرے اور اگر نہتے فلسطینی دشمنوں کے ٹینکوں پر غلیل سے پتھر برسائیں یا مجبور ہو کر خود کش حملہ کریں تو یہ دہشت گردی ہے۔ اگر ڈرون حملے کر کے امریکہ روزانہ مسلمانوں کے چیتھڑے فضا میں بکھیر دے تو اسے کوئی فورم، قوم، میڈیا یا مفکر Condemn نہ کرے۔ لیکن اس بات پر کوئی غور کرنے کو تیار نہ ہو کہ حالات کا وہ کونسا جبر تھا جس نے کسی انسان کو اپنی اور دوسروں کی جان لینے پر مجبور کر دیا۔ بہر حال مابعد جدید مفکرین کے نزدیک اسلامی بنیاد پرستی اصل میں اپنی جڑوں سے جڑ کر رہنے کی ہی کوشش ہے جو عالمی مرکزیت کے اس تصور کو چیلنج کرتی ہے۔ جو جدیدیت کا ایجنڈا تھا۔

ج۔ صارفیت کا کلچر (Consumer Culture):

صارفیت کا براہ راست تعلق صنعتی عہد اور سرمایہ داری سے ہے۔ صنعتی عہد کی پہلی صدی کا فکری رشتہ جدیدیت سے ہے۔ صنعتی عہد اور صارفیت کے کلچر میں تاہم فرق بھی ہے کہ اول الذکر اشیا کی پیداوار پر، جبکہ آخر الذکر اشیا کے صَرف (Consumption) پر زور دیتا ہے۔ شے بجائے خود اہم نہیں رہی۔ اس کی اہمیت اس کے صَرف اور معاشی قدر کے وسیلے سے ہے۔ صارفیت کے کلچر نے ہر شے کو برائے تجارت شے (Commodity) میں بدل دیا ہے۔ ہر قدر، رویے، نظریے، پیشے، شخص۔۔۔ سب پر 'برائے فروخت' لکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے جذبات تک، کمرشل (Commercial) ہو گئے ہیں۔ لہٰذا صارفیت کے کلچر نے بھی انسانی معاشرے کو Dehumanize کیا ہے۔

د۔ عالمی گاؤں اور عالمگیریت (Global village and Globalization):

گلوبل ویلج کی اصطلاح دراصل مارشل مک لوہن (Marshall McLuhan) کی اختراع ہے۔ مارشل کے خیال کے مطابق الیکٹرونک ذرائع ابلاغ، خاص طور پر سٹیلائٹ، ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ کے استعمال کے نتیجے میں دنیا میں آباد مختلف سیاسی، ثقافتی اور مذہبی پس منظر رکھنے

والے لوگ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ ان ایجادات کے نتیجے میں زمان ومکان کے سارے فرق بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ دور دراز بسنے والے لوگوں کیلئے فاصلوں کی دوری اور ٹائم کے فرق کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ کرہ ارض پر لوگ ایک گاؤں کے مکینوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ مختلف ثقافتوں میں قربت بڑھ گئی ہے اور دنیا ایک ہی سماجی ڈھانچے یعنی گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ مغربی دنیا نے گلوبل ویلیج کی اصطلاح کو رواج دیا ہے۔ گلوبل سٹی (Global city) کیوں نہیں؟ سوچنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کے معاشرہ میں ایک چوہدری ہوتا ہے جو سب گاؤں والوں کی تقدیر کا مالک ہوتا ہے۔ سب اس کے دست نگر اور رعایا ہوتے ہیں اس کا حکم حرف آخر ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا ایک گاؤں ہے جس کا چوہدری امریکہ ہے اور اس کے حکم اور عمل کے خلاف شنوائی دنیا کی کسی عدالت میں نہیں۔ تہذیب سے قبل کے دور میں گاؤں کا تصور تھا۔ اب شہروں میں ایک شخص اپنی چودھراہٹ قائم نہیں کر سکتا۔ اور دادا گیری اور غنڈہ گردی کے خلاف کارروائی بھی ہوسکتی ہے اسی لیے تو امریکہ بہادر اپنا ساتھ نہ دینے والوں کو پتھر کے دور میں دھکیلنے کی دھمکی دیتا ہے وہ ساری دنیا کو اپنی چراگاہ سمجھتا ہے اور ایک گاؤں!

دوسری بات یہ ہے کہ مارشل اگر ایسا سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آچکے ہیں اور زمان ومکان کا فرق مٹ گیا ہے تو یہ بات جزوی طور پر درست ہے کلی طور پر نہیں۔ یورپ یا امریکہ کے کسی شہری کی ہتھیلی میں اگر Mini computer ہے اور وہ Google Earth یا Global Positioning System (GPS) کے ذریعے دنیا کے کسی بھی مقام کی Location کا ٹھیک ٹھیک معائنہ کرسکتا ہے تو دوسری طرف تیسری دنیا کے ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کے شہری آج بھی صاف پانی اور بجلی کی سہولیات سے محروم ہیں۔ ہم اپنے اردگرد دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں آج بھی لوگ سائیکل بغیر بریک کے استعمال کرتے ہیں اور اسے روکنے کے لیے پاؤں اٹھا کر اگلے ٹائر کو دبا کر بریکیں لگاتے ہیں اسی قدیم دور کی طرح جب سائیکل ایجاد ہوئی تھی۔ مغرب میں Cloning اور DNA ٹیسٹ کی باتیں ہو رہی ہیں اور ادھر آج بھی کوئلوں پر ننگے پاؤں چل کر بے گناہی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں مسلسل ترقی نے دنیا کے ممالک کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھا دیا ہے جو سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی بھی ہے۔ جدید سائنسی طریقہ پیداوار کی وجہ سے دنیا کے مجموعی فی کس پیداوار (Percapita Gross Domestic Production) میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔(30)

اس تیز رفتار اقتصادی ترقی سے مستفید ہونے کے لیے اکثر ممالک نے اپنے کاروباری اور مالی ضابطوں میں نرمی کی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ جس کے نتیجے میں دنیا میں آزادانہ تجارت کو فروغ ملنے لگا ہے۔ اس آزادانہ تجارتی ماحول نے دنیا کے بیشتر ممالک کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھا دیا ہے۔ دنیا کے ممالک کی آپس میں بڑھتی ہوئی اقتصادی قربت اور انحصار نے ان کے درمیان سیاسی اور ثقافتی تعلقات میں بہتری پیدا کی ہے۔ اقتصادیات، ثقافت اور سیاست میں بڑھتی ہوئی قربت کے پیش نظر سماجی علوم کے ماہرین دنیا کو ایک گاؤں سے تشبیہ دینے لگے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات نے جہاں انسانی سماج کے دوسرے شعبوں پر اثرات مرتب کیے ہیں، وہاں مروجہ سیاسی نظاموں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کے خلاف دنیا میں سوشلسٹ تحریکوں نے جنم لیا۔ جبکہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے لیے قومی حق خود اختیاری کی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ نیز سوویت یونین کے ٹوٹنے کے نتیجے میں دو عظیم طاقتوں پر مبنی بین الاقوامی نظام اختتام پذیر ہوا اور امریکہ دنیا کی واحد عظیم طاقت (Super Power) بن کر نمودار ہوا۔

دنیا میں اپنی اس برتری والی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے امریکہ نے ایک نیا عالمی نظام (New world order) متعارف کروانے کی کوشش کی، جس کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

- ☆ امریکہ کی برتری کو قائم رکھنا۔
- ☆ امریکی و مغربی افکار اور کلچر کو دنیا میں غالب کرنا۔
- ☆ قوموں کے درمیان تنازعات کو اقوام متحدہ کے ذریعے حل کروانا۔
- ☆ دنیا میں جمہوریت، آزادی، انسانی حقوق اور آزاد معیشت کو فروغ دینا۔(31)

عالمی نظام کے ان اقدار نے دنیا کو بین الاقوامی ایجنڈا کے تابع کر دیا۔اب قومی سلامتی کے مسائل بین الاقوامی سلامتی سے منسلک ہو کر رہ گئے۔ اس صورتحال نے چھوٹی قومی ریاستوں اور معاشروں بشمول مسلم امہ کے لیے نئے چیلنجز پیدا کر دیئے۔گلوبلائزیشن کی چھتری تلے امریکی دیورپی ثقافت کو فروغ دینے کا یک طرفہ پروگرام جاری ہے۔دنیا کی کثیر الثقافتی پہچان ختم ہوتی جارہی ہے اور دنیا پر یورپی امریکی ثقافتی اثر ورسوخ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔اس یک طرفہ ثقافتی ریلے نے دنیا کے امیر اور غریب ملکوں کے درمیان ثقافتی ناہمواری پیدا کر دیتی ہے۔ امیر اور غریب ملکوں کے طرز زندگی میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اس بات کو بعض انصاف پسند مغربی مفکرین نے بھی محسوس کیا ہے۔ان میں ایک نمایاں نام پروفیسر نوم چومسکی (Noam Chomsky) کا ہے(جن کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا)۔ یہ لوگ گلوبلائزیشن مخالف تحریک چلا رہے ہیں اور اپنی تحریک کو عالمی انصاف کی تحریک (Global Justice Movement) کہلوانا پسند کرتے ہیں۔گلوبلائزیشن مخالف تحریک سے وابستہ لوگ کلی طور پر گلوبلائزیشن کے عمل کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ گلوبلائزیشن کی ان پالیسیوں کے مخالف ہیں جن کے نتیجے میں:

- ☆ سرمایہ دار ممالک غریب ملکوں کا معاشی استحصال کرتے ہیں۔
- ☆ دنیا میں ماحولیاتی مسائل پیدا کرتے ہیں۔
- ☆ ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ پر ضرب لگتی ہے۔
- ☆ انسانی حقوق سلب ہوتے ہیں۔
- ☆ لوگوں سے نقل مکانی کا حق چھینا جاتا ہے۔
- ☆ دنیا کی کثیر الثقافتی شناخت کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔(32)

و۔کمیونزم کی ناکامی (Fall of Communism):

کمیونزم سے مراد ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں ملکیت خصوصاً جائیداد غیر منقولہ اور صنعتی ادارے مشترکہ عوامی ملکیت سمجھے جاتے ہیں اس کا اردو مترادف اشتمالیت ہے۔اشتمالیت کا تصور خاصا قدیم ہے بعض قدیم معاشرے مثلاً اہل میکسیکو اور قدیم جرمنی نوعیت کے اعتبار سے کمیونسٹ تھے اور افلاطون کی کتاب 'جمہوریت' (Republic) میں بھی اشتمالی معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا

ہے۔ سر ٹامس مور (Sir Thomas More) نے اپنی کتاب یوٹوپیا (Utopia 1516) میں بھی اس کا خاکہ پیش کیا ہے۔ مگر جن معنوں میں آج کل کیمونزم کا تصور قائم ہے اس کی ترویج 1848ء میں کارل مارکس کے اشتمالی منشور (Communist Manifesto) اور فریڈرک انجلز کی تحریروں سے ہوئی۔ مزدوروں کی پہلی انٹرنیشنل انجمن فرانس کے قیام اور یورپ میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے عروج سے مارکسی اشتمالیت کو پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔ 1903ء میں اس وقت کیمونزم کے خدوخال زیادہ نمایاں ہوئے جب لینن کے زیر قیادت شدید اور فوری انقلاب پر زور دیا گیا جس کا مقصد سرمایہ داری کو ختم کر کے عالمگیر اشتمالی ریاست کا قیام تھا۔ 1917ء کے روسی انقلاب میں بالشویک برسر اقتدار آئے۔ 1924ء میں لینن کی وفات کے بعد سٹالن اور ٹراٹسکی کے مابین اقتدار کی جنگ شروع ہوئی تو ٹراٹسکی کی جلاوطنی اور موت سٹالن کے لیے فتح مندی کا پیغام لائی۔ اس نے روس کو عالمی اشتمالیت کا نمونہ اور مرکز بنا کر پیش کیا۔ 1905ء سے دنیا دو بلاکوں جمہوری نظام اور کیمونسٹ نظام میں منقسم ہو چکی تھی۔ کیمونسٹ نظام نے اگرچہ روس میں قدم جمائے تھے لیکن یہ جلد ہی چین، ویت نام اور مشرقی یورپ (البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، یوگوسلادیہ، ہنگری، رومانیہ اور پولینڈ کے علاوہ کئی اسلامی ممالک میں بھی پھیل گیا۔ یہ نظام تقریباً 75 برسوں پر محیط تھا۔

اشتراکی روس نے ایک طویل مدت تک اپنے نظریات برآمد کر کے سرمایہ دار اقوام کو خوف میں مبتلا رکھا اور ان کے اقتصادی مفادات پر ضربِ کاری لگانے کے لیے مختلف ممالک میں اشتراکی جماعتوں کے ذریعے گوریلا جنگ اور تخریب کاری کا بازار گرم رکھا۔ اتفاق سے قوت اور کامیابی کے نشے میں دھت سوویت روس اپنے ہی دام میں اس طرح الجھا کہ اس کی عظیم قوت اور سلطنت ریزہ ریزہ ہو گئی۔ جب روس افغانستان میں اپنے پنجے گاڑ چکا تھا تو یہ کہا گیا کہ روس ایک ایسا ہاتھی ہے کہ جہاں وہ اپنے قدم جماتا ہے وہاں سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں بہت سی سلطنتیں اقتصادی کساد بازاری کا شکار ہو کر اپنے مقبوضات چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ لیکن مجاہدین کے ہاتھوں اور جہاد فی سبیل اللہ کی برکت سے جو پسپائی، ہزیمت اور ذلت سوویت یونین کی قسمت میں لکھی تھی، نہ صرف یہ کہ اس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ اس کے سبب کیمونزم کے فلسفے کی بساط ہمیشہ کے لیے لپیٹ دی گئی۔ مارکسی مفکرین پر کیمونزم کے سقوط کا شدید اثر پڑا۔ مابعد جدید مفکرین کے ہاں یہ مقولہ بہت مشہور ہوا:

"If Marx is not true then nothing is." (33)

یہ ساری صورتحال norm کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ اس لیے اس نے مابعد جدید انسان کے طرز زادراک پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ کائنات، معاشرہ، مذہب، خالق اور مخلوق اور خود اپنی ذات کے تصور اور اس سے انسان کے رشتے کی فلاسفی کو تبدیل کیا ہے۔ مابعد جدیدیت سے وابستہ تھیوری سے مراد وہ سب نظریات ہیں جو جدیدیت کے بعد رونما ہوئے ہیں، تاہم یہ سوال بحث طلب اور وجہ نزاع ہے کہ آیا مابعد جدیدیت نے جدیدیت کے بطن سے جنم لیا ہے یا جدیدیت کی راکھ سے؟ مابعد جدیدیت، جدیدیت کی توسیع و تقلیب ہے یا جدیدیت کے یکسر استرداد اور کامل انہدام کا نتیجہ؟ یہاں ایک بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ جدیدیت کے بعد جو کچھ رونما ہوا ہے، وہ سارے کا سارا مابعد جدید قرار نہیں پا سکتا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مابعد جدید فکر، جدیدیت اور ساختیات (Structuralism) (جسے High Modernism بھی کہا گیا ہے) کو معرض تنقید میں لانے اور ان کے داخلی تضادات کا پردہ چاک کرنے کے نتیجہ میں عمل میں آئی ہے اور یوں جدیدیت سے مابعد جدیدیت کے تعلق کی اولین سطح بھی سمجھ میں آتی ہے۔

مابعد جدیدیت کا جدیدیت سے زمانی اور فکری تعلق ہے۔ یہ بیک وقت جدیدیت کے تاریخی تناظر سے منسلک اور جدیدیت کی آلائشوں کی نقاد ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جدیدیت کے دو رخ ہیں۔ ایک جدیدیت بطور جمالیاتی تحریک (Modernism) دوسرا جدیدیت بطور ایک ہمہ گیر فکری تحریک (Modernity)۔ مابعد جدیدیت، جدیدیت کے ان دونوں رخوں پر جرح و نقد کرتی اور اس کے بعض اصولوں کو لے کر آگے بھی چلتی ہے۔ مثلاً جدیدیت کے اہم اوصاف یہ ہیں:

خود شعوری اور خود آگہی (Self reflexivity) کا رجحان روایتی جمالیات کا استرداد، تجربہ پسندی، تاریخی عدم تسلسل فوق (High) اور پست (Low) کے امتیاز کا خاتمہ۔ ان میں سے بیشتر اوصاف مابعد جدیدیت میں بھی ہیں۔ اس سے اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے مابعد جدیدیت، جدیدیت ہی کا ایک نیا روپ یا جدیدیت کی توسیع ہے۔ مگر یہ مماثلت صرف ظاہری ہے۔ ان عناصر کے سلسلے میں دونوں کے رویے اور بنیادیں بالکل مختلف ہیں۔ جدیدیت میں یہ باتیں زیادہ تر فرائیڈین نفسیات اور وجودیت کی راہ سے آئی ہیں اور ان کا مقصد اس کرب، تنہائی، بے بسی، اجنبیت اور داخلی شکست و ریخت کو پیش کرنا ہے جسے جدید انسان نے اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ جدیدیت

نے دنیا کا ایک یوٹوپین تصور پیش کیا تھا، مگر جب جدید انسان نے دیکھا کہ دنیا اس تصور سے کس قدر مختلف ہے تو وہ کرب اور شکست و ریخت سے گزرا، اپنی اور دنیا کی نفی پر مائل ہوا۔ بغاوت و استرداد پر اتر آیا۔ مابعد جدید رویے کی تشکیل موجودہ انسانی اور ثقافتی صورت حال نے کی ہے جو سطحیت (Super ficiality) کو عزیز رکھتی ہے اور جس میں صارفیت کے کلچر، میڈیا کے عدیم النظیر اثر و رسوخ، تفریح پسندی، سہل انگاری، لگژریز کی دوڑ، مرتبے (Status) کا حصول وغیرہ نے انسان سے اس کے عظیم روحانی اور تخلیقی آئیڈیلز (Ideals) چھین لیے ہیں۔ مابعد جدیدیت اپنے نقطہ نظر کی توثیق موجودہ ثقافتی حالات میں بھی کرتی ہے۔ مابعد جدید فکر کے عناصر ہیں:

> "Postmodern art and thought favours reflexivity and self-consciousness, fragmentation and discontinuity, especially in narrative structure ambiguity, simultaneity and an emphasis on the destructed, decentred, dehumanized subject.(34)

مابعد جدید فکر کے خود شعوریت، تقسیم، عدم تسلسل، لامرکزیت پر اصرار اور مہابیانیہ پر عدم اطمینان، رد تشکیل اور غیر انسانی رویوں پر زور (emphasis) کا سبب وہ تصور ہے جو انسان کو بے مقصدیت، علوم وحی پر بے یقینی اور عدم اطمینان کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ ہر قسم کی مرکزیت، اجتماعیت اور مابعد الطبیعیات کا رد ہے۔ مابعد جدیدیت جب فوق اور پست کے امتیاز کو پس پشت ڈالتی ہے تو اس کا باعث یہ بھی ہے کہ یہ ہر چیز (نظریہ، عقیدہ، رسم و رواج، تصور عبادت وغیرہ) کو یکساں طور پر ثقافتی تشکیل گردانتی ہے۔ مابعد جدید فکر کی رو سے ہر شے کا "معنی تشکیل پاتا" ہے، فکر اور زبان کے روایتی / کنونشنل فریم ورک سے (From the conventional framework of thought and language) (35)۔ چنانچہ مابعد جدیت کی مطالعاتی نہج (Paradigm) میں دیوانِ غالب اور ایک کمرشل اشتہار کا مرتبہ یکساں ہے کہ دونوں میں یکساں طور پر ثقافتی ضابطوں، کنونشنز اور سماجی تناظر کو نشان زد کیا جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کا ادب پارہ اور ایک معمولی اشتہار ایسے متن ہیں جو ثقافتی عمل کے زائیدہ اور سماجی عوامل کے علم بردار ہیں۔ مابعد جدیدیت کا اگر صارفیت کے ذہن (Consumer Mentality) کے حوالہ سے جائزہ لیا جائے تو مسلم معاشروں اور مسلم (Media Tycoons) کی اس سوچ کی تفہیم

بھی ہو جاتی ہے کہ وہ ایسی اشیا کی تجارت کیوں کرتے ہیں جو معاشرے کی اقدار کے منافی اور سم قاتل ہیں؟ تو جواب ظاہر ہے کہ اگر سوپ اوپیرا(Soap opera) ڈراموں کو کمرشل اشتہار زیادہ ملتے ہیں تو اسلامی تعلیمات پر مبنی پروگرام کیوں اپنے نجی ٹی وی چینل پر کوئی دکھائے؟ اگر فحش ناول کی مانگ زیادہ ہے تو قرآن کی پرنٹنگ کیوں کی جائے؟ ظاہر ہے تاجر کو اپنے منافع سے غرض ہے اور وہ اپنے منافع اور عوام کی پسند کو مدنظر رکھ کر ہی اشیاء کو برائے فروخت پیش کرے گا۔

جدیدیت(Modernism) دراصل یورپی پروجیکٹ تھا، جس کے مرکزی اصولوں / سروکاروں (Concerns) کی آبیاری انسانیت پرستی (Humanism) اور روشن خیالی (Enlightenment) کی تحریک نے کی تھی۔ ہیومنزم نے انسانی ذات(Self) کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو شعور رکھتا ہے، خودکار اور آفاقی ہے۔ قیدِ زمان ومکان سے ماوراہے۔ یہ ذات (Self) خود کو اور دنیا کو عقل اور استدلال کے ذریعے سمجھتی ہے۔ عقل اور معروضیت کو سب سے بڑی سچائی کا درجہ دیتی ہے۔ ہیومنزم کی اسی عقلیت پرستی کی وجہ سے سائنس (بطور رویّہ، عقیدہ) نے جنم لیا اور سمجھا گیا کہ سائنس ایسی صداقتوں کو پیش کرتی ہے جو زمان ومکان کی تبدیلی سے نہیں بدلتی ہیں اور جو اس سے پہلے مذہب اور الہامی علوم کا خاصہ سمجھی جاتی تھیں۔ نیز سمجھا گیا کہ سائنسی علم ہمیشہ ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ اب مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سائنس اور مذہب کے تصادم نے اس میں مزید شدت پیدا کردی۔ مسیحیت میں مذہب کے نام پر جو کچھ پیش کیا جاتا تھا وہ جدید تجربی سائنس کا ساتھ نہ دے سکا۔ وجہ ظاہر ہے کہ انسانی کاوشوں کو مذہب میں داخل کر کے تقدس کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ سائنس دانوں پر مذہبی کلیسا کے جبر واستبداد نے صورت حال کو مزید بگاڑ دیا۔ مذہب کی جگہ جب سائنس نے لے لی تو سائنس کو بھی تقدیس کے اس سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا جو کبھی مذہب کا مقام تھا۔ یہ دوسری غلطی تھی۔۔۔ اگر انسانی علوم کو خدا کے کلام کے طور پر پیش کرنا غلط تھا تو سائنس کو اس کی حدود سے تجاوز کر کے الوہیت کے درجہ پر فائز کرنا کونسی عقل مندی تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے سائنس کے وہ دعوے جو کبھی پورے نہ ہو سکے یا اس سے جو توقعات وابستہ کر لی گئیں تھیں جب وہ پوری نہ ہوئیں تو سائنس کا قصرِ عظیم بھی زمین بوس ہو گیا۔ مابعد جدیت کے آغاز کا سب سے پہلا Predicament یہی تھا کہ کیا روشن خیالی پروجیکٹ ناکام ہو گیا؟" Has the Enlightenment project failed? ڈاکٹر گوپی چند لکھتے ہیں:

''کیا روشن خیالی پروجیکٹ جو کلچرل موڈرن ازم کا حصہ تھا ہمیشہ کے لیے دم توڑ چکا یا اس میں کچھ جان باقی ہے؟ یہ پروجیکٹ اٹھارویں صدی کے فلاسفہ کی امید پرور اور حوصلہ مندانہ فکر سے یادگار چلا آتا تھا، جنہوں نے انسان کی ترقی کا خواب دیکھا تھا، اور یہ عبارت تھا سائنس کی معروضی پیش رفت سے، آفاقی اخلاقیات اور قانون کی بالادستی سے توقع تھی کہ فطری اور مادی وسائل پر قدرت حاصل ہوجانے سے ذات اور کائنات کا عرفان بڑھے گا، عدل وانصاف اور اخلاق کا بول بالا ہوگا، امن وامان کا دور دورہ ہوگا اور انسان مسلسل ترقی کرتا جائے گا۔

لیکن روشن خیالی پروجیکٹ کے خوابوں کی جو تعبیر سامنے آئی ہے وہ نہ صرف حوصلہ افزا نہیں بلکہ مایوس کن ہے۔ عملاً سائنسی تکنیکی ترقی اور جدید کاری کے ساتھ دنیا کا جو نقشہ ابھرا، وہ اس کا الٹ ہے جو سوچا گیا تھا۔''(36)

معاشرتی صورت حال ہمارے سامنے ہے۔۔۔ ایک طرف تو یہ حال ہے کہ جس طرح سائنسی ایجادات کے کام سرانجام دیئے جارہے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے، حد تو یہ ہے کہ انسان کی کلوننگ (Cloning) کی جارہی ہے گویا انسان خدا بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ دوسری طرف یہ ہے کہ بظاہر آسائشوں اور ساز وسامان سے بھرپور زندگی اندر سے کھوکھلی اور بے تہہ ہو چکی ہے فوری نتائج، کامیابی، منافع خوری، اقتدار کی ہوس سب پر طاری ہے۔ خوشی اور مسرت منڈی کا مال ہیں اور ہر شے کمرشل رنگ میں رنگ کر اپنی اصلیت سے محروم ہوگئی ہے۔

جبکہ سائنس کے ساتھ ساتھ عقلیت، ترقی، کلیت اور آفاقیت کے ستونوں پر جدیدیت کا قصر استوار کیا گیا تھا۔ اس قصر کے اندر انسانیت سے متعلق بڑے بڑے خواب دیکھے گئے اور عظیم آدرش اس قصر کی دیواروں پر منقش کیے گئے۔ یہ خیال عام ہوا کہ جدیدیت تمام انسانیت کی ترقی، فلاح، خوشحالی اور نجات کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اور انسانیت کو توہم (مذہب پرستی) جہالت اور بے بسی سے نجات دلا سکتی ہے۔ جس میں ماضی کا انسان گرفتار تھا۔ جدیدیت نے ماضی اور روایت کے انہدام کا رویہ اپنایا۔ پرانی بستیوں کو مسمار کر کے نئے پرشکوہ قصر کی تعمیر کی۔ جدیدیت کے اس پروجیکٹ کیلئے یورپ نے نو آبادیاتی ممالک کو اپنی تجربہ گاہ بنایا۔ جدیدیت کے خلاف آواز بھی انھی ممالک کے حوالے سے اٹھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی ممالک میں یہ احساس شدت سے ابھرا کہ یورپ نے انسانیت سے متعلق تصورات کی تشکیل میں یک رُخا اور آمرانہ رویہ اپنایا ہے

۔ان کی ثقافتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ثقافتی بشریات کے ماہر فرانز بواس (Franz Boas) نے (جو جرمن مثالیت پسندی سے متاثر تھا) جو اس ضمن میں ثقافتی امتیازات، ثقافتی کثرت اور تنوع پر زور دیا۔ فلسطینی نژاد امریکی عیسائی سکالر ڈاکٹر ایڈورڈ وادی سعید (Edward w.said) نے "شرق شناسی" (Orientalism) نامی کتاب میں مغربی استعمار کی قلعی جس طرح مدلل انداز میں کھولی ہے اس سے مغرب کے ایوانوں میں لرزش برپا ہوگئی۔ بعدازاں ثقافتی اضافیت کا یہ نظریہ یورپ کی جامعات میں موضوع بحث بنا اور یوں مابعد جدید فکر کے نقوش ابھرنے لگے۔

مابعد جدیدیت، جدیدیت کے خوابوں اور آدرشوں پر شک کا اظہار کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے ان نظریات کو مہابیانیہ (Grand Narratives) کا نام دیا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت نہ صرف جدیدیت کے کسی مہابیانیہ کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے بلکہ کائنات کے کسی بھی Grand Narrative کا ابا (Reject) کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نزدیک یہ مہابیانیے دراصل وہ کہانیاں (Myth) ہیں جو ایک ثقافت (تہذیب، مذہب) میں اس ثقافت کے اعمال اور عقائد سے متعلق سنائی جاتی ہیں۔ ان کا مفہوم کم وبیش وہی ہے جو فوکو (Foucault) کے ہاں Episteme کا ہے۔ مہابیانیہ وہ میٹا آئیڈیالوجی (Meta Ideology) ہے جو آئیڈیالوجی کی شرح کرتی ہے اور آئیڈیالوجی میں معنی پیدا کرتی ہے۔ پچھلے باب میں ہم بالوضاحت بیان کر چکے ہیں کہ جدیدیت کے سائنسی مہابیانیے، چارلس ڈارون، کارل مارکس، سگمنڈ فرائیڈ اور آئن سٹائن وغیرہ نے لکھے۔ ڈارون نے انواع حیوانات، مارکس نے مادی ومعاشی تاریخ، فرائیڈ نے انسانی ذہن اور آئن سٹائن نے کائنات کے مطالعے کی بنیاد رکھی۔ یعنی یہ دعویٰ کیا گیا کہ ان نظریات کی رو سے جملہ انواع، پوری انسانی تاریخ، مکمل انسانی ذہن اور تمام کائنات کو سمجھنا ممکن ہے۔ یہ مہابیانیے جدیدیت کے تصورِ حقیقت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ جدیدیت کی رو سے حقیقت واحد (Singular) آفاقی اور باہر (out there) ہے۔

مابعد جدیدیت ان مہابیانیوں کو چیلنج کرتی اور انہیں معرض سوال میں لاتی ہے۔ ان مہابیانیوں کے سر سے آفاقیت اور کلیت کا تاج اتار پھینکتی ہے اور انہیں Contextualize کرتی ہے۔ یوں مابعد جدیدیت کسی ایک اور مرکزی بیانیے کی بجائے متعدد، متنوع (بلکہ بعض اوقات متضاد) اور منی (Mini) بیانیوں کا تصور پیش کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی بیانیہ حتمی اور مطلق نہیں ہے

ہر بیانیے کی معنویت اس کے مخصوص تناظر کے اندر ہے۔ جدیدیت واحد معنی کی جستجو کرتی ہے لیکن مابعد جدیدیت معنی کی تکثیریت کی قائل ہے۔ اکبر صلاح الدین احمد (Akbar S. Ahmad) کے بقول:

> "In order to discover postmodernism one must look for richness of meaning rather than clarity of meaning; avoid choices between black and white, 'either-or' and accept 'both-and' evoke many level of meaning and combinations of focus, and attempt self discovery through self knowledge." (37)

تمام معانی کی جستجو اور معانی کی 'طبقاتی تقسیم' کے خاتمے کی وجہ سے مابعد جدیدیت ان تمام موضوعات، 'نقطہ ہائے نظر'، اصناف، اشخاص اور سماجی طبقات کو یکساں اہمیت کے ساتھ منظر عام پر لانے میں سرگرم ہوتی ہے۔ ہر قسم اور ہر طرح کی سند (Authority) اور اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کو بالائے طاق رکھتی ہے اور اس کیلئے تمام ممکنہ طریق ہائے مطالعہ کو بروئے کار لاتی ہے اور اس ضمن میں اسفل و افضل (Low and High)، عالم اور جاہل، خواص اور عوام کے امتیاز کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ہم ہر روز ٹی وی ٹاک شوز میں دیکھتے ہیں کہ سود کا مسئلہ ہو یا پردے کا، ٹی وی پروگراموں کے میزبان اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں کہ جہاں ایک عالم دین ہو وہاں دس سیکولر ذہن کے اور علوم شریعہ سے نابلد بلکہ باغی قسم کے بزعم خویش سکالرز بھی موجود ہوں اور دلائل دیتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جدید ذہن اور معاشرے کو زیادہ کونسی بات Appeal کرتی ہے۔ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کیا ہیں۔ سڑک پر چلتے ہوئے ایک عام آدمی کی رائے بھی اتنا ہی وزن رکھتی ہے جتنا وزن کسی عالم دین کے دلائل میں ہوتا ہے۔ دونوں کو برابر اہمیت دی جاتی ہے اور نتیجہ پھر کیا اخذ کیا جاتا ہے محتاج بیان نہیں!

مابعد جدیدیت کی پس منظری فکر وہی ہے جسے پس ساختیات (Post structuralism) نے پیش کیا ہے اور پس ساختیات میں فرانسیسی فلاسفہ دریدا (Derida) اور مشل فوکو (Michel Foucault) کے نظریات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالعموم دریدا کی ردتشکیل (Deconstruction) کو ہی پس ساختیات کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح مابعد ساختیات

اور نتیجتاً مابعد جدیدیت کا جو 'متن' (Text) سامنے آیا ہے، اس میں معانی کا 'التوا' (Difference) افتراق، Instability، کثرت، عدم حتمیت جیسے تصورات تو تواتر کے ساتھ پیش ہوئے ہیں مگر معانی کس طور سماجی اور ثقافتی اعمال کو کنٹرول کرتے ہیں، معنی کسی طرح طاقت کے کھیل میں شریک ہوتا ہے؟ یہ امر مابعد جدیدیت کی بحث میں اکثر آتا ہے۔ یعنی پس ساختیات (پس جدیدیت) یہ نہیں دکھاتی کہ کسی متن میں سماجی اور سیاسی حالات موجود ہیں اور متن اپنے زمانے کا سادہ ترجمان ہے، بلکہ متن کا پس ساختیاتی تجزیہ دکھاتا ہے کہ متن اور اس کے معانی دراصل ایک سماجی تشکیل (Socially constructed) ہیں۔ یوں مابعد جدیدیت، آفاقیت کے بجائے اضافیت، افتراق، التوا اور تکثیریت کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ یعنی مابعد جدید فکر کی رو سے کوئی معنی زبان اور ثقافت کے تناظر سے باہر وجود نہیں رکھتا۔ تناظر کا تفاعل ہی معنی کو وجود میں لاتا ہے۔ تناظر کی تبدیلی سے معنی بدل جاتا ہے۔ یوں کوئی معنی حتمی ہے نہ واحد، نہ مستقل نہ خود مکتفی، اس طور کہ معنی اگر تناظر سے وابستہ ہے تو تناظر بھی خود مکتفی نہیں وہ کسی اور تناظر یا حکمت عملی سے جڑا ہوا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی (Infinite) ہے۔ (کم از کم منطق (Logic) کے اعتبار سے)۔ مابعد جدیدیت سے اسی لیے web کا تصور منسلک ہے۔ اس طرح مابعد جدیدیت کسی متن کو ایک سے زائد طریقوں سے معرض تجزیہ میں لانے کی حامی ہے اور ایک متن کی متعدد تعبیروں کا خیر مقدم کرتی ہے اور کسی تعبیر، کسی معنی کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا سوال تب اٹھتا ہے جب صداقت واحد اور مستقل ہو اور عین یہی رویہ مابعد جدیدیت مذہبی متون (scriptures) مثلاً قرآن، حدیث، بائبل وغیرہ سے بھی روا رکھتی ہے۔ دو تین دہائیاں پیشتر سلمان رشدی کی کتاب Stanic verses کو ذہن میں لائیے۔ سلمان رشدی ملعون نے اسی مابعد جدید ذہنیت (یا اپنے خبث باطن) کا مظاہرہ کیا تھا اور کتاب کے منظر عام آنے کے بعد عالم اسلام میں جو ہلچل برپا ہوئی مغرب اسے سمجھنے سے قاصر رہا۔ مغرب کے ذہن کے مطابق سلمان رشدی کا یہ عمل محض ایک متن (text) کا تجزیہ ہی تو تھا، پھر اس پر اس قدر ہنگامہ کیوں؟ اور آزادی اظہار کے نام پر پچھلے دنوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ختم المرتبت فداہ ابی وامی وروحی کے شر انگیز خاکے بنائے گئے اور پہلے ڈنمارک کے قومی اخبار اور بعد میں یورپ کے متعدد ملکوں میں ان کو کئی بار چھاپا گیا۔۔۔ یہ سب مابعد جدیدیت کے مظاہرے ہی تو ہیں۔

بات ہورہی تھی کہ مابعد جدیدیت کسی متن کو ایک سے زائد طریقوں سے معرض تجزیہ میں لانے کی حامی ہے اور ایک متن کی متعدد تعبیروں کا خیر مقدم کرتی ہے اور کسی تعبیر، کسی معنی کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا سوال تب اٹھتا ہے جب صداقت واحد، مستقل اور باہر (External) ہو جبکہ مابعد جدیدیت کے معانی (منی بیانیے Narratives) ہمیشہ Provisional، Situational، Contingent اور عارضی ہوتے ہیں جنھیں آفاقی صداقت ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں:

> "with postmodernism, truth emerges co-creatively through dialogical interaction truth becomes a variously interpretable phenomenon dependent upon perspectives, intersubjectivities and specifice cultural / historical contexts. The modernist singular and transcendent truth gets recast by postmodernist as multiple, contingent truth." (38)

معلوم ہوا روشن خیالی اور جدیدیت کے بعد جس جدید تر نظریہ زندگی، فلسفہ حیات یا Social theory نے مغربی مفکرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے وہ مابعد جدیدیت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟ کیا کوئی اس کی متعینہ تعریف ہے؟ کیا مابعد جدیدیت کی حدود کی نشاندہی کی جاسکتی ہے؟ یہ کوئی منشور ہے؟ ایسے کتنے ہی سوالات ابھرتے ہیں جن کا جواب مغربی مفکرین نے پہلے بھی دینے کی کوشش کی تھی اور اب بھی وہ اس عمل میں لگے ہوئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ توضیحات وتشریحات کے عمل کے ساتھ ساتھ مابعد جدیت اپنے طور پر فرائض انجام دینے میں مصروف کار ہے اور اس کی گونج اب صرف مغرب تک ہی محدود نہیں بلکہ مشرق میں بھی اس پر بحث و مباحثہ (Discourse) قائم ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے مقالے کا یہ موضوع بھی نہ ہوتا۔ پھر بھی مابعد جدیدیت کی تعریف اور توضیح کے سلسلے میں بعض مفکرین اور دانشور رجوع کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند کی طرف توجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن میری بحث صرف مابعد جدیدیت کی تعریف تک محدود نہیں رہے گی بلکہ مغربی دانشوروں نے اس اصطلاح کو واضح کرنے

کے لیے جن نکات کو بیان کرنا ضروری سمجھا ہے ان میں سے تین نکات/نظریات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔

مابعد جدیدیت اور مغربی مفکرین

ا۔ رولینڈ بارتھ (Roland Barth 1915-1980)

فرانسیسی نقاد اور نظریہ ساز، جس نے سیمیالوجی (Semiotics) (اشارات اور علامات کی سائنس) کا نظریہ پیش کیا۔ ساختیات اور مابعد جدید تنقید میں اس کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی ابتدائی تحریرات مثلاً Le Degra 'Zerode lecriture (writing Degree Zero, 1953) اور Sur Racine (on Racine, 1963) میں اس نے روایتی ادبی تنقید پر شدید حملہ کیا۔ اس نے اپنی ساختیاتی سوچ میں عموماً علامات واشارات، نمونے اور قوانین وغیرہ کا تجزیہ واظہار کیا جو کسی ناول یا ڈرامے کے ذریعے پیش کیے جاسکتے ہوں۔ اس نے اپنی دردناک خودنوشت کو ایک ناول Roland Barthes Sur Roland Barthes کی شکل میں 1975 میں بیان کیا۔

فرانسیسی ساختیات (Structuralism) کے علم برداروں میں رولینڈ بارتھ کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ جوناتھن کلر نے لکھا ہے کہ:

> ''اس کی یہ حیثیت بہت سی متضاد وجہوں سے قائم ہوئی ہے کہیں تو بارتھ بے حد سائنٹیفک نظر آتا ہے، اس حد تک کہ سائنسی بنیادوں پر آفاقی گرامر کی تشکیل چاہتا ہے۔ سوسئیر کی سیمیالوجی (Semiqlogy) کی تفہیم وتجزیے میں سائنسی نقطہ نظر کو راہ دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ غیر سائنسی کتابیں، The pleasure of The Text, A Lover's Discourse وغیرہ لکھتا ہے۔''(39)

اس طرح اس کے رویے میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہی ہے اور وہ بیک وقت سائنسی اور غیر سائنسی ذہن کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے نت نئے آفاق میں داخل ہو جاتا ہے گویا اس کے ذہن میں تضادات ہی تضادات تھے۔

سوانحی نقطہ نظر سے بارتھ کی زندگی بہت خوشگوار نظر نہیں آتی۔ جب وہ ایک سال کا تھا تو اس

کا باپ جو ایک بحری افسر تھا قتل کر دیا گیا۔ اس کی ماں کو فرانس میں اپنے باپ کے گھر Beyonne میں منتقل ہونا پڑا۔ وہ 1970ء میں اپنی ماں کی موت تک اسی کے ساتھ رہا۔ اس کے حالات ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ ماں کے یہاں ناجائز اولاد کی پیدائش ہے۔ اس کی ماں کے گھر والے سخت برہم ہوئے اور نتیجے میں بارتھ بھی اس سے متاثر ہوتا رہا۔ وہ اپنی ماں کے ناجائز بیٹے سلفر روڈ کے ساتھ انتہائی کربناک زندگی گزارتا رہا۔ بارتھ بیمار رہنے لگا اور اسے تپ دق کی بیماری لگ گئی جو ان دنوں لا علاج تصور کی جاتی تھی۔ سینی ٹوریم میں زیر علاج رہنے کے باوجود وہ اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہیں رہا۔ حیرت انگیز طور پر وہ اپنے مطالعات کو وسعت بھی دیتا رہا۔ جب کبھی اس کی صحت اجازت دیتی وہ پڑھانا بھی شروع کر دیتا۔ پھر وہ ایک تھیٹر کے گروپ سے وابستہ ہو گیا اور تب لکھنا بھی شروع کر دیا۔ اس طرح اس کی تحریروں کے تضادات اس کے حالات کی وجہ سے ہیں۔ ایک طرف تو جسمانی طور پر بیمار اور دوسری طرف ذہنی طور پر زندہ، یہ دونوں کیفیتیں اس کی تحریروں کو کہاں تک سمجھنے میں معاون ہیں، نہیں کہا جا سکتا۔

1953ء میں بارتھ نے Mythologies کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے مارکسی Semiology اور مارکسی کلچر کو موضوع بنایا۔ Mythologies میں چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں لیکن بارتھ دراصل یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح ثقافت میں آئیڈیالوجیکل صورتیں Myth بن کر شامل ہو جاتی ہیں۔ آج جس طرح ثقافتی مطالعات (Cultural Studies) کی طرف توجہ کی جا رہی ہے اور اسلام کو محض ثقافتی مطالعہ تک محدود کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اس میں ابتدا بارتھ کے خیالات سے ہوئی، جس نے ثقافت میں متھالوجی کی شمولیت کے تجزیہ کا طریقہ کار وضع کیا۔ اسی طرح بارتھ کے احاطہ تجزیہ میں اشتہارات (advertisements)، فوٹو گرافس، فلم، کشتی کے مقابلے سب کچھ رہا ہے اور ان سب سے وہ اپنی تحریر کیلئے مواد حاصل کرتا رہا ہے اسی نے ایک مضمون صابن کے پاؤڈر پر بھی لکھا۔ گویا یہ ساری صورتیں بارتھ کی نگاہ میں نئی کیپٹل سوسائٹی کے تانے بانے ہیں۔

دس سال تک وہ National Centre for Scientific Research سے وابستہ رہا۔ یہیں اسے سائیر کی ثقافتی ساختیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ 1963ء میں اس نے On Racine نام کی کتاب قلمبند کی اور متون کی ساختیاتی کیفیت کو پیش کیا۔ یوں تو بارتھ نے بہت سی

کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند کا اوپر تذکرہ بھی ہو چکا، لیکن اس کی سب سے معروف تحریر The Death of the Author ہے جو 1978ء میں شائع ہوئی اور اشاعت کے بعد ہی مختلف فکری حلقوں میں اس پر بحث چھڑ گئی۔ اس کتاب کے انداز کے بارے میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا جارح مگر فکری انداز مصنف کی حیثیت کو ختم کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔ اب تک تصنیفات کو مصنف سے الگ کر کے دیکھنے کی سعی بہت کم ملتی ہے۔ بارتھ نے تصنیف اور مصنف کے رشتے کو ختم کر دیا ہے وہ اپنی بحث میں یہ احساس دلاتا ہے کہ اپنی اپنی ثقافتوں میں، یہاں تک کہ اس کے باہر بھی متون زندہ ہیں۔"(40)

نقادوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اس نے اس وقت لکھی جب وہ چونسٹھ برس کا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے مشمولات قبر کی آواز پر مبنی ہیں۔ اسی سال بارتھ ایک ٹرک سے ٹکرا گیا تھا اور اس بری طرح زخمی ہو گیا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔

۲۔ چارلس جینکس (Charles Jencks)

امریکی تصور کے حوالے سے جینکس نے ایک ایسے کلچر کی وضاحت کی جو مابعد جدیدیت سے عبارت تھا یعنی The specifically American character of postmodernism اور یہ صورت فن تعمیر میں خاص طور پر نمایاں ہوئی۔ جینکس نے یہ باتیں 1984ء میں فن تعمیر کے بارے میں کہی تھیں۔ جینکس جدید عمارتوں کی موت کی جگہ، وقت اور تاریخ بھی متعین کرتا ہے اور نتیجتاً جدیدیت کی موت بھی، اس کے الفاظ ہیں:

"15 جولائی 1972ء میں تین بج کر 32 منٹ پر جدید فن تعمیر کی موت سینٹ لوئیس مسیوری میں واقع ہوئی جبکہ مشہور Pruitt-igoe سکیم کے تحت Slab سے بنے ہوئے بلاک ڈائنامائٹ سے اڑا دیے گئے۔ اس سے پہلے انہیں سیاہ فام باشندوں نے توڑا پھوڑا تھا۔ اس باب میں اربوں روپے صرف کیے گئے کہ انہیں محفوظ رکھا جائے لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ یہی نا۔۔۔ کہ انہدام۔"(41)

یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ Pruitt-igoe کو ایسی عمارتوں کے ڈیزائن کے سلسلے میں انعامات سے نوازا گیا تھا۔ لیکن صندوقوں کی شکل کے بنے ہوئے بلاکوں میں رہنے والے ایک

دوسرے سے بیگانہ محض رہے اور ایک اجنبیت کی فضا پیدا ہوگئی۔ تو پھر اس کا بدل کیا تھا؟ عمارت سازوں نے یکسانیت کی فضا ختم کی اور ایسا ڈیزائن دیا جو اجتماعی زندگی کا تصور پیش کرتا تھا۔ یہاں صندوقوں میں رہنے والوں کے مقدر کا جو حبس تھا، ختم ہوا اور یہی مابعد جدیدیت کا عمارت سازی میں شاخسانہ ٹھہرا۔ چنانچہ جینکس نے پوسٹ ماڈرن عمارت کے تعلق سے مابعد جدیدیت کی ایک تعریف بھی اختراع کی، اس کے الفاظ ہیں:

"Definition of Postmodernism is double coding: the combination of modern techniques with something else (usually traditional building) in order for architecture to communicate with the public and concerned minority, usually other architects." (42)

چارلس جینکس کی اس تعریف کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ اوپر کے مباحث وضاحت کیلئے کافی ہیں۔ لیکن یہاں مشل فوکو کی چند وضاحتیں پیش کرنا چاہتا ہوں، جن میں اس کی سعی ملتی ہے کہ مابعد جدیدیت ہے کیا؟ فوکو کسی متعینہ تعریف کے سلسلے میں کامیاب ہوا ہے کہ نہیں؟ اس بات کا فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہے وہ سوال کرتا ہے مابعد جدیدیت ہم کسے کہتے ہیں؟ پھر وہ کہتا ہے کہ:

''اس کا جواب دینا تکلیف دہ ہے کیوں کہ میں واضح طور پر یہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ جدیدیت کے کیا معنی ہیں؟ بہر طور اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ مابعد جدیدیت ایک متنازعہ فیہ اصطلاح ہے جس کی وضاحت کے لیے اچھے خاصے دماغ لگے ہوئے ہیں۔ مابعد جدیدیت اب ایک ایسی اصطلاح بن گئی ہے جو انتھراپولوجی، فلسفہ، سوشیالوجی، آرکی ٹیکچر، مذہبیات، ادبیات اور معاشیات سبھوں کو اپنے دائرے میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی تعریف و توصیف میں اس کے سارے پہلوؤں پر نظر رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایسے میں اس اصطلاح کی کوئی مختصر تعریف ممکن ہی نہیں ہے۔'' (43)

دراصل مابعد جدیدیت ایک پیچیدہ اصطلاح ہے اور اس پیچیدگی میں وہ تمام مسائل ہیں جو آج کی زندگی میں نہ صرف دخیل ہیں بلکہ مسلسل اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس پیچیدگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے بعض اذہان نے کچھ سوالات مرتب کیے ان کے جواب میں کچھ پہلو سامنے آئے جن

کاتعین کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ تعین بھی نہ اٹل ہے نہ جامد بلکہ ایک حرکی صورت ہے جو جمود اور سکوت کو توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

۳۔جین فرینکوس لیوٹارڈ (Jean Francois Lyotard 1924-1998)

لیوٹارڈ پہلا اہم فرانسیسی مفکر ہے، جس نے مابعد جدیدیت کے ڈسکورس/مباحثہ/مکالمہ (Discourse) کو باقاعدہ طور پر قائم کیا۔1980ء کے بعد مابعد جدیت کے مباحث میں لیوٹارڈ کا نام Authority کی حیثیت اختیار کر گیا۔اس کا نام آتے ہی یہ تصور خود بخود ابھرتا ہے کہ اس نے 'مہابیانیہ' کی اہمیت کم کرنے یا ختم کرنے میں اہم کردار انجام دیا۔اس کی کتاب (جس پر پیچھے سیر حاصل بحث ہو چکی ہے)۔ The Postmodern Condition، جو 1984ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوئی تب ہی سے مابعد جدیدیت کے بعض اہم نکات تفصیل سے زیر بحث آنے لگے۔

لیوٹارڈ Versailles میں پیدا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر یہ فلسفے کا طالب علم تھا، لٰہذا اس نے 1949ء میں Sorbonne یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ایک ہائی سکول میں پڑھانے لگا۔ابتداء میں اس کا ذہن مارکسیت کی طرف مائل تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ 1948ء میں فرانس میں قائم ہونے والی سیاسی تنظیم socialisme on Barbaric کا رکن بن گیا۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ مارکسزم ایک ایسا مہابیانیہ ہے جو اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے، غالباً افغانستان میں روس کی ہزیمت اور ماسکو کی گلیوں میں لینن کے مجسمہ کی رسوائی اس کے خوابوں کو چکنا چور کرنے میں اہم سبب بنی۔ مارکسزم کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے تمام طرح کے Metanarratives کی صداقت اور مرکزیت سے انحراف کرنے میں عافیت سمجھی۔

دریں اثناء وہ 1965-66ء کے درمیان پیرس یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتا رہا، پھر اس کیلئے اہم درسگاہوں کے دروازے کھل گئے۔ بعد ازاں وہ امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں فلسفے پر لیکچر دیتا رہا۔کہیں کہیں اسے جزوقتی لیکچرر کی حیثیت بھی حاصل رہی۔ 1980ء کے قریب اس نے پیرس میں

ایک بین الاقوامی ادارۂ فلسفہ International college of philosophy قائم کیا اور اس کا صدر بن گیا۔ یہ ادارہ نہایت متنازعہ فیہ رہا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لیوٹارڈ کے بنیادی تصورات کیا ہیں؟ کیا ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے؟ کیا اس کی دلیلیں بے وقعت ہیں یا ان کی کچھ اہمیت بھی ہے۔ ایک بات تو یقینی ہے کہ اثر آفرینی کے لحاظ سے اس کے تصورات دور دراز سفر کر کے ملکوں ملکوں جا پہنچے ہیں اور بہت سے معاملات میں provoke کرتے ہیں تو پھر اس کی اہمیت سے انکار کیسے ممکن ہے؟ اپنی ماسٹر بیانیے کی تھیوری میں وہ تمام فلسفیانہ، عارفانہ، حکیمانہ، منطقیانہ صورت واقعہ میں از سر نو جانچنے کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام عناصر کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مہابیانیہ کی موت کی خبر بہم پہنچاتا ہے:

> "Lyotard's point of departure is the demise of what the terms metanarratives simplifying to the extreme. I define postmodernism as incredulity towards metanarratives. Those metanarratives or grand narratives are, broadly speaking, the supposedly transcendent and universal truths that underpin western civilization and that function to give that civilization objective legitimation." (44)

اس کا خیال ہے کہ جدید سائنس مہابیانیہ کے ذریعے اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہے جو درست نہیں ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے۔ وہ کہتا ہے:

> "Postmodern science -- by concerning itself with such things as undesirables, the limits of precise control, conflicts characterized by incomplete information, fractal catastrophes and pragmatic paradoxes -- is theorizing its own evolution as discontinuous, catastrophic, non-rectifiable and paradoxical. It is changing the meaning of the word knowledge, while expressing how such a change can take place. It is producing not the known but the unknown. And it suggests a model of legitimation that has nothing to do with maximised

performance, but has as its basis difference understood as paralogy." (45)

مہابیانیہ کے بارے میں ہم اوپر جو کچھ بیان کر آئے ہیں درج بالا اقتباس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے اس ضمن میں گوپی چند نارنگ نے وضاحت کی ہے:

''لیوتار تنبیہہ کرتا ہے کہ مابعد جدیدیت میں کسی نوع کے مہابیانیہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہیگل ہو کہ مارکس، مابعد جدید ذہن سب کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مہابیانیہ یعنی بڑی فلسفیانہ روایتوں کا اعتبار جاتا رہا۔ اس کا اصرار ہے کہ جدید کاری (Modernism) کے تمام مہابیانیہ (Grand Recits) مثلاً صداقت مطلق کی جدلیات، انسان کی آزادی وحریت، غیر طبقاتی سماج، ترقی وخوشحالی اور امن ومسرت کا خواب سب پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ مارکسی مہابیانیہ متعدد مہابیانیوں میں سے ایک تھا اور غالباً سب سے اہم اور سب سے زیادہ خوش کن!

لیوتار کا ایک جملہ بڑا بلیغ ہے کہ ''سائنسدان اور ٹیکنیشن اور آلات سچائی کی تلاش کے لیے نہیں خریدے جاتے بلکہ طاقت کے حصول کے لیے۔'' (46)

لیوٹارڈ کی فکر مزید بھی زیر بحث آئے گی۔

۴۔ جیکوس دریدا (Jacques Derrida 1930-2004)

فرانسیسی فلسفی جس نے مابعد جدیدیت میں ردتشکیل (Deconstruction) کی تھیوری پیش کی۔ پچھلے صفحات میں ردتشکیل کا ذکر ہو چکا ہے۔ مابعد جدیدیت کی بحث میں دریدا کا نام خاصا اہم بن کر سامنے آتا ہے اس لیے کہ ردتشکیل کی ساری بحث کا سوتا اس کی انقلابی بحث سے ابھرتا ہے (اگرچہ وہ اپنے لیے مابعد جدید مفکر کا لقب پسند نہیں کرتا تھا) اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ردتشکیل کو مابعد جدیدیت سے منہا کر دیا جائے تو پھر مابعد جدیدیت کا کوئی واضح تصور پیدا ہونا مشکل ہے یا کم از کم اس کی بحث ادھوری رہے گی۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ واضح کیا جائے کہ دریدا کی فکر کا محور کیا ہے اور اس کے ذہن کے نہاں خانے میں کون سے نکات رہے ہیں جن کی بنیاد پر وہ ردتشکیل کی سب سے بڑی عالمی آواز بن کر ابھرا۔

دریدا الجزائر میں ہسپانوی یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ 1949 میں یہ خاندان فرانس منتقل

ہو گیا۔ 1952ء میں دریدا نے پیرس کی مشہور یونیورسٹی Ecole Normale Superieure میں داخلہ لیا۔ لیکن دریدا نے اپنی فکر کا قبلہ، فرانسیسی مفکروں کی بجائے جرمن فلسفیوں کو بنایا۔ وہ لیون (Leuven) بلجیئم میں بھی زیر تعلیم رہا۔ 57-1956ء میں ہارورڈ کا وظیفہ لیا۔ اپنی ملازمت کا آغاز اس نے لیون سے کیا۔ بعد میں Sorbonne میں فلسفے کے استاد کے طور پر چار سال پڑھاتا رہا۔ آئندہ بیس برس تک (84-1964) دریدا اپنی مادر علمی Ecole Normale Superieure سے وابستہ رہا۔ علاوہ ازیں وہ امریکہ کی جان ہاپکنز اور دوسری یونیورسٹیوں سے جز وقتی پروفیسر کے طور پر بھی وابستہ رہا۔

دریدا نے اپنے علمی اور تصنیفی کیریر کا آغاز ہسرل (Husserl) کی کتاب Origon of Geometry سے کیا۔ چنانچہ اس کے ذہن کی تشکیل میں ہسرل کا بڑا ہاتھ ہے۔ دریدا نے اس کے حوالے سے تین بنیادی کتابیں بھی قلم بند کیں، جو اس کے کلیدی رویے کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہیں:

(1) The Problem of Genesis in Husserl's Philosophy

(2) Introduction of Husserl's Origin of Geometry

(3) Speech of Phenomena

یہ بات مانی جاتی ہے کہ دریدا نے متون (texts) کی تفہیم کے سلسلے میں متعدد راستے اپنائے اور یہ بھی ثابت کیا کہ کوئی مضمون ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ جس کی حیثیت لازماً مرکزی ہو۔ حد تو یہ ہے کہ وہ ثانوی مضامین اور ثانوی متون کو بھی معنی کے اعتبار سے غیر متعین ٹھہراتا ہے، ایسے میں سوال ابھرتا ہے کہ Deconstruction سے آخر حاصل کیا ہوتا ہے؟ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> "Genesis کی بحث میں دریدا اس امر پر زور دیتا ہے کہ کسی چیز کی بھی ابتدا (Origin) کا سوال یا مسئلہ (problem) کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہسرل نے فلسفیانہ بحث کی اساس ابتدائی نکتے کی تلاش پر رکھی تھی اس لیے ہسرل روحانی کرہ فکر میں داخل ہو جاتا ہے۔ دریدا نے اس فکر کا رد پیش کیا ہے، اس کا خیال ہے کہ کسی ابتدائی نکتے کی تفہیم ممکن ہی نہیں اس لیے کہ ضمیر کی فعالیت نئے امکانات سے ٹکراتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ جامد نہیں ہوتی۔ لہٰذا کسی بھی ابتدا کا تکثیری (Heterogeneous) تصور ہی ممکن

ہے پھر origin یا بنیاد متعین نہیں۔ یہی نکتہ مابعد جدیدیت کے ڈسکورس کا واضح رخ متعین کرتا ہے۔ بنیاد کا یہی سوال Origin of Geometry میں بھی اٹھایا گیا ہے۔ ہسرل نے اس کی تلاش میں خاصی روحانی بحث کی ہے لیکن دریدا مرکز یا منبع کی تلاش کو لایعنی فعل سمجھتا ہے۔"(47)

یہاں اس بات کا تذکرہ خالی از علت نہ ہوگا کہ Genesis بائبل کی پہلی کتاب "پیدائش" کا نام ہے جس میں سیدنا آدمؑ اور ان سے حضرت حواؑ کی پیدائش اور مخلوق کی ابتدا کا تذکرہ ہے۔ ہسرل "پیدائش" کو مرکزی نقطہ آغاز اور اسے ایک sign یا symbol گردانتا ہے اور اس کو ایک بامعنی اور بامقصد واقعہ سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق کوئی نشان یا sign معنی بردار ہوسکتا ہے اگر اس کا مقصد "بیان" ہے لیکن دریدا sign اور معنی میں فرق کرتا ہے اس لیے کہ اس کی فکر میں کوئی متعینہ معنی ہوتا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا دریدا کے ہاں **معنی صرف ایک sign نہیں بلکہ مختلف صورتیں ہیں جو بیان میں مضمر ہوتی ہیں۔ اس لیے کوئی بھی مواد اکہری معنویت کا حامل نہیں ہوسکتا۔** ردتشکیل پر مزید بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

۵۔ مشل فوکو (Michel Foucault 1926-1984)

بیسویں صدی کے نصف میں مشل فوکو یورپ میں ایک مصنف اور مفکر کے طور پر خاصا نمایاں نام رہا ہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس کے اکثر خیالات متنازعہ ہونے کے باوجود مفکرین کیلیے پرکشش رہے ہیں۔ اکثر مغربی مفکرین آج بھی شدومد سے اس سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کو لے کر حمایت کرنے والے بھی کم نہیں۔ نئی تاریخیت، ثقافتی مطالعات وغیرہ سے ہوتا ہوا فوکو مابعد جدیدیت کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے، اس کی آرا پر مسلسل بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔

مشل فوکو، فرانس کے شہر Poitiers میں پال فوکو کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سرجن تھا اور چاہتا تھا کہ فوکو بھی سرجری کے پیشے کو اختیار کرے۔ فوکو نے باپ کی خواہش کا احترام نہ کیا۔ فوکو کی تعلیم Jesuit اور Ecole Normale Superieure جیسے اداروں میں ہوئی جن دنوں فوکو E'cole Nomale میں زیرتعلیم تھا، انہی دنوں اس پر ڈپریشن کا شدید حملہ ہوا اور اسے نفسیاتی معالج کے پاس لے جایا گیا، یہیں سے اسے نفسیات میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ دیگر بہت سے

Normalians کی طرح اس نے فرانسیسی کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کرلی، تاہم اس کا اہم محرک، اس کا استاد اور معروف نومارکسی فلسفی لوئی آلتھیو سے (Althusses Louis (1918-1990) تھا۔ تین سال بعد وہ پارٹی سے الگ ہو گیا۔ اس نے ملازمت کا آغاز یونیورسٹی آف للی سے کیا، جہاں اس نے دو سال (54-1953) تک نفسیات پڑھائی۔ بعد میں اس نے فرانس سے جلاوطنی اختیار کی اور سویڈن کی اپ سالا یونیورسٹی سے بطور کلچرل سفیر منسلک ہو گیا پھر وہ وارسا اور ہمبرگ کی یونیورسٹیوں سے وابستہ ہوا۔ 1960ء میں فرانس واپس آیا اور اپنا ڈاکٹریٹ کا کام مکمل کرنے میں لگ گیا۔ وہیں اس کی ملاقات ڈینیل ڈیفرٹ سے ہوئی، جس کے ساتھ اس نے کئی سال Non-Monogamous Partnership میں گزارے۔ (48)

1970ء میں فوکو کو کالج آف فرانس میں چیئر ملی، جسے اس نے "انسانی فکر کے نظام کی تاریخ" کا نام دیا۔ فوکو امریکہ کی یونیورسٹی آف بفیلو سے بھی وابستہ رہا۔ سان فرانسسکو میں فوکو نے گے کلچر (Gay Culture) میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ وہیں اسے ایڈز کا مرض لاحق ہوا اور اس کے نتیجے میں مر گیا۔

فوکو مغربی تاریخ کا مؤرخ اور فلسفی، علمیات، اخلاقیات اور سیاسی فلسفے کا عالم تھا۔ 1960ء کی دہائی میں اس کو ژاک لاکان، لیوی سٹراس اور رولینڈ بارتھ کے گروہ میں شامل کیا گیا، جو ساختیاتی (Structuralist) کہلاتا تھا اور جو سارتر (Sartre Jean-Paul 1905-80) کی وجودیت (Existentialism) کو چیلنج کر رہا تھا۔ بعدازاں 1970ء کی دہائی میں اس کی تحریروں کو پس ساختیاتی (Post Structuralist) کہا گیا۔ فوکو کے ناقدین میں اگرچہ چارلس ٹیلر، نوم چومسکی، ہیبر ماس، نینسی فریزر وغیرہ شامل ہیں مگر سب سے اہم جیکوس دریدا تھا جو فوکو کا شاگرد بھی تھا۔ اس نے فوکو کی دیکارت کی کتاب پر لکھی گئی تنقید پر شدید تنقید بھی کی۔ فوکو پر ہونے والی تنقید کے باوجود، فوکو کے اثرات، مختلف شعبہ ہائے زندگی پر پڑے مثلاً آرٹ، فلسفہ، تاریخ، بشریات، ثقافتی مطالعات، لسانیات، عمرانیات، تعلیم نفسیات، ادبی تھیوری، تانیثیت، فلسفۂ سائنس، میوزیم سٹڈیز، مینجمنٹ سٹڈیز وغیرہ۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوکو کا مابعد جدیدیت کی فکر کو پروان چڑھانے میں کیا حصہ ہے؟ اس کی ایک کتاب: What is An Author ہے۔ یہ کتاب 1969ء میں انگریزی میں شائع ہوئی۔ اس میں رولینڈ بارتھ کے مضمون The Death of The

Author پر شدید تنقید کی۔ فوکو کا خیال ہے کہ مصنف کا کردار بہر حال ہوتا ہے۔ وہ متن کو منظم کرتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ مصنف ہی کسی متن کا حقیقی ذریعہ ہے۔ فوکو Humanism کا سخت مخالف ہے اس کا خیال ہے کہ آدمی کی فطرت عجیب وغریب ہوتی ہے جس کے نہاں خانے میں بہت سی شناختیں پنہاں ہوتی ہیں۔ ان شناختوں کے کچھ محرکات ہوتے ہیں مثلاً غرض، خواہش وغیرہ۔۔۔ ایسی صورت میں یہ بھی کہنا مناسب ہے کہ یہ تمام باتیں کسی مصنف سے وابستہ کردی جاتی ہیں۔ جب کہ ان کا تعلق ان شخصیات سے ہے جن کا متن مرتب ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے جملے ہیں:

> "Discourse that possesses an author's name is not to be immediately consumed and forgotten... Rather, its status and its manner of reception are regulated by the culture in which it circulates." (49)

فوکو نے اپنے نقطہ نظر کی اس طرح وضاحت کی ہے وہ دراصل Author کیا ہے؟ کی بحث میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ موضوع کو یکسر چھوڑتا نہیں ہے بلکہ اس کی از سر نو تاویل کرتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ منبع پر نگاہ ڈالی جائے بلکہ اس کی کارکردگی سے زیادہ واسطہ رکھا جائے۔

۶۔ جین بادریلا (Jean Baudrillard 1929)

جین بادریلا مابعد جدیدیت کا نہایت اہم فرانسیسی مفکر اور Cultural Theorist ہے۔ بنیادی طور پر وہ مارکسیت اور ساختیات سے بے حد متاثر تھا۔ مابعد جدیدیت کے کلچر 'میڈیا' اور صارفیت (Consumerism) سے تعلق کی جن صورتوں اور سطحوں کو بالعموم زیر بحث لایا جاتا ہے، انہیں بادریلا نے اول اول نشان زد کیا اور نظریے (Theorise) بنایا تھا۔ موجودہ دور کے اہم عالمی واقعات جیسے خلیج کی جنگ، نائن الیون کا واقعہ اور عراق وافغانستان پر امریکی واتحادی افواج کے حملے وغیرہ پر بھی بادریلا نے مضامین لکھے ہیں۔ ان جملہ موضوعات پر بادریلا جس ذہنی فریم ورک کے تحت قلم اٹھاتا ہے، وہ مغرب کی فلسفیانہ روایت اور ساختیاتی فکر سے مرتب ہوا ہے بہر حال فرانسیسی مابعد جدیدیت میں بادریلا کی حیثیت امام کی ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کلاسیکی سماجی تھیوری کالعدم ہو چکی ہے لہٰذا نئے طریقے سے سماجی معاملات کے تجزیے کی ضرورت ہے، یہ وہ وقت تھا جب مابعد جدیدیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کئی دیگر مفکرین کی طرح

اسے بھی احساس تھا کہ Marxism کا رول مدھم ہو چکا ہے اور اس کے دعوے جھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔ بعد میں بادریلا Anthropology کی طرف مائل ہوا اور اسے احساس ہوا کہ اس شعبہ علم میں بہت کچھ ہے، جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بادریلا کوئی ایسی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا جو زیادہ Radical ہو۔ اس نقطہ نظر کی وضاحت میں اس کی دو کتابیں The Mirror of Production اور Symbolic Exchange of Death شائع ہوئیں۔ دوسری کتاب میں جدید سوسائٹی کی نئی تشکیل کا ایک منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تیسری اور اہم ترین کتاب Simulacra and Simulations 1981ء میں اشاعت پذیر ہوئی جس میں Simulation کی منطق سے نئی سوسائٹی کی تشکیل کا ایک خاکہ پیش کیا گیا۔

The Hutchinson Dictionary کے مقالہ نگار کے الفاظ میں:

> "Baudrillard evolved a critique of consumer society and of an information world dominated by the reproduction of images, producing a state which he called hyper-reality." (50)

بادریلا نے اپنی کتب میں جہاں صارفیت کلچر اور شباہت کذبی کو موضوع بحث بنایا وہیں اس نے سیاسی معیشت، مارکسیت اور جدیدیت کے خاتمے کا اعلان بھی کر دیا۔ دراصل یہ خاتمہ مابعد جدیدیت کی آمد کی اطلاع ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "The discourse of the end signifies his announcing a postmodern break or rupture in history. We are now, Baudrillard claims, in a new era of simulation in which social reproduction (information processing, communication, knowledge, industries and so on) replaces production as the organizing principle of society. In this era, labour is no longer a force of production it itself one sign amongst many. Labour is not primarily, productive in this situation, but is a sign of one's social position, way of life and mode of servitude."(51)

بادریلا فرانس کے شہر Reims میں پیدا ہوا۔ پیرس کی سوربورن یونیورسٹی میں جرمن پڑھی، نیز فلسفے اور عمرانیات کا بھی مطالعہ کیا۔ 1966ء میں اس نے Third cycle thesis: the system of objects کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ بطور مترجم اور مدرس گزرا ہے۔ پھر یورپین گریجویٹ سکول میں بطور کلچر اور میڈیا تنقید کے فلسفے کا پروفیسر رہنے کے بعد آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے۔

فوکویاما کی طرح بادریلا بھی تاریخ کے خاتمے کا تصور رکھتا ہے۔ اس کے مطابق تاریخ کا مطلب ہے: دو قوتوں کی باہم جنگ آزمائی۔ بادریلا کو باہم برسرِ پیکار قوتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ بادریلا کے دلائل فوکویاما سے مختلف ہیں۔ فوکویاما نے سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد یہ تصور دیا تھا کہ اب سرمایہ داری (capitalism) کا کوئی حریف باقی نہیں رہا، اس لیے اب تاریخ بھی باقی نہیں رہی۔ یہ دونوں مفکر تاریخ کا تو عمومی اور یکساں تصور (دو حریفوں کی کش مکش) رکھتے ہیں مگر اس کے خاتمے کے مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ بادریلا کی اہم دلیل یہ ہے کہ اب مغربی عوام کی اکثریت کسی مزاحمتی تحریک کی علم بردار نہیں ہے اب عوام وہی ہیں، جو میڈیا انہیں دکھاتا ہے اور ان کے ذہن کو بناتا ہے۔ لوگ اپنی حقیقتوں میں نہیں تخیلی اور میڈیائی شبیہوں (Images) کے مطابق جیتے ہیں۔ دونوں مفکرین احیائے اسلام کی تحریکوں اور اسلامی نشاۃ ثانیہ جیسی عالمی لہر کو شاید لحاظ میں نہیں رکھتے؟

بادریلا ابتدا میں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا۔ مارکسی تھا مگر بعدازاں وہ اس سے متنفر ہو گیا۔ اس کا موقف یہ ہے کہ مارکس کا ورلڈ ویو (World view) وہی ہے، جو سرمایہ داری کا ہے۔ تخلیق اور قدر کا سوال دونوں میں موجود نہیں۔ مارکس بورژوائی فکر کے وائرس میں مبتلا تھا، بادریلا نے اسی بنا پر مارکسیت سے اپنا ذہنی تعلق ختم کیا اور اس کی جگہ علامتی تبادلے (Symbolic Exchange) کی تھیوری وضع کی۔ یہ تھیوری دراصل صارفی کلچر (جو دراصل مابعد جدیدیت کا ایک مظہر (phenomenon) ہے) میں اشیا کی قدر کا تعین کرتی ہے۔ اس تھیوری کی رو سے ہر شے (object) چار قسم کی اقدار کی حامل ہوتی ہے۔

i۔ عملی قدر (Functional value): مثلاً پلنگ سونے کے کام آتا ہے۔ کرسی بیٹھنے کے لیے بنی ہے۔ گاڑی پر سواری کی جاتی ہے وغیرہ۔

ii۔ تبادلے کی قدر (Exchange value): مثلاً کار کی قیمت لاکھوں میں ہوتی ہے۔ قلم چند روپوں میں آجاتا ہے وغیرہ۔

iii۔ علامتی قدر (Symbolic value): مثلاً صاحب تصنیف ہونا، عزت و وقار کی علامت ہے۔ کرسی، اقتدار کی علامت ہے۔

iv۔ نشانیاتی قدر (Sign value): اشیا کے نظام میں اور اشیا کے مقابل تشکیل پانے والی قدر، مثلاً کچھ کے نزدیک قلم، تلوار سے طاقت ور ہے اور اکثر لوگ کرسی (اقتدار، طاقت) کو ترجیح دیتے ہیں۔

فصل دوم

مابعد جدیت کے بنیادی نظریات

جن مغربی مفکرین کا پچھلے صفحات میں مطالعہ کیا گیا ہے ان کے افکار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت کی بعض شقیں خاصی نمایاں ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ یہ نکات کوئی منشور مرتب نہیں کرتے لیکن ان سے ادبی، ثقافتی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی شعبوں کے بعض نکات شدید طور پر زیر بحث آتے ہیں اور مضمرات و ممکنات کے نئے پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ یہاں ضروری نہیں کہ ہم تمام امور کی نشاندہی کریں۔ لیکن مابعد جدیدیت کی بحث سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ یوں ہیں:

(1) مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے، اس کے مطابق ہر نظریہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استبدادی ہوتا ہے، اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہے۔

(2) مابعد جدیدیت ہیگل کے تاریخی ارتقا کے نظریے کو رد کرتی ہے۔ بقول نطشے حقائق اس بات کی ضمانت نہیں دیتے کہ تاریخ لازماً ترقی کی راہ پر ہے۔

(3) سماجی، سیاسی، ادبی، اخلاقی ہر معاملے میں بغاوت اور انحراف کا رجحان ہے۔

(4) 'مہابیانیہ' کا زمانہ گزر گیا۔ 'مہابیانیہ' ختم ہو گئے یا دب گئے ہیں۔ یہ دور چھوٹے چھوٹے

بیانیوں کا ہے۔ یہ مقامی ثقافتوں کے مطابق درست ہو سکتے ہیں۔لہٰذا چھوٹے بیانیے اور قصہ گوئی میں نئی دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔

(5) مابعد جدید عالمی مفکرین مارکسزم سے مایوسی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: If Marx is not true then nothing is.

اسی لیے یہ مفکرین کلیت پسندی، مرکزیت یا نظریہ سازی کے خلاف ہیں۔ نیز کثرتیت، کثیر الوضعیت، مقامیت اور بوقلمونی پر اصرار کرتے ہیں۔

(6) سچائیاں ایک نہیں ہیں، ان کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہو سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ سچائی Universal نہیں ہو سکتی، آفاقی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ سچائیوں کا تعلق بھی مخصوص ثقافتوں کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔

(7) اب تک کلاسیکی سرمایہ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو مستند اور حتمی (Ultimate) تصور کرنا درست نہیں۔اس کا رد تشکیل (Deconstruction) کیا جا سکتا ہے۔اور اس کی قدروں کو حتمی اور مستقل تصور نہ کرتے ہوئے اسے بہت سے تنقیدی پہلوؤں سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔

(8) دنیا غیر حقیقی ہو گئی ہے۔ایک صورت تو Simulacra کی ہے۔ دراصل اب چیزوں کی جس طرح نمائندگی ہوتی ہے وہ بذات خود متعلقہ اشیا سے مختلف ہوتی ہیں۔اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نمائندگی یا کاپی کے نام پر کچھ اور ہی شے پیش کی جا رہی ہے۔جس میں حقیقت کا شائبہ نہیں رہتا۔آئے دن کے مرحلے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ تو سچائیاں ہی مستقل ہیں اور نہ ان کی نمائندگی!

(9) مابعد جدیدیت ثقافت کے حوالے سے اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ ہر زمانے میں ثقافت سچائیاں وضع کرتی رہی ہے اس لیے کسی ایک سچائی کو ہر زمانے کے لیے ٹھیک باور کرنا درست نہیں ہے، اعتقادات میں اختلافات کی وجہ یہی ہے۔یعنی سچائیاں بنی بنائی نہیں ہیں وضع کی جاتی ہیں!

(10) مغربی استعمار کی عالمگیریت (Globalization) بھی مابعد جدیدیت کا ایک مظہر ہے۔ نظام صدیقی مابعد جدیدیت کے مزاج کی تفہیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مابعد جدیدیت کے نئے جمالیاتی اور اقداری معیار (موٹے طور پر) (۱) باغیانہ

ریڈیکل کردار (2) وفور تخلیقیت (3) کثیر معنویت پاشی (4) متن کا لاشعور یا بین المتونیت کا تصور (5) آئیڈیالوجی کی حمیت کا رد (6) سچائی کی اضافیت (7) لامرکزیت (8) کینن (اصول) اور ہر طرح کی اتھارٹی کا زوال۔" (52)

ان مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت ایک Complex صورت ہے جس نے روشن خیالی، آزادی، جنس، اخلاقیات، مذہب، سماجیات بلکہ زندگی کے بیشتر گوشوں کو نئے اور متنوع Discourse سے ہمکنار کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ جنہوں نے اپنی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" میں مابعد جدیدیت کے ڈسکورس کو اردو سے روشناس کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مابعد جدیدیت کا تصور ابھی زیادہ واضح نہیں ہے اور اس میں اور پس ساختیات میں جو رشتہ ہے اس کے بارے میں معلومات عام نہیں۔ اکثر دونوں اصطلاحیں ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ البتہ اتنی بات صاف ہے کہ پس ساختیات تھیوری ہے جو فلسفہ کے قضایا سے بحث کرتی ہے جبکہ مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورت حال ہے یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے، یا معاشرتی و ثقافتی فضا، یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم مابعد جدیدیت حالت (Postmodern Condition) کہہ سکتے ہیں، لیکن پس ساختیاتی حالت نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا پس ساختیات کا زیادہ تعلق تھیوری سے ہے اور مابعد جدیدیت کا معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورت حال سے..... لیکن غور سے دیکھا جائے تو تھیوری کا بڑا حصہ وہی ہے جو پس ساختیات کا ہے یعنی مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مقدمات وہی ہیں جو پس ساختیات کے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو ذہنی فضا بننی شروع ہوگئی تھی اس کا بھرپور اظہار لاکاں، آلتھیوسے، فوکو، بارتھ، دریدا اور لیوتار جیسے مفکرین کے یہاں ملتا ہے..... نظریاتی اعتبار سے دیکھیں تو مابعد جدیدیت "بت ہزار شیوہ" ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت تک ہمارے ذہن سیدھی سادی مطلق تعریفوں کے عادی رہے ہیں۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کی کوئی مطلق یا فارمولا بند تعریف ممکن نہیں، کیونکہ مابعد جدیدیت بنیادی طور پر فارمولے وضع کرنے کے خلاف ہے۔" (53)

ظاہر ہے کہ یہ وضاحت مابعد جدیدیت کی تفہیم میں بہت اہم ہے۔ مابعد جدیدیت کے بنیادی نظریات میں سے تین اہم نظریات کا ہم تفصیل سے جائزہ لیں گے اور پھر مابعد جدیدیت کے معاشرے پر عملی اثرات بیان کریں گے۔ آخر میں ہم مابعد جدیدیت کے چیلنج کا مدمقابل اسلامی تعلیمات پیش کریں گے۔ مابعد جدیدیت کے وہ تین بنیادی نظریات جن کو اگر مابعد جدیدیت سے نکال دیا جائے تو پیچھے کچھ نہ بچے یا جن کی بنیاد پر مابعد جدیدیت کی عمارت استوار ہے درج ذیل ہیں:

ا۔ سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ (Metanarratives) کا رد۔

ب۔ دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ یعنی Hyperreality۔

ج۔ ردّ تشکیل کا نظریہ یعنی Deconstruction۔

الف۔ سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ (Metanarrative) کا رد:

مابعد جدیدیت کے تصور کے مطابق دنیا میں کسی آفاقی سچائی (Universal Truth) کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ آفاقی سچائی کا تصور ان کے نزدیک محض ایک خیالی تصور (Utopia) ہے۔ جدیدیت (Modernism) کے علم برداروں کا خیال ہے کہ جمہوریت، آزادی و مساوات، سرمایہ دارانہ نظام معیشت (یا اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکیت) اور ٹیکنالوجیکل ترقی وغیرہ پر مبنی جو ماڈل یورپ میں اختیار کیا گیا، اس کی حیثیت ایک عالمی سچائی کی ہے اور ساری دنیا کو اپنی روایات چھوڑ کر ان عالمی سچائیوں کو قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ 20ویں صدی میں ساری دنیا کو جدید (Modern) بنانے کا کام شروع ہوا۔ روایتی معاشروں سے کہا گیا کہ وہ صنعتیں قائم کریں۔ جدید شہر بسائیں، آزادی کی قدروں کو نافذ کریں، جمہوری طرز حکومت اپنائیں، جدید ٹیکنالوجی کو اختیار کریں اور اس طرح جدید بنیں کہ فلاح و ترقی کا واحد راستہ یہی ہے۔

مابعد جدیدی (Postmodernists) دوسری انتہا (Extreme) پر جا کر عالمی یا آفاقی سچائی کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک چاہے سچائی ہو یا کوئی اخلاقی قدر، حسن خوبصورتی کا احساس ہو یا کوئی ذوق (Taste)، یہ سب اضافی (Relative) ہیں۔ پروفیسر ارشد سراج الدین جن کی مابعد جدیدیت پر گہری نظر ہے، اس کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''فکرانسانی کاایک نہایت اہم وظیفہ خود اپنے ہی مقدمات اورموضوعات پر تنقید کرنا ہے۔ چنانچہ پسِ جدید مفکرین نے ان مسائل اورمفروضات کا تنقیدی جائزہ لیا، جن سے جدید فکر ترکیب پایا تھا۔ جدیدیت (Modernism) کے علمبردار عقل اور سائنس کے ذریعے آفاقی قدروں (Universal Values) کی تلاش میں نکلے تھے۔ پس جدیدیت کے نمایندوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جدیدیت کی یہ کوششیں کتنی سادہ اور سطحی ہیں۔ صداقت اضافی اورحقیقت موضوعی ٹھہری اورپیچیدہ انسانی صورتِ حال ہر عقلی نظام کی گرفت سے آزاد ثابت ہوئی۔ جدیدیت نے مذہب اورروایت (Tradition) کے بخیے ادھیڑے تھے اورپس جدیدیت نے جدیدیت ہی کو تارتار کر دیا۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ لامعنیت اوراضافیت (Relativism) ہے جس سے نبٹنا ہنوز باقی ہے۔'' (54)

مابعد جدیدیت سچائی، اخلاقی قدر، حسن، ذوق وغیرہ کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند اور حالات (Context) سے جوڑتی ہے۔ یعنی ایک ہی بات کسی مخصوص مقام پر یا مخصوص صورتوں میں سچ اور دوسری صورتوں میں جھوٹ ہوسکتی ہے۔ **مابعد جدیدیت کے نزدیک کائنات میں ایسی کوئی قدر یا صداقت موجود نہیں جس پر زمان ومکان کی تبدیلی اثر انداز نہ ہو۔ یعنی دنیا میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ہمیشہ اور ہر مقام پر سچ ہو۔** ''اضافیت'' (Relativism) مابعد جدیدیت کی ایک اہم اور بنیادی تھیوری ہے۔ Hutchinson کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"**Relativism:** In Postmodernism a philosophical position that denies the possibility to objective truth independent of some social or historical context or conceptual framework." (55)

مابعد جدیدیت کے نزدیک تصورِ جہاں (World view) سچائی کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ طاقت کی لڑائی میں محض ایک ہتھیار ہوتا ہے۔ لوگوں نے دنیا پر حکومت کرنے اور عوام کو بے وقوف بنانے کیلئے اپنے من پسند خیالات کو عالم گیر سچائیوں (Meganarrative) کے طور پر ان پر مسلط کیا ہے۔ اسی لیے مابعد جدیدی سرمایہ داری، جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ جیسے نظریات کے سخت ناقد ہیں، اور انہیں Metanarrative (عالمگیر صداقت، مہابیانیہ) کہہ کر رد کردیتے ہیں۔ بلکہ

عالم گیر سچائی یا اصول و اخلاق کے نام پر پیش کی جانے والی کسی بھی تھیوری کو ماننے سے انکاری ہیں۔
جہاں تک مذہبی عقائد و تصورات کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانہ کا اصل مرض دراصل دین کے بارے میں بے حسی و بے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارے میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی ہے۔ ایک مغربی یونیورسٹی کے معلم فلسفہ و علم النفس نے اس حقیقت کا خوب ادراک کیا ہے اور اس فرق کی صحیح تحلیل کی ہے جو قدیم و جدید نفسیات میں پایا جاتا ہے۔ اس نے ایک جملہ میں ایک کتاب کا مضمون سمیٹ لیا ہے:
>
> ''مذہبی سوالات پہلے پیدا ہوتے تھے ممکن ہے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملتا ہو، لیکن اس زمانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سوالات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔'' (56)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی قیادت مسلمانوں کے بعد یورپ کی ان قوموں کے ہاتھ میں آئی جن کے پاس شروع ہی سے حکمتِ الٰہی کا کوئی سرمایہ اور علم صحیح کا کوئی صاف چشمہ نہ تھا۔ نبوت کی روشنی وہاں دراصل پہنچنے ہی نہ پائی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کی ایک شعاع جو وہاں پہنچی تھی وہ تحریف و تاویل کے اندھیروں میں گم ہوگئی۔ انہوں نے اس آسمانی روشنی کی خانہ پری یونان و روما کی سیاہ تعلیمات سے کی۔ جاہلی یونان و روم کا پورا جاہلی ترکہ ان کی میراث میں آیا۔ اور نسلی طور پر ان کے تمام فطری، ذہنی، اخلاقی اور سماجی خصائص ان میں منتقل ہو گئے۔ محسوسات پرستی، روحانیت سے دوری، تمتع و لطف اندوزی، وطنیت کا تعصب اور لامحدود شخصی آزادی کا شوق یونان سے اور ضعف ایمان، جارحانہ قوم پرستی، طاقت کی تقدیس اور استعمار کی روح روم سے منتقل ہوئی۔ مسیحی تعلیمات کے بچے کھچے سرمایہ کو (جو شاید دس فیصد بھی نہ ہو) رومی بت پرستی اور سینٹ پال اور قسطنطین کی منافقت نے ڈبو دیا، اور اگر کچھ باقی رہا تو علمائے مذہب کی تحریف و تاویل نے گم کر دیا۔ رہبانیت کے جنون نے مادہ پرستی کے ردعمل کو پیدا کیا۔ ارباب کلیسا کی عیش پرستی اور دنیا داری نے اہل مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور نفرت پیدا کی۔ حکومت و کلیسا کی کش مکش نے قومی مزاج میں برہمی اور عدم توازن پیدا کیا اور دین و سیاست میں تفریق کی۔ مذہب و عقلیت کی خونی جنگ اور اہل دین کے جمود و نافہمی اور ارباب کلیسا کے دل خراش اور لرزہ خیز مظالم نے برائے نام مذہب کے خلاف نسلی اور موروثی عداوت کا بیج بویا۔ خام کار روشن خیالوں کی عجلت پسندی

اور تعصب نے مذہب کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدید مفکرین کائنات کی ہر چیز فیس پاؤڈر سے لے کر ایٹم بم تک پر تبصرہ کرنا اور اس کا Analysis کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ لیکن جس قضیے سے ان کا قلم چوک جاتا ہے وہ مذہب ہے۔ بہت کم مفکرین کے قلم سے مذہب کا لفظ نکلتا ہے اور اگر ذکر کرتے بھی ہیں تو تردید کرنے کیلئے۔۔۔ سید سعادت اللہ حسینی والٹر اینڈرسن (Anderson, Walter) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مابعد جدید مفکرین مذہبی عقاید اور تصورات کے بھی منکر ہیں۔ کیونکہ مذاہب کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کے معتقدات کی حیثیت اٹل حقائق (Meganarratives) کی ہے"۔ (57)

Wikipedia کا مقالہ نگار بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لیوٹارڈ نے صرف ایک Metanarrative کو Define کیا ہے اور وہ ہے Story of Progress یعنی انسان کی ترقی کا سفر، جو کہ اصل میں عقل کی روایت (Myth) پر فتح کی کہانی ہے۔ لیکن لیوٹارڈ کے بعد دیگر مفکرین نے ہر قسم کے مہابیانیے، جن میں مذہبی صداقتیں یا عقائد بھی شامل ہیں، ان کو Metanarrative کہہ کر رد کر دیا۔ اصل عبارت ملاحظہ فرمایئے:

> "There is only one metanarrative as defined by Lyotard. Modernists and philosophers address the problem by telling a story -- the story of progress through universal human reason -- as Logos triumphs over Mythos. The problem is that once a proof is accepted as the standard of believability not only must we prove our claims, we must also prove our proofs, and so on, ad infinitum. This is what Lyotard was referring to when he made the claim that the Postmodern condition is one of incredulity towards meta narratives. Only recently has the term "Metanarratives" been used to define religious narratives (or religions) which are actually pre modern narratives or, narratives that do not seek to place Logos over Mythos -- the great problem of the modern era." (58)

سچائی کی اضافیت کے نظریے کے حق میں یہ مفکرین غیر منطقی سا استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ صدیوں کی علمی جستجو کے باوجود انسانی ذہن کسی ایک سچائی پر متفق نہیں ہو سکا۔ آج بھی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اطراف کئی ایک اور بسا اوقات باہم متضاد سچائیاں (یعنی سچ کے دعوے) پائی جاتی ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم سچائی سے متعلق اپنا نقطہ نظر ہی بدل لیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ سچائی نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ سچائی محض ہمارے مشاہدے کا نتیجہ ہوتی ہے اور مشاہدہ ہمارے ذہن کی تخلیق۔ سچائی کی تلاش نہیں، بلکہ سچائی کی تشکیل ہوتی ہے۔ حالات کے مطابق ہمارا ذہن سچائی کی تخلیق کرتا ہے اور چونکہ بیک وقت ایسی کئی تخلیقات ممکن ہیں اس لیے یہ ماننا چاہیے کہ کوئی بھی تخلیق حتمی نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت کے ماننے والے سائنس کو بھی حتمی سچائی کی حیثیت سے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک سائنس بھی اپنے دعوے (Metanarrative) ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لیوٹارڈ (J.F Lyotard) لکھتا ہے:

"......In the first place, scientific knowledge does not represent the totality of knowledge; it has always existed in addition to, and in competition and conflict with, another kind of knowledge, which I call Narrative in the interests of simplicity. I do not mean to say that narrative knowledge can prevail over science, but its model is related to ideas of internal equilibrium and conviviality next which scientific knowledge cuts a poor figure, especially if it is to undergo an exteriorisation with respect to the "Knower" and an alienation from its user."

اسی کتاب میں آگے چل کر سائنسی علوم پر اپنی بے اعتمادی کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کرتا ہے:

"The right to decided what is true is not independent of the right to decide what is just, even if the statements consigned to these two authorities differ in nature. The point is that there is a strict inter linkage between the

kind of language called science and the kind called ethics and politics: they both stem from the same perspective the same "choice" if you will. the choice called the Occident." (59)

یعنی سائنس کی زبان اور اخلاقیات اور سیاسیات کی زبان میں گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق ہی مغرب کے تہذیبی تناظر کی تشکیل کرتا ہے یعنی سائنس بھی مغرب کی سیاست اور اخلاقی فلسفوں سے آزاد نہیں ہے اور اس سے پہلے لیوٹارڈ کا یہ مشہور فقرہ تو ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی تعریف ہی یہ کرتا ہے کہ مہابیانوں پر تشکیک ہی مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے:

I define postmodernism as incredulity towards metanarratives.

لیوٹارڈ آگے لکھتا ہے:

"This breaking up of the grand Narratives leads to what some authors analyse in terms of the dissolution of the social bond and the disintegration of social aggregates into a mass of individual atoms thrown into the absurdity of Brownian motion. It seems to me, is haunted by the paradisaic representation of a lost "organic" society."(60)

لیوٹارڈ اس بات پر زور دیتا ہے کہ سیاسی اور سماجی صورت حال یہ ہے کہ تمام فلسفیانہ، عارفانہ، تحکمانہ، منطقیانہ صورت واقعہ کی از سر نو جانچ کی جائے۔ اس لیے کہ یہ تمام عناصر (نظریات) کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اور آرگینک سوسائٹی کا خواب فردوس گم گشتہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی مہابیانیہ کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ یہ میٹانریٹو ہے کیا؟ ہم ایک زمانے سے ماورائیت پر اور کائناتی سچائیوں پر سر دھنتے آئے ہیں، انہیں اپنی سوسائٹی کا ایک عظیم نشان تصور کرتے ہیں، لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ عظیم بیانیے ہمیں بہت دور نہیں لے جاتے بلکہ ایک حکم کے ذریعے ہمارے پاؤں میں زنجیر پہنا دیتے ہیں۔''(61)

میں نے پروفیسر اشرفی کے الفاظ نقل تو کر دیے ہیں، لیکن محوِ حیرت ہوں کہ ایک مسلمان سکالر کے قلم سے ایسے بے یقینی والے الفاظ نکل کیسے سکتے ہیں؟ مغرب سے مرعوبیت اور مغربی مفکرین سے ذہنی شکست کی کوئی حد بھی ہونی چاہیے کہ نہیں؟ کیا موصوف کو شریعت اسلامیہ کی ہدایت سے بھرپور تعلیمات نظر نہیں آتیں جو آفاقی سچائیوں میں تصدیق شدہ بھی ہیں اور قابل عمل بھی!

اگر مہابیانیہ میں وہ تمام فکریاتی تھیسس ہو جسے ہم لوگ کبھی مارکسیت سے تعبیر کرتے ہیں یا اسی قبیل کی دوسری تسلیم شدہ حکیمانہ نام نہاد سچائیاں، جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے ہوتی ہے تو بات قابل تسلیم ہے۔ اور اگر مارکسیت کو شکست ہوئی ہے تو یہ ان کا پرابلم ہے۔ کل کلاں اگر سرمایہ داری ڈھے (Collapse) جائے گی تو اس سے یہ نتیجہ کہاں سے نکل آیا کہ تمام کائناتی صداقتیں اضافی اور قابل تردید ہیں۔

لیوتارڈ مہابیانیہ کے مقابلے میں Language Games کو رکھتا ہے۔ ایسے لسانی کھیل کیا ہیں؟ یہ وہ صورتیں ہیں جنہیں ہم کبھی مکالمے سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی کسی کام کے سلسلے میں جو صورت پیش آتی ہے اس میں تلاش کرتے ہیں اور کبھی اکہری معنیاتی سطح کو رد کرنے میں اس منزل سے گزرتے ہیں۔ چنانچہ Dialectics کے بارے میں یا Rationality کے سلسلے میں یا دوسرے وابستہ امور میں سائنس کا جو درجہ رہا ہے وہ حقیقتاً باقی نہیں رہا ہے بلکہ ایک طرح کے پاور گیم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیوتارڈ کا خیال ہے کہ جدید سائنس مہابیانیہ کے ذریعے اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہے، جو درست نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید ایک اقتباس دیکھیے وہ کہتا ہے:

"Postmodern science by concerning itself with such things as undeciables, the limits of precise control, conflicts characterized by incomplete information, "Fracta" catastrophes and pragmatic paradoxes is theorizing its own evolution as discontinuous, catastrophic, non rectifiable and paradoxical. It is changing the meaning of the word knowledge, while expressing how such a change can take place. It is producing not the known but the unknown. And it suggests a model of legitimation that has nothing to do

with maximized performance, but has as its basis difference understood as paralogy."(62)

اوپر کے مباحث جومہابیانیہ کے سلسلہ میں چل رہے ہیں وہ مندرجہ بالا اقتباس سے بھی عیاں ہیں۔غرض کہ لیوتارڈ ہر اہم سماجی قدر کے کسی نہ کسی تاریک پہلو کو بیان کر کے اسے مہابیانیہ کہہ کر رد کر دیتا ہے۔اس ضمن میں ایک اور اقتباس دیکھئے:

"We no longer have recourse to the Grand narrative. We can resort neither to the dialectic of spirit nor even to the emancipation of humanity as a violation for postmodern scientific discourse. But as we have just seen, the little narrative remains the quintessential form of imaginative innovation, most particularly in science." (63)

اس طرح لیوتارڈ مارکسیت اور سائنس کے حوالے سے مہابیانیہ کے رد کی کوشش کرتا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ وہ دانشوروں کے رول پر بھی ایک شک کی نگاہ ڈالتا ہے۔وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مستقبل میں فلسفیوں کا کام بھی مختلف ہو کر رہ جائے گا اس لیے کہ ان کا ذہن سیاست کے تابع ہو کر عوام کیلئے ایک سوالیہ نشان بناتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اب دانشور اس پوزیشن میں نہیں کہ کوئی اپنے طور پر فیصلہ لے۔۔۔ یہ ایک المیہ ہے! ایسی صورت میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آفاقیت کی کوئی بات بھی سوال زد ہونے سے محفوظ نہیں رہی۔

دیکھئے! مابعد جدید مفکرین (لیوتارڈ، رولینڈ، بارتھ وغیرہ) کا یہ کہنا کہ ''یہ دور مہابیانیہ (Meganarrative / Grandnarrative / Metanarrative / Masternarrative) کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہے اور مابعد جدیدیت ہر طرح کے مہابیانیہ کا رد کرتی ہے۔'' درج بالا بیان بھی تو مہابیانیہ (Grandnarrative) کے زمرہ میں آتا ہے، لہٰذا مہابیانیہ کے رد کے دعویٰ کو ہم استعباد (Paradox) کیوں نہ سمجھیں؟ ان مفکرین کا یہ دعویٰ ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کی کاٹ سے وار کرنے والا بھی محفوظ نہیں ہے۔

لیوتارڈ کے مابعد جدید صورت حال کے تجزیہ اور مہابیانیہ کے رد کو مغربی مفکرین نے بھی ہدف تنقید بنایا ہے اور اسے Internally inconsistent قرار دیا ہے۔مثلاً Jurgen

Habermas اور Alex Collinicos جیسے مفکرین کا کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت کے اس بیان ''مہابیانیہ پر تشکیک'' (Incredulity towards metanarratives) کو مہابیانیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مہابیانیے کی خصوصیت آفاقیت پسندی (Universalization) ہے اور مابعد جدیدیت کا، جدیدیت کے مہابیانیوں پر تشکیک کو آفاقی بنا کر پیش کرنا اسے مہابیانیہ ثابت کرتا ہے۔ Alex Collinicos کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

> "Lyotard's description of the postmodern world as containing an "incredulity toward metanarratives" could be seen as a metanarrative in itself. According to this view, poststructuralist thinkers like Lyotard and Barthes Criticise universal rules but postulate that post modernity contains a universal skepticism is, in itself a contemporary metanarrative. Like a Postmodern neo-romanticist meta narrative that intends to build up a 'meta' critic, or 'meta' discourse and a 'meta' belief holding up that western science is just taxonomist, empiricist, utilitarian, assuming a supposed sovereignty around its own reason and pretending to be neutral, rigorous and universal. This is itself an obvious sample of another 'meta' story, self contradicting the postmodern critique of the metanarrative." (64)

اور ہیبر ماس تو اسے (مہابیانیہ کے رد کو) Liar's paradox قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے:

> "Lyotard's Postmodern incredulity towards metanarratives could be said to be self refuting. If one is skeptical of universal narratives such as "Truth" (with capital T)، "Knowledge", "right" or "wrong", then there is no basis for believing the "Truth" that metanarratives are being undermined. In this sense, this paradox of Postmodernism is similar to the liar's paradox ("This statement is false.") Perhaps postmodernists, like

Lyotard, are not offering us a utopian, telelogical metanarrative, but in many respects their arguments are open to metanarrative interpretation. Postmodernism is anti-theory, but they use theoretical rules to make its case." (65)

postmodernism کے اس paradox کے بارے میں ایک اور مغربی عالم کی شہادت سنیے: مشہور امریکی سکالر رچرڈ ٹارنز (Richard Tarnas) کہتے ہیں:

"The paradox of the Postmodern position is that, in placing all principles under the scrutiny of its skepticism, it must realize that even its own principles are not beyond questioning. Postmodernism cannot on its own principles ultimately justify itself any more than can the various metaphysical overviews against which the postmodern mind has defined itself." (66)

مہابیانیہ کیا ہے؟

مہابیانیہ، مابعد جدیدیت کی فرنٹ لائن (Front Line) اصطلاح ہے اسے Grand Narrative اور Master Narrative بھی کہا گیا ہے۔ میٹا (Meta) یونانی لفظ ہے، جس کا معنی مابعد، ورا (Beyond) اور علاوہ ہے۔ جس طرح میٹافزکس (Meta physics) یا میٹا لینگوئج (Meta Language) وغیرہ۔ جب یہ کسی لفظ کے ساتھ بطور سابقہ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ایک نظری فریم ورک (Conceptual Framework) یا تھیوری ہوتا ہے۔ یہ فریم ورک یا تھیوری دراصل اس موضوع کی تجرید (Abstract) ہے، جس کا مطالعہ تھیوری کرتی ہے۔ مثلاً میٹافزکس یا میٹالینگوئج سے مراد فزکس یا زبان کی وہ First order تھیوری ہے جو ان کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس طرح میٹا نیریٹو سے مراد وہ نظری فریم ورک یا First order نیریٹو ہے جو بیانیے کا مطالعہ کرتی ہے۔ گویا میٹا نیریٹو، بیانیے سے متعلق وہ بیانیہ ہے جو مختلف بیانیوں اور بیانیاتی نظام کا تجزیہ کرتا ہے اور بیانیوں کی اصل سے ہمیں آگاہ کرتا ہے، میٹا بیانیہ اصولاً تمام گرینڈ اور مہابیانیوں کی تھیوری ہے۔ اسی لیے میٹا کے بدل کے طور پر کبھی گرینڈ اور کبھی ماسٹر کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ میٹا نیریٹو میں بیانیے کا مفہوم وہی ہے جو سب سے پہلے رولینڈ بارتھ اور پھر لیوٹارڈ نے اسے دیا ہے۔ انہوں نے بیانیے کو ادبی صنف کی محدودیت سے نکالا اور اسے ایک ساخت اور نظام قرار دیا ہے، جو متعدد علوم، کلاموں اور نظریوں میں کارفرما ہے۔

میٹا نیریٹو کے معنی بعض اوقات "Big Story" یا "Historical Story" بھی کیے جاتے ہیں۔ مختصراً اس سے مراد An explanation for everything that happens in a society. بھی لی جاتی ہے۔ Wikipedia کے مطابق:

> "Metanarrative/Grandnarrative/Masternarrative, is an abstract idea that is thought to be a comprehensive explanation of historical experience or knowledge. The prefix Meta means. "beyond" and is here used to mean "about" and a narrative is a story. Therefore, a metanarrative is a story about a story, encompassing and explaining other, little stories within totalizing schemes." (67)

جبکہ جان سٹیفنز (John Stephens) کے مطابق:

> "It is a global or totalizing cultural narrative schema which orders and explains knowledge and experience, the concept of Metanarratives is sometimes referred to as a "high level theory" or more usually, a perspective / ideology. Socialogical perspectives such as Marxism, Functionalism and Feminism are examples of what Postmodernists call metanarrative. Outside of sociology / social science, various political and economic metanarratives could be noted. The concepts of "Capitalism" for example or "Communism" and "Fascism" are examples of metanarratives, as are things like "Religion" (Roman Catholic, Protestantism, Islam and so forth). And, most controversially, science (and in particular "Big science" that argues, ultimately, all of the

laws governing the behaviour of matter in the universe can be discovered and eventually, related to a single unified law.)" (68)

درج بالا اقتباسات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کوئی نظریۂ حیات ہو، مذہبی عقائد ہوں، الہامی صداقتیں ہوں یا سیاسی و معاشی نظام ہائے زندگی سب پر مہابیانیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔اسی لیے لیوٹارڈ کا کہنا ہے کہ اگرچہ جدیدیت (Modernity) نے عقلیت پسندی (Rationalism) پر زور دے کر حکایتی (Mythological) انداز کی نفی کی اور خود کو Narrative کے طور پر پیش کیا۔ مگر جب عقلیت (Reason) کی بنیاد پر انسان کی بتدریج اور مسلسل ترقی کا تصور ابھرا تو یہ جدیدیت کی Narrative کی طرف مراجعت تھی۔ یعنی بیانیے کی ساخت نے سائنسی تصورات میں بھی اپنا اظہار کیا ہے۔ لیوٹارڈ کے الفاظ ہیں:

"Simplifying to the extreme, I define postmodernism as incredulity toward metanarratives (a grand narratives, typically characterised by some form of "transcendent and universal truth"). This incredulity is undoubtedly a product of progress in the sciences: but that progress in turn presupposes it. To the obsolescence of the metanarrative apparatus of legitimation corresponds, most notably, the crisis of metaphysical philosophy and of the university institution which in the past relied on it. The narrative function is losing its functors, its great heroes, its great dangers, its great voyages, its great goals. It is being dispersed in clouds of narrative language elements-narrative, but also denotative, perspective, descriptive, and so on." (69)

لیوٹارڈ نے میٹا بیانیے کی منطقی وضاحت کی بجائے اسے جدیدیت کے بیانیوں کے تناظر میں واضح کیا ہے۔ اولاً وہ کہتا ہے کہ مابعد جدید صورتحال تمام مہابیانیوں پر شبہ کرتی ہے، وہ تمام مہابیانیے جو جدیدیت نے تشکیل دیے تھے۔ جدیدیت کے مہابیانیوں میں سائنسی عقلیت کو کلی انسانی ترقی کا باعث قرار دینا، ڈارون کے نظریہ ارتقا کو انسانی نوعی ارتقا کا کلی نظریہ سمجھنا، فرائڈ کے نفسی ماڈل کو کلی

انسانی نفسی ماڈل ٹھہرانا، اور مغربی تاریخ کی ادوار بندی (Periodization) کو پوری انسانی تاریخ پر منطبق کرنا شامل ہیں۔ Wikipedia پر مہابیانیوں کی چند مثالیں دی گئی ہیں، جن پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مابعد جدیدیت کس قدر تحکمانہ (Assertive) رویہ اپناتی ہے اور ہر عالمی سچائی یا عقیدہ کو رد کرتی ہے۔ یہ مثالیں درج ذیل ہیں:

"**Examples of Metanarratives:**

1. Christians believe that human nature, since the Fall (Genesis 3), is characteristically sinful, but has the possibility of redemption. This representing a belief in a universal rule and a telos for humankind.

2. The Enlightenment theorists believe that rational thought, allied to scientific reasoning, would lead inevitably toward moral, social and ethical progress.

3. Muslims view: human history as the story of divine contact through prophets like David, Abraham, or Jesus demonstrating rationally impossible feats for human beings (miracles) as proof of authenticity. These prophets or their messages are resisted when introduced, and distorted or corrupted over time necessitating new prophets, the final one being Muhammad (SAW), and the uncorrupted Quran; victory ultimately being for those who have purified their hearts and accepted the divine nature of the world.

4. The Marxist-Leninists believe that in order to be emancipated, society must undergo a revolution. Just as the bourgeoisie took power form the noble class, they believe that the present system of capitalism will fall and the proletariats will take over.

5. Freudian theory holds that human history is a narrative of repression of libidinal desires.

6. Categorical and definitive periodization of history, such as the fall of the Roman Empire, the Dark Ages and Renaissance.

7. Many Feminists hold that the patriarchy has systematically oppressed and subjugated women throughout history.

8. The which Interpretation of History. where history was viewed as teleological process gradually leading to increased liberty and democracy." (70)

ان مثالوں کو بیان کر کے ہم یہ دکھانا چاہتے تھے کہ مابعد جدیدیت ،مہابیانیہ کے نام پر ہر عقیدہ، نظریہ یا صداقت کی تردید کرتی ہے۔وہ مہابیانیہ چاہے مذہبی عقیدہ ہو یا سماجی، سیاسی یا معاشی تھیوری ہو۔ مابعد جدیدیت کے مدعی کہتے ہیں کہ مہابیانیے محض اساطیر (Myths) ہیں جو ''صداقت'' کی مختلف شکلوں کو Legitimise کرنے کے لیے تراشی جاتی ہیں۔ اسی لیے معاشروں میں ان سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔کیا حقیقتاً ایسا ہے؟ ہم نہایت اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ پوسٹ ماڈرنزم کے اس دعویٰ کے خلاف سب سے بڑی دلیل دو حقائق کے مشاہدہ کی بنیاد پر ہے:

1۔ بہت سے معاشروں اور صورت حال (Perspective) میں لوگ آج بھی مہابیانیہ کی مختلف شکلوں اور مذہبی عقائد کو درست تسلیم کرتے ہوئے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اگر کسی کو یقین نہ آئے تو دنیا کے سب سے بڑے منظم مذہبی اجتماع ''مسلمانوں کے حج'' کو دیکھ لیے۔ ہندوؤں کے ''کنبھ میلے'' کا نظارہ کرلے یا Broadly Speaking سرمایہ داری کی مختلف شکلوں اور جمہوریت کے ذریعے حکومتوں کے انتخاب پر غور کرلے۔مشرق میں اسلامی لہر، ہندوتوا (شیوسینا، وشوا ہندو پریشد وغیرہ) سکھوں کی اکالی دل اور مغرب میں عیسائی بنیاد پرست جماعتیں (Jerry Springers and Jerry Falwells) وغیرہ ہزاروں، لاکھوں کے اجتماعات منعقد کرتی ہیں اور دسیوں لاکھ لوگ ان کے حمایتی ہیں۔کیا یہ مہابیانیہ پر یقین کے عملی مظاہر نہیں ہیں؟

2۔ اس بات سے قطع نظر کہ مہابیانیہ کا دور لد گیا (چاہے یہ مذہبی ہوں یا سیکولر) اصل صورت

حال یہ ہے کہ مختلف معاشروں میں آج بھی مہابیانیہ پر یقین وایمان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ/مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، چاہے یہ معاشروں میں سماجی سطح پر ہوں یا مذہبی جذبات کی لہر، جنہیں مغرب والے اسلامی بنیاد پرستی یا اسلامی شدت پسندی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے مختلف مظاہر (Phenomenon) میں سے ایک مظہر مذہب کی طرف (قطع نظر مسلمانوں کے، تمام زندہ مذاہب میں یہی صورتحال ہے) رجوع ہے، دوسرے لفظوں میں مذہبی شدت پسندی کا رجحان ہے۔کیا خیال ہے مذہبی رجحان مہابیانیہ کے رد کا اعلان ہے یا مہابیانیہ کی صداقت پر یقین کا اظہار؟

مشہور امریکی مفکر "V.E.Taylor" کلچر اور شناخت (Culture and Identity) پر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ مختلف معاشروں میں بہت سے Metanarratives پر یقین کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔اس کے آرٹیکل کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں:

> "Taylor (Investigating "Culture and Identity") for example notes various examples of Meta-narrative belief that fall into one or something both of the above categories (Christian Fundamentalism) in America and Iranian (Muslim) revolution." (71)

ٹیلر موصوف شاید مشرق وسطیٰ، افغانستان اور برصغیر میں اسلامی لہر کو محسوس نہیں کر سکے ورنہ وہ اسے بھی Islamic Fundamentalism میں شمار کر لیتے۔

سچائی کی اضافیت کیا ہے؟ (Contextualization and Relativity of Truth)

مابعد جدید مفکرین مہابیانیہ کو رد کرتے ہیں اور عالمی تناظر میں کسی بھی سچائی یا نظریہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کے مقابلے میں Mininarratives کو مقامی (Localised) تناظر میں قبول کرتے ہیں۔ان کے بقول یہ صداقتیں مقامی سطح پر سچ ہو سکتی ہیں (چاہے ایک دوسرے متضاد ہی کیوں نہ ہوں) لیوٹارڈ کے الفاظ ہیں:

> "With the transition form modern to postmodern, metarratives should give way to petits recits, or more modest and 'localised' narratives." (72)

پروفیسر ہینز برٹن (Hans Bertens)، لیوٹارڈ کی لسانی کھیل (Language game) کی تھیوری کو مزید تقویت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مقامی ثقافتوں کے مقامی تناظر میں انسانی تجربات کی تکثیریت ہی اصل صداقت ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

"Borrowing from the works of Wittgenstein and his theory of the "models of discourse." Lyotard constructs his vision of a progressive politics that is grounded in the cohabitation of a whole range of diverse and always locally legitimated language games."

وہ مزید رقمطراز ہیں:

"Postmodernists attempt to replace metanarratives by focusing on specific local contexts as well as the diversity of human experience. They argue for the existence of a "multiplicity of theoretical stadpoints", rather than Grand, all-encompassing theories." (73)

Encyclopaedia of Faith and Reason کا مقالہ نگار Postmodernism کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتا ہے:

"Postmodernism is largely a reaction to the assumed certainty of scientific, or objective, efforts to explain reality. In essence, it stems from a recognition that reality is not simply mirrored in human understanding of it, but rather, is constructed as the mind tries to understand its own particular and personal reality. For this reason, postmodernism is highly skeptical of explanations which claim to be valid for all groups, cultures, traditions, or races, and instead focuses on the relative truth of each person. In the Postmodern understanding, interpretation is everything; reality only comes into being through our interpretations of what the world means to us individually.

Postmodernism relies on concrete experience over abstract principles, knowing always that the out come of one's own experience will necessarily be fallible and relative, rather than certain and universal. Post modernism is "Post" because it denies the existence of any ultimate principles, and it lacks the optimism of there being as scientific, philosophical, or religious truth, which will explain everything for everybody." (74)

یعنی صداقت کے تیقن کی کوششوں (سائنسی، خارجی) کے خلاف ردعمل کو مابعد جدیدیت کہتے ہیں مختصراً یہ کہ صداقت محض انسانی فہم کی عکاسی نہیں ہے بلکہ یہ ذہن کی اپنی ذاتی تخلیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ سچائی جو تمام نوع انسانی کے لیے صداقت کا دعویٰ کرے مابعد جدیدیت کے نزدیک مشکوک ہے۔ بلکہ صداقت اضافی ہوتی ہے جو ہر معاشرے اور فرد میں مختلف ہوسکتی ہے۔ مابعد جدید ذہن کے مطابق اصل شے تفہیم ہے، حقیقت تب وجود میں آتی ہے جب انفرادی طور پر ہم اپنے دنیاوی تجربات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور ہر انسان کے تجربات دوسرے کے لحاظ سے اضافی ہوتے ہیں نا کہ آفاقی! مابعد جدیدیت اسی لیے ''مابعد'' ہے کہ یہ ہر قسم کی حتمی سچائی، آفاقی اصول اور مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ Truth کے وجود کا انکار کرتی ہے جو آفاقیت کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ مابعد جدیدیت اسے جبری اور کلی تصور کہہ کر رد کرتی ہے۔ ہر تاریخی عہد اور ہر مظہر کو Localized تسلیم کرتی ہے اور اپنے مقامی تناظر میں تسلیم کرتی ہے۔ آفاقیت کے بجائے اضافیت، مابعد جدیدیت کا اہم مقدمہ ہے۔ نطشے (Nietzsche) کی عدمیت (Nihilism) کو بھی مابعد جدید فکر کی زنجیر کی اہم کڑی شمار کیا گیا ہے۔ نطشے کی عدمیت، اقدار اور معانی کے یکسر انکار سے عبارت ہے، درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"I consider life itself instinct for growth, for continuance, for accumulation of forces, for power: where the will to power is lacking there is decline. My assertion is that this will is lacking in all the supreme values of mankind that values of decline, nihilistic values hold sway under the holiest names." (75)

مابعد جدید مفکرین کے اس نظریہ کہ سچائی اضافی ہے اور صداقت کا وجود ممکن نہیں، کی تاریخ جاننے کی کوشش کی جائے کہ کب سے رائج ہے تو یہ جان کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس کا آغاز محض نطشے کے افکار سے نہیں ہوا، بلکہ اس سے بھی قبل اس کا سراغ ملتا ہے۔ انسان جب سے اپنی فکری تاریخ مرتب کر رہا ہے، تب ہی سے یہ سوال وجہ نزاع ہے کہ حق کیا ہے؟(What is the truth?) سچائی کا معیار کیا ہے؟ وغیرہ۔۔۔ ایک موقع پر جو تاریخ میں محفوظ ہے قدیم روم کے گورنر نے بے تاب ہو کر یہ سوال کیا کہ حق کسے کہتے ہیں؟ لیکن ذہین وفطین اور صاحب علم ہستی نے جو گورنر کے سامنے دست بستہ کھڑی تھی اور جس سے یہ استفسار کیا گیا تھا، جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس کے خیال میں شاید خاموشی ہی اس سوال کا بہترین جواب تھی۔ یہ سوال بارہا پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن بے فائدہ، اور آج تک اس کا اعادہ رہ رہ کر ہو رہا ہے!

جب افق یونان پر صبح علوم وفنون کی روشنی نمودار ہوئی اور قدیم مذہب کی ظلمت کافور ہونے لگی تو اس ملک کے متقی اور پرہیزگار اور فطین وفہیم شخص دماغی یاس کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔ انکساغورث فرط حیرت وتاسف سے کہتا ہے:

"کوئی چیز معلوم نہیں ہو سکتی، کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا، کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی قوت محدود ہے۔ عقل کی طاقت کمزور ہے۔"

زینوفینز (Xenophanes 570-470 BC) کا دعویٰ ہے کہ:

"ناممکن ہے کہ ہم حق بات کو بھی یقینی تصور کریں۔"

پارمینائڈز (Parmenides 510-450 BC) کا قول ہے کہ:

"انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔"

امپیڈاکلز (Empedocles 490-430 BC) کی رائے ہے کہ:

"ممکن ہے کہ کل فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں اس لیے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی معیار نہیں جس سے ہم ان کو جانچ سکیں۔"

دی مقراطیس (Democritus 460-361 BC) کا بیان ہے کہ:

"حقائق بھی ہمارے ذہن میں تیقن کا القا نہیں کر سکتے۔ انسانی تحقیقات کا انتہائی نتیجہ یہ نکتہ

ہے کہ اگر حقیقت اس کی مٹھی میں بھی ہوتی تو ہمیں اس کی موثوقیت پر یقین نہیں ہوتا۔"

فیرو کہتا ہے کہ:

"چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لیے ہمیں ہر شے کی نسبت اظہار رائے میں تامل کرنا چاہیے۔" اس فلسفی نے اپنے شاگردوں کو تشکک (Skepticism) کی اس حد تک تلقین کی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ: ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔" (76)

مابعد جدید مفکرین کی Anti theory اور Skepticism کے پیچھے یہی ذہنیت کارفرما ہے۔ غرض جس عام نتیجہ پر فلسفہ یونان پہنچا تھا وہ یہ تھا: **چونکہ حواس کی شہادت ناقابل اعتبار ہے اس لیے ہمارے پاس حق و باطل میں تمیز کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔** حق و صداقت سے لوگوں کا اعتبار اٹھ جانے کے پیچھے اہل مذہب کی باہمی آویزش اور ہر غلط عقیدے کی حمایت میں خود ساختہ دلائل تراش لینے کی غلط روش کارفرما تھی۔ جب فلاسفہ یونان نے باہم متضاد اور متصادم مذہبی عقائد پر حکیمانہ تنقید کی تو مختلف مذاہب کے عقائد کے باہمی مقارنہ اور تقابل سے ان نواقض کی بنا پر، جو ان میں پائے گئے، یہ ثابت کیا گیا کہ انسان کے پاس حق اور صدق کا کوئی معیار نہیں۔ نیکی اور بدی کے خیالات اس عالم کون ومکان میں سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ محض تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے کہ ایک معاشرے/ ملک میں جو بات بری سمجھی جاتی ہے وہی دوسرے ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔

یورپ کا ماضی بھی یہی بتاتا ہے کہ اہل مذہب نے الہامی صداقتوں کا جو حشر کیا اور پھر مذہب کے نام پر جو کچھ کیا وہ علوم جدیدہ کے سامنے باطل ٹھہرا۔ پھر بعد میں جدیدیت کے دور میں مذہب کو ہی رد کر دیا گیا۔ آج دورِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کی سرعت اور اثر پذیری نے مذاہب کی آویزش کو ایک بار پھر نمایاں کر دیا ہے۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں اور یہ تعلیمات باہم متصادم اور متضاد ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسلام آج Spirit میں کہیں نظر نہیں آتا۔ دنیا میں اسلام غالب حالت میں نہیں ہے بلکہ مغرب میں مغلوب حالت میں ہے اسلام کی صحیح تعلیمات کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ اسلام کا وہ ورژن (Version) قابلِ قبول ہے جو Corrupt اور polluted ہے۔ صاف ستھری اور قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات کو دہشت گردی کی تعلیم کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ ایک سازش کے تحت ان علماء کو میڈیا پر آنے نہیں دیا جاتا جو اسلام کی صحیح

نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کو مختلف ناموں مثلاً بنیاد پرست، دہشت گرد، شدت پسند، رجعت پسند وغیرہ سے بدنام کیا جاتا ہے اور وہ علماء مغرب کے چہیتے ہیں جو اجتہاد کے نام پر دین میں تحریف کرنے سے نہیں چوکتے، جو جدت کے نام پر تجدد اور اعتزال کی فکر کو عام کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ Neutral ذہن جب عیسائیت، یہودیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ اس سے فرار کا آسان ترین راستہ یہی اپنایا جاتا ہے کہ صداقت کا وجود کہیں نہیں ہے۔ عالمی سچائی کوئی نہیں۔ تمام متضاد دعویٰ ہائے صداقت اپنے Local تناظر میں سچے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

سچائی کی اضافیت اور مہابیانیہ کا رد: ایک تنقیدی جائزہ

مابعد جدیدیت کے ان نظریات کی لغویت پر ہم پہلے بھی کچھ بیان کر چکے ہیں اور مزید تنقیدی تجزیہ بھی کریں گے۔ اس سے پہلے مغرب سے درآمد کردہ چند آرا پیش ہیں جو اس تھیوری کا استہزائیہ انداز میں رد کرتی ہیں۔ 1994ء میں جمہوریہ چیک کے اس وقت کے صدر نے مابعد جدیدیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے نظریہ تشکیک کو ہدفِ تنقید بنایا۔ صدر جمہوریہ چیک Vaclaw Havel کے الفاظ ہیں:

> "Postmodern world, one based on Science, and yet paradoxically "where everything is possible and almost nothing is certain."(77)

جوش میکڈویل اور بوب ہوسٹیٹلر نے اپنی مشترکہ تحریر میں مابعد جدیدیت کے تحکمانہ انداز کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ اگر سچائی موجود نہیں تو مابعد جدیدیت کا یہ دعویٰ بھی تو غلط ہے! کیونکہ سچائی کا وجود جو نہیں۔ Josh McDowell & Bob Hostetler کے الفاظ ہیں:

> "........A worldview characterized by the belief that truth doesn't exist, but is created rather than discovered. Therefore, any system or statement that tries to communicated truth is a power play, so is the Postmodernism itself."(78)

مشہور اطالوی ماہر سیمیالوجی Umberto Eco نے مابعد جدیدیت کا درج ذیل انداز میں استہزا اڑایا ہے:

> "The Postmodern attitude as that of a man who loves a very cultivated woman and knows he cannot say to her. I love you madly, because he knows that she knows (and that she knows that he knows) that these words have already been written by Barbara Cartland."(79)

ہماری گزارش ہے کہ مابعد جدید مفکرین کا یہ دعویٰ کہ دنیا میں کسی سچائی کا سرے سے وجود نہیں ہے ایک نہایت غیر منطقی دعویٰ ہے۔ اس دعویٰ میں بہت بڑا ریاضیاتی نقص (Mathematical Mistake) ہے۔ یہ کہنا کہ یہ سچ ہے کہ دنیا میں کوئی سچ نہیں، ایک بے معنی بات ہے۔ دنیا میں کوئی سچ نہیں ہے۔'' یہ بذات خود ایک دعویٰ اور ایک بیان ہے۔ اگر اس بیان کو درست مان لیا جائے تو اس کی زد سب سے پہلے خود اسی بیان پر پڑے گی۔ اور یہ بیان جھوٹا قرار دیا جائے گا۔ یہ ماننے کے لیے کہ'' دنیا میں کوئی سچ نہیں ہے'' کم سے کم اس ایک بات کو سچ ماننا پڑے گا پیچھے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مشہور مفکر جرگن ہیبر ماس (Jurgen Habermas) تو اسے (مہابیانیہ کے رد کو) Self-refuting اور Liar's Paradox قرار دیتے ہیں۔ Liar's Paradox یہ ہے کہ جب جھوٹا کہے، یہ بیان جھوٹ ہے۔ (This statement is false.) تو اس کی یہ بات اگر تسلیم کر لی جائے تو پھر اسے سچا ماننا پڑے گا اور اگر اسے سچا تسلیم کر لیا تو پھر اس کے اس بیان (یہ بیان جھوٹ ہے) کی وجہ سے وہ جھوٹا قرار پائے گا۔ یعنی جھوٹا شخص سچ کہنے کے باوجود بھی جھوٹا ہی ہوگا۔ لیکن دوسری طرف الجھن یہ ہوتی ہے کہ جھوٹے کی ہر بات جھوٹ تھوڑا ہوتی ہے۔ اس لیے جب بیان خود اپنی تکذیب کر رہا ہو تو اسے Liar's Parodox کہا جاتا ہے۔

Postmodernists ہر عالم گیر سچائی کے دعوے کو بڑا بول (Metanarrative) کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پیمانے پر خود مابعد جدیدیت کو بڑا بول کیوں نہ قرار دیا جائے؟ خود ساختہ سچائیوں کی رد تشکیل کی یہ فکر ایسا جال بچھاتی ہے کہ اس میں خود ہی پھنس جاتی ہے اور خود اپنے اصولوں کے ذریعے اپنے ہی اصولوں کا رد کرتی ہے۔ غالباً یہ انسان کی فکری تاریخ کا نہایت منفرد واقعہ ہے کہ کوئی فکر اپنے تشکیل کردہ پیمانوں سے اپنی ہی بنیادوں کو ڈھا دے۔ اگر انسان کی بنائی ہوئی تمام

تھیوریز مثلاً روشن خیالی، رومانیت، صنعتیت، جدیدیت، Enlightenment، Romanticism، Industrialization وغیرہ محض اس لیے رد کر دی جاتی ہیں کہ یہ Man-made Theories اور Relative ہیں۔۔۔ تو یہ کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے کہ مابعد جدیدیت بھی تو چند مفکرین (انسانوں) کی سوچ کا نتیجہ ہے اور ایک ردِعمل کی تھیوری ہے اور ایک ایسی ''صداقت'' ہے جو دیگر ''صداقتوں'' کے ردعمل میں نمودار ہوئی ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر اسے بھی رد کر دیا جائے۔

Mathematical and Logical Contradiction کے علاوہ اس فکر کے عملی اثرات بھی نہایت بھیانک برآمد ہوئے ہیں اور مزید ہو سکتے ہیں۔ اگر سچائی اضافی ہے اور دنیا میں کوئی قدر آفاقی نہیں ہے اور سچائیاں مقامی تہذیب وثقافت کی پیداوار ہیں تو سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر مثلاً نازی ازم یا فاشزم (یا ان کے بقول اسلامی شدت پسندی) کو غلط قرار دیا جائے گا؟ آخر نازی ازم یا فاشزم بھی ایک قوم کے اتفاق رائے ہی کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح عرب ممالک کی بادشاہتوں کا نظام یا کاسترو کی آمرانہ حکومت وغیرہ۔۔۔ آخر وہ بھی تو اپنی قوموں کی رضامندی سے حکومت کر رہے ہیں، اور کئی عشروں سے ایک ہی شخص مسلط رہتا ہے۔ لیکن مابعد جدیدی اسے بھی Condemn کرتے ہیں۔۔۔ آخر کس بنیاد پر؟ کس اصول کے ذریعے؟ اس بات کو دوسرے طریقے سے سمجھیں کہ کس بنیاد پر ایک شخص کو دوسروں کی جیب کاٹنے سے روکا جائے گا؟ اس لیے کہ ہر جیب کترا جس مخصوص تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھتا ہے وہ اسے جیب کترنے کے عمل کو ایک ناگزیر حقیقت کے روپ میں ہی دکھاتا ہے، افغانستان، کولمبیا یا دنیا کے دیگر ممالک میں کسانوں کے پوست (opium) کے کھیت اقوام متحدہ (UNO) کی زیرِ نگرانی جلا دیے جاتے ہیں اور پوست کی کھڑی فصلیں آخر کیوں تلف کر دی جاتی ہیں؟ ان لوگوں/کسانوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہے اور نقد آور فصل ان کے مطابق پوست ہی ہوتی ہے اور ان کا اتفاق رائے ہوتا ہے کہ یہ منافع بخش فصل ہے لیکن پھر بھی اقوام متحدہ ان کا یہ موقف بجا طور پر تسلیم نہیں کرتی۔ آخر اس تضاد کا مابعد جدیدیوں کے نزدیک کیا جواب ہے؟ یا اگر کوئی منچلا شراب کے نشے میں دھت، راہ چلتی عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کرے تو آخر کس بنیاد پر اسے اس بے ہودہ حرکت سے روکا جائے گا؟ یا اگر کوئی صاحب افیون کھا کر چلتی ٹرین سے یہ سمجھ کر نہایت صبر وسکون کے ساتھ باہر نکلنے کی

کوشش کریں کہ وہ اپنے گھر کے پائیں باغ میں تشریف لے جا رہے ہیں تو کس دلیل سے انہیں اس حماقت سے باز رکھا جائے گا؟ وہ شرابی نوجوان اور افیونی صاحب نہایت ایمان داری سے وہی سچائی دیکھ رہے ہیں جو نشے کے اثر سے پیدا شدہ ان کے ''مخصوص احوال'' (contextualized circumstances) انہیں دکھا رہے ہیں۔ اسی طرح مغربی ممالک میں Lesbian اور Gay کلچر کو قانونی اور سماجی طور پر Accept کر لیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے خاندان کا ادارہ (Family Institution) معدومیت کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس بات کا ان کے مفکرین کو بھی شدید احساس ہے لیکن وہ اسے منع نہیں کر پا رہے۔ حکومتیں بھی without wedlock partnership کو روکنے سے قاصر ہیں، کیوں کہ ان کے مخصوص تہذیبی و ثقافتی تناظر میں ایسا کرنا درست ہے اور مفکرین یا حکومتوں کے پاس اسے روکنے کا کوئی جواز نہیں۔ اسی طرح باہمی رضامندی سے جنسی تعلق کے جو بھیانک نتائج مغربی معاشرے بھگت رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لیے مابعد جدیدیت کے نظریۂ تکثیریت اور تعدد صداقت (Pluralism of Truth) کا تقاضا ہے کہ ان کی اختیار کردہ سچائی کو بھی تسلیم کیا جائے۔

معروضی اور زمینی حقائق (Objective and Ground Realities) کا تقاضا ہے کہ سچائی کی اضافیت (Relativity of Truth) کے نظریے کو مان لینے کے بعد اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کچھ حقائق پر عالمی اتفاق رائے نہ ہو اور انہیں قطعی (ultimate) حقائق کے طور پر قبول نہ کیا جائے، اس وقت تک تمدن کی گاڑی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جہاں کچھ باتوں پر اختلاف رائے تمدن کو رنگا رنگی اور تنوع (Diversity) بخشتا ہے وہیں کچھ باتوں پر اتفاق (Consensus) تمدن کو استحکام عطا کرتا ہے اس لیے اختلاف اور اتفاق دونوں کی ضرورت ہے۔

دنیا میں آج بھی ایسی آفاقی صداقتیں موجود ہیں جو مقامیت اور ثقافت سے بالا ہیں ان پر تمام مہذب معاشروں کا اتفاق ہے مثلاً انصاف، انسانی جان کا تقدس، جنگ پر امن کو ترجیح، دیگر انسانوں کے ساتھ دوستی اور محبت کے بامعنی رشتے قائم کرنا وغیرہ۔ مابعد جدیدیوں کو پتہ ہو یا نہ ہو لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ پتہ ہے کہ یہ آفاقی قدریں انسانی ''فطرت'' میں خالق کائنات نے ودیعت کر دی ہیں۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

"فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ(80)

اور حدیث پاک ہے:

"کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودنہٖ وینصراہٖ ویمجسانہٖ"(81)

سچائی کی اضافیت اور اسلامی نقطۂ نظر:

سچائی کی اضافیت کا نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک باطل نظریہ ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان کو دیگر مخلوقات سے جس خصوصیت کی وجہ سے ممتاز کیا گیا ہے وہ عقل ہے۔ اور اسلام نے عقل کے جائز مقام کو تسلیم بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تمام مذاہب میں عقل کو کیا درجہ دیا گیا ہے اور اسلام نے عقل کی کیا منزلت قائم کی ہے؟ دنیا میں آج جتنے بھی مذاہب موجود ہیں، ان سب میں تلقین کی ابتدا اس حکم سے ہوتی ہے کہ "مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔" یہی جابرانہ حکم ہے جس کی بدولت مذہب ہر قسم کی **"تحقیقات"** اور تنقید سے **"محفوظ"** رہتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ایک شخص منطق، فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت بڑا اسکالر ہوتا ہے اور ارسطو و افلاطون کی غلطیاں نکالتا ہے، لیکن جب اس کے سامنے اس مسئلہ کا ذکر آتا ہے کہ "تین ایک ہیں اور ایک تین" (Trinity) ہیں تو اس کی ساری ذہانت اور دانائی جواب دے جاتی ہے اور اسے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ سقراط جان دیتے وقت وصیت کرتا ہے کہ "فلاں بت پر میں نے نذر چڑھانے کی جو منت مانی تھی وہ پوری کی جائے"۔ (82) اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام مذاہب میں سینکڑوں علماء و حکما پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن مذہب کے لغو سے لغو (Absurd) عقیدہ کی نسبت بھی ان کو شک نہیں گزرا۔ عقل کو درست سمت میں استعمال نہ کرنے سے صرف یہ نقصان نہیں پہنچتا کہ جو لغو عقیدہ ایک دفعہ قائم کر لیا گیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہتا ہے بلکہ توہمات اور عجائبات پرستی کا زور روز بروز بڑھتا رہتا ہے، بالآخر مذہب کے صحیح عقائد بھی ان توہمات کے بادل تلے چھپ جاتے ہیں۔ اور مذہب عجائبات اور ناممکنات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نشاۃ ثانیہ، تحریک تنویر اور جدیدیت کی تحاریک نے سب سے پہلی ٹکر مذہب سے لی اور آخر کار سوسائٹی سے مذہب کو بے دخل کر دیا۔

لیکن شریعت اسلامیہ عقل انسانی پر اعتماد کرتی ہے مگر اس میں مغیبات/ مابعد الطبعیات پر اعتقاد کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ اسلام اس بات کا قائل ہے کہ عقل انسانی کے ذریعے مستنبط حقائق یقیناً

اضافی ہیں اور شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ اس حد تک مابعد جدیدیت اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک جن حقائق کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے وہ حتمی اور قطعی ہیں۔ ان کی جزوی تشریحات وتعبیرات (جس میں فہم انسانی اور عقل انسانی کا دخل ہے) تو اضافی (Relative) ہوسکتی ہیں بلکہ ہیں۔ اسی لیے تو فقہی اختلافات بہت زیادہ ہیں اور ایک ہی مذہب (School of thought) کے اندر بھی آئمہ کا اختلاف رائے ہے لیکن یہ اختلاف فروع (Branches) میں ہے نہ کہ اصول (Roots) میں۔ لیکن وہ حقائق جن کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور ان کے واضح معنی ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی (Ultimate and Final) ہیں۔ اتباع حق کا عمل اس امت کے اندر اس قدر تسلسل کے ساتھ ہوا ہے اور نسل در نسل اور کڑی در کڑی اس شدید حد تک مربوط ہے اور کہیں رکے یا روپوش ہوئے بغیر اصحابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیدھا بے ساختہ یوں جا ملتا ہے کہ 'پہلوں' کے ذخیروں سے ایک بات کا ثبوت نہ دیا جاسکنا اور ایک 'مکتب فکر' کا محض 'تحقیق' کے نتیجے میں سامنے آجانا اس کے مُحدَث اور ''فهـــــــــــــــو رد'' ہونے پر مہر تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئمہ اہل سنت نے کیا سچ کہا۔ انقطاع۔ یعنی دین کی کسی تعبیر کا پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جاسکنا۔ اس کے باطل ہونے کے لیے کافی اور بجائے خود ایک دلیل ہے۔

کیا واقعتاً ہمیں منہج سلف کا پابند کیا گیا ہے؟

مقدمہ فی اصول التفسیر میں شیخ الاسلام امام احمد بن تیمیہؒ کہتے ہیں:

''یہ بات جان لی جانا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جس طرح قرآن کے الفاظ بیان کرکے دیے ویسے ہی اس کے معانی بھی واضح کرکے دیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "لتبین للناس مانزل الیهم" (النحل 44) میں جہاں وہ بات آتی ہے وہیں یہ بات بھی آتی ہے۔ ابوعبدالرحمن السلمی کہتے ہیں: وہ لوگ جو ہمیں قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ مثلاً عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ وہ ہمیں بتایا کرتے تھے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سبق میں لیتے تو اس وقت تک اگلے سبق پر نہ جاتے جب تک وہ ان دس آیات میں علم اور عمل کی ہر بات سیکھ نہ لیتے۔ کہا کرتے: سو یوں ہم نے قرآن سیکھا تو اس کا علم اور عمل ایک ساتھ سیکھا۔'' (83)

اور امام مالکؒ کا یہ واقعہ تو فقہ کی اکثر کتب میں مرقوم ہے کہ جب ان کے پاس ایک شخص آیا

اور دین کے کچھ بنیادی امور میں آپ کو بحث و گفتگو کی دعوت دی۔ امام مالکؒ کو اس کا کہنا تھا: ''آیئے! بات کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر میں جیت جاؤں تو آپ میرے ہم خیال ہو جانا اور اگر تم جیتو تو میں آپ کا ہم خیال ہو جاؤں۔ (کیا خیال ہے! امام مالکؒ سے متھا (challenge) لگانے والا کوئی معمولی سکالر ہوگا؟) ''اور اگر کوئی تیسرا شخص ہم دونوں کو خاموش کرا دے۔۔۔'' ؟ امام مالک نے اس تجویز پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا''۔۔۔ تو ہم اس کی بات تسلیم کر لیں گے۔'' اس شخص کا جواب تھا (بظاہر اس شخص کا موقف اصول پر مبنی تھا) مگر امام مالکؒ نے اس کا جو جواب دیا حقیقت میں وہ آئمہ سلف ہی کا حصہ ہے، فرمایا:

''تو کیا جب بھی کوئی نیا شخص میدان میں آئے اور پہلے والے سے بڑھ کر دلیل دے لینے کی مہارت دکھائے تو ہم اپنا دین اور راستہ تبدیل کر لیا کریں؟ سنو! میں اپنا دین یقینی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ تمہیں اپنا دین تا حال معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو۔'' (84)

عقل انسانی بہر حال عطیۂ خداوندی اور شرف انسانیت ہے اسی لیے تو قرآن نے بار بار غور و فکر اور فہم و تدبر کی دعوت دی ہے۔ چند مقامات کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کی بنیاد محض تقلید پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ آزادانہ سوچ پر ہے۔ گویا عقیدہ توحید انسان کی حریت کا اعلان ہے نہ کہ اس کی غلامی اور تقلید کا۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں۔ وہ آیات جن میں عقل یا اس کے مشتقات موجود ہیں۔ ان کی تعداد ڈاکٹر عبدالباقی کے مطابق انچاس ہے۔ (85) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار...... لآیات لقوم یعقلون'' (86)

(بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور دن رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید میں یہودیوں، عیسائیوں، بت پرستوں اور ملحدین کو سینکڑوں مرتبہ عقائد اسلام کی دعوت دی گئی ہے، لیکن ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ تقلیداً ان عقائد کو مان لو۔ بلکہ ہر جگہ غور و فکر سے ان کو منوانا چاہا ہے اور تقلید پرستی کی سخت برائی کی ہے۔ مخالفین اسلام کو سب سے بڑا الزام ہی یہ دیا گیا کہ:

"وكاين من اية في السموات والارض يمرون عليها وهم عنها معرضون"(87) (آسمان اور زمین پر کس قدر نشانیاں ہیں، لیکن یہ ان پر گزر جاتے ہیں۔ ان کی طرف رخ نہیں کرتے)۔ دوسرے مقام پر فرمایا: "لهم قلوب لا يفقهون بها" (88) (ان کے دل تو ہیں لیکن اس سے سمجھ کا کام نہیں لیتے)۔

2۔ اسلامی عقائد میں غیب پر ایمان ایک محدود دائرہ میں ہے اور غیبی عقائد بھی ایسے ہیں جو حد درجہ معقول ہیں مثلاً:

"ان تومن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الاخر وتومن بالقدر خيره وشره (89)

(تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، اور اچھی بری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے)۔ غیب سے تعلق رکھنے والی ان مخصوص اشیاء پر ایمان کا مطالبہ صرف اسی صورت میں کیا جا رہا ہے کہ یہ اشیاء قطعی اور عقلی دلائل سے ثابت ہیں۔

3۔ متعدد مقامات پر وحی کو جو قرآن وسنت کی شکل میں ہے، حکمت قرار دیا گیا ہے:

"وما انزل عليكم من الكتاب والحكمة" (90)

(اور جو کتاب وحکمت تم پر اتاری گئی ہے)۔

ويعلمهم الكتاب والحكمة"(91)

(اور وہ کتاب اور حکمت سکھایا کرے)۔

شریعت اسلامی کی بنیاد حکمت اور عقل سلیم پر ہے نہ کہ خواہشات، حماقتوں اور خرافات پر، یہ ایک بامقصد شریعت ہے۔ چنانچہ اسلام کے سوا دنیا میں کسی اور مذہب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عقل سے ثابت ہے اور مذہب کو عقل کی بنا پر ماننا چاہیے۔ اور یہ وہ بڑا فرق ہے جو اسلام کو اعلانیہ تمام دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ بات نوٹ کر لینا چاہیے کہ محض عقل سلیم ہی سے تمام مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ تنبیہ کرتے ہیں:

''انسانی عقل پر شریعت کے اعتماد کا مفہوم محض یہ نہیں کہ شریعت میں منطقی طرز قیاس کو

یونانی تہذیب کی طرح اختیار کیا گیا ہے، بلکہ یہاں استقرائی اور تجربی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے جس کا اظہار اس اصولی قیاس کے ذریعہ ہوتا ہے جس کی دعوت قرآن وسنت دیتے ہیں۔ دور جدید میں سائنسدان جو سائنسی طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں، یہ تمام طریقے مسلمان صدیوں پہلے ہی اختیار کر چکے تھے اور وہ تجربی تحقیق سے بھی آگاہ تھے۔ یہ سائنسی طریقہ کار (Scientific Method) سسلی اور اٹلی سے فرانس اور انگلستان کی جامعات میں پہنچا، جہاں موجودہ مغربی تہذیب کی بنیاد اسی سائنسی طریقہ پر رکھی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق یا یونانی فلسفہ اس جدید مغربی سائنسی طریقہ کی بنیاد نہیں ہے۔"(92)

اس ساری بحث میں اسلام کا نقطۂ نظر نہایت معتدل، متوازن اور عقل کو اپیل کرنے والا ہے۔ اس نقطہ نظر میں مابعد جدیدی مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات بھی موجود ہیں۔ اور ان تضادات کی بھی گنجائش نہیں ہے جو مابعد جدیدیت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بات کہ عقل انسانی حتمی نہیں ہے اور بسا اوقات دھوکا کھا جاتی ہے، اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کوئی نئی فکر نہیں ہے۔ جدیدیت نے جس طرح عقل انسانی کو حتمی اور قطعی مقام دیا اور عقلیات کو حتمی سچائی کے طور پر پیش کیا، اس پر مابعد جدیدی مفکرین سے بہت پہلے اسلامی مفکرین جرح کر چکے ہیں۔ بلکہ یہ بحث صدیوں قبل امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے افکار میں بھی ملتی ہے۔

امام غزالیؒ نے "تہافتہ الفلاسفہ" میں ارسطو کی منطق پر خود اسی منطق کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے جو تنقید کی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عقل کے ذریعے معلوم حقائق کو محض واہمہ قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کی وسعتیں اور وقت (Time and space) لامحدود ہے اور انسانی عقل لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کے مشاہدات اضافی ہیں اور ان مشاہدات کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج بھی اضافی ہیں۔ امام غزالیؒ سوال کرتے ہیں کیا عقل ودانش کے بل پر توحید کا اثبات ممکن ہے؟

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں:

"اس معاملے میں حکما کی واماندگی واضح ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی توحید کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ جب باری تعالیٰ بسیط اور واحد ہے تو یہ کثرت وتعدد، دورو یہ بوقلمونی اور تنوع کیونکر معرض وجود میں آیا؟ اس معاملے میں حکما کے پاس (عقل کی بنیاد پر) کوئی جواب

نہیں۔" (93)

اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسانی حسیات کے ذریعے حاصل شدہ معلومات اکثر اوقات دھوکے کا باعث ہوتی ہیں۔ صرف آنکھ سے دیکھا جائے تو ستارے چھوٹے چھوٹے ذرات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ان میں سے کئی ستارے زمین اور سورج سے بھی بڑے ہیں۔ اور یہ تو روزمرہ مشاہدہ کی بات ہے کہ لاٹھی اگر آدھی پانی سے باہر ہو اور آدھی شفاف پانی کے ٹب میں تو ٹوٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دایاں ہاتھ اگر ٹھنڈے پانی میں اور بایاں گرم پانی میں رکھیں اور کچھ دیر بعد دونوں ہاتھ نارمل پانی میں ڈالیں تو یہ پانی دائیں ہاتھ کو گرم اور بائیں کو ٹھنڈا لگے گا۔ مٹھائی کھانے کے بعد کیلا میٹھا نہیں لگے گا کیونکہ زبان کے Taste Buds ہمیں دھوکہ دے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حواس خمسہ سے حاصل کردہ علم اور نظر آنے والے حقائق بھی ضروری نہیں کہ حقائق (Truths) ہی ہوں۔ وہ محض حقیقت کا سایہ/عکس یا واہمہ ہو سکتے ہیں۔ امام غزالیؒ سوال اٹھاتے ہیں حسیات کا دھوکہ عقل سے معلوم ہوتا ہے اور عقل کا دھوکہ کسی ایسے ذریعے سے معلوم ہوگا جو عقل سے بالاتر ہو۔ (یعنی وحی الٰہی) (94)

علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلے میں امام غزالیؒ اور ابن رشدؒ کی بحث بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ خالص عقلی طریقوں سے دنیا یا انسان کے بارے میں کسی آفاقی بیان تک نہیں پہنچا جا سکتا، اس لیے کہ جو بیان بھی تشکیل دیا جائے گا وہ اپنے عہد کے مخصوص مادی پس منظر سے ماورا نہیں ہوگا۔ (95)

جدید اسلامی مفکرین نے بھی جدیدیت پر کلام کرتے ہوئے عقل کی تحدید اور عقل کے ذریعے معلوم حقائق کے اضافی ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقم طراز ہیں:

> "انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا...... لیکن انسان کے علمی قیاسات غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخ علم میں

ایسے بہت کم قیاسات ونظریات کی نشان وہی کی جاسکتی ہے جو بالآخر غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں۔"(96)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن وتخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

یا

وہ علم، کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم، و مشاہداتِ حکیم

ایک اور رباعی ملاحظہ کیجئے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (97)

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علم حقیقی (یا حتمی اور قطعی سچائی) کا سرچشمہ باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس نے اپنے علم سے انسان کو اتنا ہی معمولی سا حصہ بخشا ہے جتنا وہ چاہتا ہے:

"ان اللہ لایخفی علیه شی فی الارض و لا فی السماءo (98)

(بے شک اللہ وہ ہے جس سے نہ زمین کی کوئی چیز مخفی ہے نہ آسمان کی)۔

"یعلم مابین ایدیھم وماخلفھم ولایحیطون بشیء من علمه الا بماشآء"o(99)

(جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس

کے علم میں ہے اور لوگ اس کے علم میں کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے، جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے)۔

اس طرح جو حقائق علم حقیقی کے سرچشمہ یعنی باری تعالیٰ کی جانب سے وحی الٰہی یا اس کے پیغمبر کی منصوص سنت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہوں وہ حتمی صداقت (Absolute Truth) ہیں اور ان کے ماسوا دنیا میں حقیقت کے جتنے بھی دعوے پائے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ اگر وہ وحی الٰہی سے متصادم ہیں تو وہ باطل مطلق (Absolute False) ہیں۔ اور اگر متصادم نہیں ہیں تو ان کی حیثیت اضافی صداقت (Relative Truth) کی ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ مختلف دنیاوی/ تدبیری امور و معاملات میں عقلی غلطی کا امکان عام انسان تو کجا پیغمبر کیلئے بھی موجود ہے۔ اسی لیے تو قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے:

"وشاورھم فی الامر"(100)

(اور تدبیری امور میں ان سے مشورہ کرلیا کیجئے)۔

غزوۂ بدر کبریٰ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے پہلے میدان بدر کے نزدیک ترین چشمہ پر پہنچ گئے۔ اس موقع پر حباب بن منذرؓ نے ایک ماہر فوجی کی حیثیت سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس مقام پر آپ اللہ کے حکم سے نازل ہوئے ہیں یا آپ ﷺ کی تدبیر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ محض جنگی حکمت عملی ہے۔ انہوں نے عرض کی یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ ﷺ آگے تشریف لے چلیں اور قریش کے جو سب سے قریب چشمہ ہو اس پر پڑاؤ ڈالیں۔ پھر ہم بقیہ چشمے پاٹ دیں گے اور اپنے چشمے پر حوض بنا کر پانی بھر لیں گے۔ اس کے بعد ہم قریش سے جنگ کریں گے تو ہم پانی پیتے رہیں گے اور انہیں پانی نہ ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے بہت ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ (101)

اس طرح زراعت وغیرہ کے بارے میں ذاتی رائے، مثلاً "تابیر نخل" کا مشہور واقعہ جو صحیحین وغیرہ میں موجود ہے کہ آپؐ نے کھجور کے نرزردانوں (Pollins) کو مادہ گچھوں (Ovaries) پر ڈالنے کے متعلق فرمایا کہ "اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو؟" مدینہ والوں نے آپ کی اس بات کو حکم سمجھ کر (Crossing) نہ کی۔ اگلے سال پیداوار کم ہوئی۔ انہوں نے عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا "انتم اعلم بامور دنیاکم" کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف

ہو۔ یہ معاملات تغیر و تبدل (Relative) کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:

"وثانيهما: ماليس من باب تبليغ الرسالة، وفيه قوله صلى الله عليه وسلم انما انابشر اذاامرتكم بشيء من دينكم فخذوابه واذاامرتكم بشي من رائي، فانما انابشر وقولهٗ صلى الله عليه وسلم في قصه تأبير النخل: فاني انما ظننت ظنا، ولاتو اخذوني بالظن، ومنه مافعله النبي صلى الله عليه وسلم علىٰ سبيل العادة دون العبادة وبحسب الاتفاق دون القصد." (102)

شاہ صاحب کی درج بالا عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے۔ یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الٰہی سے ماخوذ ہیں دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں مثلاً تابیر نخل وغیرہ، ان کی حیثیت عبادت کی نہیں بلکہ یہ ایسے افعال ہیں جو عادتاً / اتفاقاً آپ سے سرزد ہوئے۔

مسئلہ چونکہ انتہائی نازک (Delicate) ہے اس لیے اس کی نزاکت کے پیش نظر مزید وضاحت کے لیے ہم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام [دانا ترین] انسان کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہؒ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے۔'' (103)

اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ وحی الٰہی سے منصوص حقائق کے ماسوا تمام امور، خواہ وہ سائنسی اصول و ضوابط ہوں یا ریاضی و منطق، معاشیات و سیاسیات یا سماجیات و عمرانیات سے متعلق امور، تمام دعوے (Theories or Anti-theories) اضافی ہیں۔

عملی زندگی میں قانون سازی اور ضابطہ سازی کے معاملے میں بھی اسلام نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ جدیدیت کی طرح نہ وہ ہر ضابطے اور اصول کو آفاقی حیثیت دیتا ہے اور نہ

مابعد جدیدیت کی طرح ہر آفاقی ضابطہ واصول سے انکار کرتا ہے۔ وحی الٰہی کی صورت میں وہ بنیادی اصولوں اور سمت کو آفاقی حیثیت دیتا ہے، ان اصولوں کو زمان و مکان (Time and Space) سے بالاتر یا ماورا قرار دیتا ہے اور ان آفاقی اصولوں کی روشنی میں مخصوص وقت، مخصوص مقام اور مخصوص احوال کے لیے اجتہاد کا راستہ/ دروازہ کھلا رکھتا ہے؛ بلکہ اجتہادی اور غیر منصوص احکام میں ''عرف'' کا لحاظ رکھتا ہے۔ جسے مابعد جدیدی (Postmodernists) تہذیبی اتفاق رائے (Cultural Consensus) کہتے ہیں۔

ب۔ دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ (Hyperreality):

انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اسے اردگرد کی اشیاء اور ماحول سے واسطہ پڑتا ہے وہ ان کی کنہ اور کیفیت پر غور کرتا ہے۔ اسے بہت سے سوالوں کے جواب بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن چند ایسے سوالات ہیں جو اسے شدید حیرت اور کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مثلاً میں/انسان کہاں سے آیا ہوں؟ مر کے لوگ کہاں چلے جاتے ہیں۔ اس کائنات کو بنانے والا اور دنیا کے نظام کو چلانے والا کوئی ہے؟ اگر ہے تو وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آیا؟ حقیقت مطلق کیا ہے؟۔۔۔ وغیرہ وغیرہ! اس طرح کے بے شمار سوالات کے جواب حاصل کرنے سے جب انسان عاجز آجاتا ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو اپنے اردگرد کو اور ماحول کو بلکہ پوری دنیا کو ہی ایک فریب اور مغالطہ تصور کرنے لگتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا فریب نظر ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے وہ غیر حقیقی اور عکسی ہے۔ بعض اس دنیا کو عالم مثال اور تمثیل سمجھ لیتے ہیں اور شعور کے چبھتے ہوئے سوالوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دنیا کے مذاہب میں ہندو دھرم کو قدامت کا دعویٰ ہے اور موجود مذہبی لٹریچر میں ہندو دھرم کی مقدس کتاب ''مہابھارت'' کا ایک حصہ ''بھگوت گیتا'' دنیا کو ''مایا'' اور مغالطہ قرار دیتی ہے۔ یہ سب سے پہلا حوالہ ہے جو دنیا کے غیر حقیقی ہونے کے بارے میں ہمیں ملتا ہے۔ ''مایا یا مغالطہ'' کیا ہے؟ مایا، سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ''دھوکہ (Illusion)'' ہیں۔ Hutchinson Dictionary میں لکھا ہے:

"In Hindu philosophy, mainly in the Vedanta, the cosmos *which Isarva, the personal* expression of Brahman, or the Atma, has called into being. This is real, yet also an

illusion, since its reality is not everlasting." (104)

یعنی ہندو فلسفہ خاص طور پر ویدانیت کے مطابق: ایشور (جو کہ برہمہ یا آتمہ کا ظاہر/مظہر تھا) نے اس کائنات کو وجود بخشا۔ یہ کائنات اصلی بھی ہے مگر مایا (دھوکہ) ہے۔ لہٰذا اس کی اصلیت ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔

شری کرشن جی مہاراج کے وقت ہندوؤں کے تمام فلسفے صرف ایک ہی محور کے گرد گھومتے تھے کہ مصائب اور تکالیف سے کس طرح نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ شری کرشن نے مصائب سے نجات پانے کا راستہ بتایا۔ سب سے پہلے انہوں نے مصائب اور تکالیف کے سرچشمہ کی نشان دہی کی۔ آپ نے کہا:

"....اس پرکرتی (ادنیٰ فطرت) اور پرش (اعلیٰ فطرت) سے بلند پرم آتما کی ذات ہے، جو انسانی تخیل سے مستور ہے لیکن ذات خفی کا سمجھنا آسان نہیں۔ وہ پرم آتما ہر ابتدا کی ابتدا اور ہر انتہا کی انتہا ہے۔ ست اور است (حق و باطل) یا امر اور امر سے وہ بالا ہے۔ نگاہیں اس کے جلوے کی متلاشی ہیں۔ لیکن جب تک مایا کا پردہ دور نہ ہو، وہ کیونکر نظر آئے۔ پرماتما ہر چیز پر محیط ہے کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ ہر شے کی اصل ایک ہے۔ صرف نام اور روپ کا ظاہری فرق ہے۔ کمہار کے پاس وہی مٹی ہوتی ہے، کہیں اس سے پیالہ بنتا ہے، کہیں صراحی، کہیں مٹکا، کہیں رکابی، کہیں ہنڈیا۔ غور کرو تو سب کی اصل وہی مٹی ہے۔۔۔ اسی کا نام مایا ہے! اسی کو فریب نظر، موہ، جہالت، اگیان جو چاہو کہو!

جو سمجھے کہ دنیا کی سب ریل پیل

ہے مایا کا کرتب، ہے مایا کا "کھیل" (105)

شری کرشن جی کا نظریہ یہ ہے کہ مغالطہ/ مایا یہ ہے کہ انسان عالم مثال کی جھوٹی چیزوں کو حقیقی جانتا ہے اور انہی کی محبت میں حیران سرگراں پھرتا ہے۔ آپ کے فلسفہ کی رو سے عالم مثال غیر حقیقی، ناپائیدار اور متغیر ہے اس کے مقابل ایک اور عالم ہے جو حقیقی ہے۔ جب انسان مغالطہ/ مایا سے باہر نکل آئے گا تو اس کے لیے نجات کا حصول ممکن ہو جائے گا۔ ہندوؤں کا یہی فلسفہ یورپ میں کیسے پہنچا؟ اس بارے میں ڈاکٹر ڈریپر لکھتے ہیں:

"ویدوں کے مذہب نے ترقی کرتے کرتے بدھ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ بدھوں کا عقیدہ یہ ہے کہ "قوت کا وجود اصلی و حقیقی مادہ کو اپنا مظہر بنا کر عالم شہود میں لاتا ہے۔" بدھ

مذہب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ "ذات کا خیال جو انسان کو عمر بھر دھوکے میں مبتلا رکھتا ہے (یعنی مایا کا جال ہے!) شاید مرتے وقت زائل نہ ہو لیکن رفتہ رفتہ ضرور جاتا رہتا ہے۔"
مشرقی یورپ میں ان خیالات کی ترویج کا پہلا ذریعہ ارسطو (Aristotle) ہوا اور آگے چل کر وہ ان خیالات کا بانی مبانی سمجھا جانے لگا۔ ایتھنز (Athens) میں بعض فرقے تو یہاں تک ترقی کر گئے تھے کہ نہ صرف انہیں اس بات سے انکار تھا کہ کسی ان دیکھی، ان بوجھی اور فوق القدرت ہستی کا وجود ہو سکتا ہے بلکہ وہ دنیا کو ایک خواب پریشان، ایک خیال موہوم تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حقیقی وجود کسی شے کا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر ڈریپر اسی کتاب میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"پلوٹینس (Plotinus 205-270) ایرانیوں اور ہندوؤں کے فلسفہ سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے مشرقی ممالک کی طرف آیا۔ پھر وہ چند سال کے بعد روما آیا اور وہاں پچیس سال تک درس دیتا رہا۔ ایک دفعہ اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ تصویر کھنچواؤ۔ اس نے جواب دیا کہ انسان ایک سایہ (Shadow) ہے اور سایہ کی نقل اتارنا حماقت ہے۔" (106)

اب یہی نظریہ مابعد جدیدیت میں بھی پایا جاتا ہے مگر معمولی سے تغیر اور دلائل کی کثرت کے ساتھ۔ عصر حاضر میں صدیوں قدیم اس نظریہ کو نئے انداز سے پیش کرنے اور مابعد جدیدیت کا جزو لاینفک (Compulsory Component)، بنانے میں جین بادریلا البرٹ بورگ مین (Albert Borgmann) ڈینئل بورسٹن (Danial Boorstin) اور امبرٹو ایکو (Umberto Eco) جیسے مفکرین کا نام نمایاں ہے لیکن عصر جدید میں مابعد جدیدیت کی فکر سے ہم آہنگ کرنے اور صدیوں پرانے اس ویدانتی فلسفہ کو نئے انداز سے متعارف کرانے میں سوسئیر (Saussure, Ferdinande) کا نام آتا ہے۔ سوسئیر نے انڈین فلاسفی سیکھی تھی بلکہ اسے سنسکرت میں بھی شدھ بدھ تھی۔ پروفیسر فرتھ (J.R.Firth) کا ستر برس پہلے کا یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے:

"It is just possible that he (Saussure) had learned something of Indian philosophy." (107)

مابعد جدیدیت کے مطابق جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس کی حیثیت سچائی کی نہیں ہے۔ اس

کے علم برداروں کا خیال ہے کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں اور ہم وہی دیکھتے ہیں جو مخصوص وقت اور مخصوص مقام (Specific time and place) پر مخصوص احوال خود کو دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کو حقیقی اور ٹھوس اشیاء اور مناظر کی بجائے ایسے عکسوں (Images) اور مظاہر (Representations) سے عبارت سمجھتے ہیں جو غیر حقیقی (unreal) اور غیر محسوس (intangible) ہیں۔ یعنی پوسٹ ماڈرن ازم کے نزدیک یہ دنیا محض ایک ویڈیو گیم ہے جس میں ہم اپنی پسند کی سچائیاں دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ پروفیسر سید سعادت اللہ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''اس کا مطلب ہے کہ یہ دنیا ایک ایسا تھیٹر ہے جس میں ہر چیز مصنوعی طور پر تشکیل کردہ ہے۔ سیاست عوامی استعمال کے لیے کھیلا جانے والا ایک ڈرامہ ہے۔ ٹیلی ویژن پر دستاویزی فلمیں (Documentaries) تفریحات کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ صحافت حقیقت اور افسانے کے بیچ فرق کو دھندلا دیتی ہے۔ زندہ افراد، سوپ اوپیرا (Soap Opera) کے کردار بن جاتے ہیں اور افسانوی کردار زندہ انسانوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہر چیز اچانک واقع ہوتی ہے اور ہر شخص عالمی تھیٹر میں واقع ہونے والی ہر چیز کا بر موقع نظارہ کرتا ہے۔'' (108)

ہائپر ریلیٹی کیا ہے؟

آن لائن انسائیکلو پیڈیا Wikipedia کے مطابق:

> "In postmodern philosophy, the term hyperreality characterizes the inability of consciousness to distinguish reality from fantasy, especially in technologically advanced postmodern cultures."(109)

یعنی مابعد جدید فلاسفی کے مطابق، شباہت کذبی یا تشکیلی حقیقت (Hyperreality) کا مطلب ہے کہ حقیقت کو تخیل سے ممیز کرنے کے شعور کی صلاحیت کا فقدان۔ خاص طور پر ٹیکنالوجی میں نہایت ترقی یافتہ مابعد جدید معاشروں میں۔ شباہت کذبی ہی اصل میں ذریعہ ہے جو وضاحت

کرتا ہے کہ معاشرہ مابعد جدیدیت میں کتنا آگے چلا گیا ہے۔اور صورتحال یہ بن جائے کہ میڈیا سے مسلسل چھن چھن کر آنے والی انفارمیشن حقیقت کو شناخت کرنے کا شعور چھین لے۔

جین بادریلا (Jean Baudrillard) کے الفاظ میں:

"The simulation of something which never really existed."(110)

یعنی اس چیز کی مکمل تمثیل جس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ امبرٹو ایکو (Umberto Eco) کہتا ہے؟

"The authentic fake." (111)

یعنی مصدقہ چربہ یا مستند فریب (چوری اور سینہ زوری) اور پیٹر سپارو (Pater Sparrow) کے نزدیک "The virtual irreality" کو شباہت کذبی کہتے ہیں۔ جان ٹفن (John Tiffin) نے کمپیوٹر شعبدہ بازی کو ہائپر ریلٹی کہا ہے:

"Hyperreality is nothing more than the technological capability to intermix virtual reality (VR) with physical reality (PR) and artificial intelligence (AI) with human intelligence (HI) in a way that appear seamless and allows interaction."(112)

جین بادریلا کہتا ہے کہ وہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں حقیقی نہیں ہے بلکہ copy world ہے جہاں ہم اپنی مرضی کے تخلیق شدہ مہیجات کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ بادریلا نے یہ اصطلاح Jorge Luis Borges سے مستعار لی۔ جبکہ جارج نے اسے Lewis Carrol سے اخذ کیا تھا۔ لیوس کیرل نے اس کی تشبیہ ایسے معاشرے سے دی تھی جو نقشہ نویس کو صرف ایسا نقشہ بنانے کو کہتا ہے کہ اس نقشے میں محض مطلوبہ تفصیلات ہی فراہم کرے۔اور جب ایمپائرز زوال پذیر ہو تو نقشہ بھی بے معنی ہو جائے۔

بادریلا مابعد جدید سائنسی معاشرے کو Hyperreal کہتا ہے۔ Hyperreality کے سلسلے میں وہ تین منزلیں قائم کرتا ہے۔ پہلی منزل وہ شعبدہ ہے جو اصلی شبیہ سے قربت تو رکھتا ہے لیکن

اس قربت کے باوجود دوری کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ دوسری منزل میں نشانات (Signs) کا عمل دخل غیاب (Vanishes) میں چلا جاتا ہے۔ اور یہ Disappearance دراصل سچائی سے انحراف کی ایک صورت ہے اور تیسری منزل وہ ہے جہاں اس شباہت (Image) کی مکمل نفی ہو جاتی ہے، جس میں حقیقت سے دور یا قریب کا بھی رشتہ نہیں رہتا بلکہ وہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ یعنی Hyperreality دراصل سچائی سے پرے کا تصور پیش کرتی ہے۔ بادریلا کی درج بالا فلاسفی کو سمجھنے کیلئے یہ احساس رکھنا چاہیے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عموماً اور اکیسویں صدی کے آغاز کی دہائی میں خصوصاً سماجی الصرام کی ساری حقیقتیں درہم برہم ہو کر صارفیت کے ساتھ ہو گئی ہیں اور معاشرے Consumer oriented ہو گئے ہیں۔ اور صارفی اشیاء ہی نئی سوسائٹی تعمیر کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں میڈیا جو کردار ادا کر رہا ہے اسے نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ ٹی وی کی تصویریں حقائق سے زیادہ معتبر سمجھی جانے لگی ہیں اور کمیونیکیشن نے ایک ایسا درجہ پالیا ہے جو مابعد جدید ثقافت کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ چنانچہ بادریلا کے مطابق ماس میڈیا اور تکنیکی مشابہت کے رنگ روپ نے جس طرح انسانی زندگی کو متاثر کیا ہے وہ مابعد جدید رویے کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ Simulacra مابعد جدیدیت اور ہائپر ریلٹی کی بحث میں برابر استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ دراصل یہ Simulacrum کی جمع ہے۔ اس کا مفہوم ہے: عصر حاضر میں چیزوں کی جس طرح نمائندگی ہوتی ہے وہ بذاتِ خود متعلقہ شے سے بہت مختلف ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نمائندگی یا کاپی کے نام پر کچھ اور ہی شے پیش کی جا رہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مارکیٹ میں کسی پراڈکٹ کے لانچ ہونے سے پہلے اس کی تصویریں آ جاتی ہیں جن میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ سڑکوں کے کنارے بڑے بڑے ہورڈنگز اور نیون سائنز، ٹی وی کمرشلز جس طرح اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں سرے سے اصلی شے سے دور از کار اور مختلف ہوتے ہیں۔ بادریلا نے اس کے دور رس نتائج بیان کیے ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ دعویٰ کہ کوئی امیج حقیقت سے قریب ہے فریب نظر یا "محض" ہے۔ آئے دن کے مرحلے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر سچائیوں کی نمائندگی کی جائے تو وہ اتنی مختلف ہوں گی جو حقیقت سے کوئی وابستگی یا علاقہ نہیں رکھیں گی۔

بادریلا کنزیومر سوسائٹی کے اس چلن کو حیرت انگیز انقلاب سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ چیزوں سے زیادہ اب ان کے عکس بازاروں میں اثرات قائم کیے ہوئے ہیں اور فروخت

ہوتے ہیں۔ اور اس کی ذمہ دار نام نہاد سوسائٹی ہے۔ جس نے اشیا سے زیادہ ان کی نام نہاد تصویر دں کو اہمیت دے رکھی ہے۔ نیچر اپنی حقیقت کھو چکی ہے۔ ہم نے فطرت کے تمام سامان کو برباد کر ڈالا ہے اور مصنوعی حقائق کو ان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ یہ سارا ماجرا ایک طرف تو عصری کنزیومر کلچر کا ہے تو دوسری طرف مغربی سائنس اور فلسفے کا بھی جو فطری امور کو گہنانے کا باعث ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "To designate this new function of signs, Baudrillard chooses the term simulacrum, a word that denotes representation but also carries the sense of a counterfeit, sham or fake. Simulacra seems to have referents (real phenomena they refer to), but they are merely pretend representations that mark the absence, not the existence, of the objects they purport to represent. Baudrillard blames to distinct but related culprits for this change: Contemporary consumer culture and imperialistic western science and philosophy." (113)

اوپر درج کردہ بحث کو اگر ہم اپنے الفاظ میں سمیٹنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ **ہائپر ریلٹی یا تشکیلی حقیقت یا شباہت کذبی کو مابعد جدیدیت (Postmodern) حقیقت یا تصور حقیقت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت جس دنیا سے متعلق اور جس دنیا کا تصور پیش کرتی ہے وہ "تشکیلی حقیقتوں" کی آماجگاہ ہے۔**

بعض سکالرز کے نزدیک Hyperreality، اصل میں Reality کا استعباد (Paradox) ہے یعنی حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی۔ جیسا کہ بادریلا کہتا ہے: The simulation of something which never really existed. اور امبرٹو اسے The authentic fake کہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو از خود موجود نہیں تھی، اسے معرض وجود میں لایا گیا ہے، تشکیل دیا گیا ہے، تشکیلی ہونے کی بنا پر یہ اصل میں نقل ہے مگر اس کا اثر حقیقت سے بڑھ کر ہوتا ہے اس لیے اسے حقیقت سے بڑھ کر حقیقی کہا گیا ہے۔

اس طرح تشکیلی حقیقت کا ایک فلسفیانہ اور دوسرا عملی (Functional) مفہوم ہے۔ فلسفیانہ طور پر ہائپر ریئلٹی وہ ہے:

الف۔ جسے حقیقت تسلیم کرلیا گیا ہو، خواہ وہ منطقی طور پر یا مشاہداتی سطح پر ثابت نہ ہو۔

ب۔ جو Virtually موجود ہو، مگر جس کا اثر شدید اور ''حقیقی'' ہو۔

ج۔ جو اسی طرح کی تسکین اور مسرت فراہم کرے جس کی امید اصل سے کی جاتی ہے۔

عملی مفہوم میں تشکیلی حقیقت۔ ایک طرف صارفیت کے متعلق اور دوسری طرف ان تمام شبیہوں، امیجز، ٹی وی پروگراموں، کمپیوٹر کھیلوں، Softwares اور سہ ابعادی (3 Dimensional) تصویروں یا ہولوگرافی سے متعلق ہے جو موجودہ عالم گیر کلچر (Globalize culture) کی شناخت ہے۔ کنزیومر کلچر مابعد جدید صورتحال کا اہم عنصر ہے۔ ''صارفیت'' شے کی تخلیق اور پیداوار سے زیادہ اس کے صرَف کے بارے میں فکر مند ہوتی ہے۔ یہ لوگوں اور اشیائے صرَف کے مابین ایک خاص قسم کے رشتے کا تصور دیتی ہے۔ ''صارفیت'' شے کی داخلی معنویت کی بجائے اس کی Sign Exchange value کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ شے سے ایک ایسا علامتی مفہوم منسلک کرتی ہے، جس کی وجہ سے شے ثقافتی وسماجی مقبولیت واہمیت اختیار کرلیتی ہے یعنی Status Symbol بن جاتی ہے اور شے سے زیادہ اس کا علامتی مفہوم اہم ہوجاتا ہے۔ مثلاً لمبی گاڑی، منرل واٹر، پیپسی، میکڈونلڈ، بونینزا وغیرہ سماجی مرتبے کا علامتی مفہوم رکھتے ہیں۔ جس طرح ماضی میں برصغیر میں شودروں اور برہموں کی بستیاں اور مندر الگ تھے اور شودروں کو ان میں گھسنے کی آگیا (اجازت) نہ تھی۔ پھر تاریخ کے ورق الٹتے ہیں۔۔۔ انگریز بہادر برصغیر پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ وہ اپنے عیاشی کے کلبوں کے باہر بڑا سا بورڈ لگادیا کرتے تھے۔ Dogs and Indians are not allowed! ویسے ہی آج بھی امراء (Business class) اپنے سٹیٹس کی Maintenance پر بے دریغ پیسہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ جس کی جیب میں پیسہ ہے وہی یہ پراڈکٹ اور سروس استعمال کرے ورنہ دور رہے۔ Defense Housing Scheme یا بحریہ ٹاؤن میں کروڑوں روپے کے پلاٹ اس لیے نہیں بکتے کہ وہ جنت کا ٹکڑا ہیں، نہ ہی اوپر ذکر کی گئی سروسز اور پراڈکٹس اس لیے استعمال کی جاتی ہیں کہ ان کی داخلی اہمیت ومعنویت (آرام، صحت،

افادیت) زیادہ ہے بلکہ ان کی علامتی معنویت یعنی مقام ومرتبہ کو بلند کرنے کی غرض سے اہمیت دی جاتی ہے۔

میڈیا ہی ہمارے عہد...... اور مابعد جدید صورتحال کا غالب عنصر ہے۔ ابتدا میں میڈیا کا کردار زیادہ تر ثقافتی تھا۔ اطلاع وتفریح کا متوازن امتزاج تھا۔ مگر اب میڈیا کمرشلائز ہو گیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میڈیا اب ایک سپر مارکیٹ ہے۔ میڈیا پر ظاہر اور پیش آنے والی ہر شے 'برائے فروخت ہے'۔ نتیجہ یہ ہے کہ خبر، ڈرامہ، فلم، گانا، ٹاک شو، کھیل، مذہبی پروگرام، فہم قرآن، تلاوت قرآن، طبی مشورے...... ہر شے تجارتی نیت سے پیش کی جاتی ہے۔ نتیجہ در نتیجہ یہ ہے کہ ان سب کے مقاصد بدل گئے ہیں، یعنی خبر پیش کرنے کا مقصد کسی واقعے کی غیر جانبدارانہ، حقیقی تصویر پیش کرنا نہیں، بلکہ اسے بیچنا ہے۔ غیر جانبداری کا دعویٰ یا اس پر عمل بھی اسے بیچنے کی غرض سے ہے۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اب بیچنے کا مفہوم بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ فقط پراڈکٹ نہیں بیچی جاتی، خیال، تصورات، عقائد، انسانی جسم، آئیڈیالوجی، آرٹ، سیاسی ایجنڈا تک بیچا جاتا ہے اور بیچا جا رہا ہے۔ مارکیٹ اکانومی نے ریاست کے کردار کو کمزور کر دیا ہے اور انسانی ضرورتیں پیدا کرنے کیلئے میڈیا سے مدد لی جاتی ہے۔ میڈیا اشتہارات کے ذریعے نئی نئی انسانی ضرورتیں ''تخلیق'' کرتا ہے۔ پہلے انسانی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر چیزیں پیدا کی جاتی تھیں، مگر اب چیزیں سامنے رکھ کر ضرورتیں پیدا کی جاتی ہیں!

میڈیا کے اس فقید المثال اثر کی وجہ سے ایک نئی ورچویل اور ہائپر ریئلیٹی کی حامل دنیا بھی وجود میں آ چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم عکسوں اور امیجز کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ دیتے ہیں یہ دھوکہ بازی گر کھلا، فریب اور دغا عام اور Business Management کا حصہ بن گیا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اشیائے صَرف کی قیمتیں کچھ اس طرح لکھی جاتی ہیں۔ 699.99 یعنی سات سو کا عدد بھی پورا نہ ہو اور ذہن میں چھ سو کا امیج بنے اور نظر نہ آنے والا چھوٹا سا 99. کا ہندسہ بھی چپکایا ہوتا ہے۔ بنک، انشورنس کمپنیاں، موبائل فون سروس پروائڈر کمپنیاں وغیرہ انتہائی دلکش اور منافع بخش سکیموں کے بڑے بڑے اشتہار دیتے ہیں اور فوائد گنواتے ہیں، ساتھ ہی چھوٹا سا ستار بنا کر ایک کونے پر لکھا ہوتا ہے۔ جہاں جلدی سے نظر بھی نہ پڑے۔ شرائط وضوابط لاگو ہیں، اور سارا چکر ان شرائط وضوابط کے پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔

معاشرے میں اعتماد اور کھرے پن کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لوگوں کی جیبیں خالی کرنے کے نت نئے گر تلاش کرنے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں نے لاکھوں روپے کی تنخواہ پر Creative Heads بھرتی کیئے ہوتے ہیں۔ جو اپنی عقل کو Evil Genius بنا کر دکھاتے کچھ اور کرتے کچھ اور ہیں۔ انتہائی شاطر دماغوں کی مدد سے تخلیق کی گئی ان سکیموں سے Fault پکڑنا انتہائی جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ حقیقی اور فطری دنیا سے ہم اگر یکسر کٹ نہیں گئے تو اس سے ہمارا رشتہ کمزور ضرور پڑ گیا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ میڈیا، ہمارے اور باہر کی دنیا کے درمیان محض ایک "ذریعہ" ہے۔ مگر میڈیا ذریعہ نہیں۔ خود مختار ہے۔ میڈیا باہر کی دنیا کو بعینہٖ پیش نہیں کرتا (اور نہ کر سکتا ہے) بلکہ اس "حقیقت" کو Reconstruct کرتا ہے۔ ہم ٹی وی سکرین پر باہر کی اصل تصویر نہیں، ایک تشکیلی حقیقت دیکھتے ہیں۔ اسے آپ "مایا" (ہندو فلسفہ) کہہ لیں یا افلاطون کا "اعیان کا تصور" (افلاطون نے دنیا کو اعیان کی نقل کہا۔ گویا دنیا کو "ہائپر ریئل" کہا اور آرٹ کو دنیا کی نقل اور اس طرح آرٹ کو نقل کی نقل قرار دیا)۔ آج کے دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے اصل (Origin) سے کٹا ہوا ہے۔ فریب دماغ اور فریب نظر میں مبتلا ہے۔ مگر نہ وہ اسے خسارہ قرار دیتا ہے نہ المیہ! بلکہ اسے اصلی صورتحال قرار دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

اصل میں ہم mediated (میڈیائی) حقیقتوں میں جی رہے ہیں۔ مابعد جدید مفکرین نے زیادہ تر ٹی وی اور کمپیوٹر کے میڈیم کی بات کی ہے اسی لیے وہ اس عہد کو ڈیجیٹل یا ای۔ایج (Digital or e-Age) بھی کہتے ہیں۔ محض اس لیے نہیں کہ ان کی بہتات ہو گئی ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ انہوں نے ہمارے تصورات کو انقلابی طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ درج بالا بحث کے استشہاد کیلئے ہم Wikipedia سے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس میں بھی مقالہ نگار تقریباً ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"Hyperreality is significant as a paradigm to explain current cultural conditions. Consumerism, because of its reliance on sign exchange Value (e.g. brand x shows that one is fashionable, carry indicates one's wealth), could be seen as a contributing factor in the creation of hyperreality or the hyperreal condition. Hyperreality

tricks consciousness into detaching from a real emotional engagement instead opting for artificial simulation, and endless reproductions of fundamentally empty appearance. Essentially, fulfillment or happiness is found through simulation and imitation of a transient simulacrum of reality, rather than any interaction with any "real" reality."(114)

تشکیلی حقیقت (Hyperreality) کی مثالیں:

جین بادریلا اور امبرٹو ایکو، دونوں ڈزنی لینڈ (Disneyland) کو ہائپر ریلیٹی کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایکو کا خیال ہے کہ ڈزنی لینڈ کا ماحول (settings) مثلاً مین سٹریٹ اور پورے سائز کے گھر وغیرہ دانستہ تخلیق کیے گئے ہیں کہ اصلی نظر آئیں تا کہ ناظرین کو ''تخیلاتی ماضی'' (Fantastic Past) میں لے جائیں۔ یہ شباہت کذبی یا جعلی حقیقت ایک ایسا دھوکہ (Illusion) پیدا کرتی ہے کہ لوگ اس ''حقیقت'' کو خریدنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ڈزنی لینڈ اس طرح منظم طور پر تخلیق کیا گیا ہے کہ ناظرین کو یہ احساس ہو کہ ٹیکنالوجی سے تخلیق کیا گیا ماحول، فطری ماحول سے بڑھ کر حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ مصنوعی جانور مثلاً مگرمچھ اور گینڈے، ڈائنوسارز وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں اور مصنوعی طور پر فطری ماحول بھی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مثال بیان کر کے بادریلا دلائل دیتا ہے کہ:

"......imaginary world of Disneyland magnetizes people inside and has been presented as "imaginary" to make people believe that all its surroundings are "real". But Los Angeles area is not real; thus it is hyperreal. Disneyland is a set of apparatus, which tries to bring imagination and fiction to what is called "real". This concerns the American Values and way of life in a sense and "Concealing the fact that the real is no longer real, and thus of saving the reality principle." (115)

ڈزنی لینڈ کی مثال سے بادریلا امریکی اقدار کے کھوکھلا اور غیر حقیقی ہونے کا استنباط کرتا ہے۔

☆ کسی بھی فیشن میگزین کے سرورق پر براجمان ماڈل گرل کی تصویر جسے کمپیوٹر کے ذریعے Touch دیا گیا ہو۔

☆ فیچر فلمیں جو حقیقت کی نہ صرف نقالی ہوتی ہیں بلکہ واقعات کو حقیقی رنگ دیا گیا ہوتا ہے۔ اور دور حاضر کی فیچر فلمیں جنہیں کمپیوٹر گرافکس کے ذریعے Animation دی جاتی ہے۔اور تمام ماحول کو Super impose کیا جاتا ہے یا کمپیوٹر کے ذریعے ری مکسنگ کی جاتی ہے۔

☆ ہارٹی کلچر کے زیر انتظام سجائے ہوئے پارک اور نیچرل پارک وغیرہ جن میں مصنوعی قدرتی ماحول پیدا کیا گیا ہوتا ہے۔

☆ پروفیشنل سپورٹس، ایتھلیٹ اور ریسلنگ کے مقابلے جن میں کھلاڑیوں کو ناقابل شکست اور Superman بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

☆ میٹروپولیٹن شہروں لندن، پیرس، لاس اینجلس، دبئ وغیرہ کا ماحول۔

☆ سپر سٹورز پر اشیائے صرف کو اس طریقے سے سجانا کہ Series of Mirrors میں اشیا کے بے شمار عکس نظر آئیں اور سٹورز بھرے (Stocked) نظر آئیں۔

☆ نئی عمارت کو اس طرح ڈیزائن کرنا کہ وہ پرانی نظر آئے: Just for novelty to look aged.

☆ عوام میں مقبول سیاستدانوں اور فنکاروں کے عوامی کردار کی اس طرح projection کہ وہ Perfect نظر آئیں۔ حالانکہ جلوت اور خلوت ایک دوسرے کے الٹ ہوتی ہیں۔

دنیا کی حقیقت اور ہائپر ریئلٹی اسلامی نقطۂ نظر:

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کارخانۂ حیات، یہ عالم رنگ و بو، یہ فضائے بسیط یہ چرخ نیلی فام، یہ ہستی، یہ ہستی ایک ٹھوس حقیقت اور بامقصد نظام ہے۔ کرۂ ارض پر بے شمار زندہ اور غیر زندہ مخلوقات ہیں۔ یہ مخلوقات جمادات، نباتات اور حیوانات کی قسم سے ہیں۔ چاہے وہ پانی میں ہوں، ہوا میں ہوں یا خشکی پر۔ یہ مخلوقات ہمیں آنکھ سے نظر آئیں یا خوردبین کی مدد سے دکھائی دینے

والے Micro organisms ہوں ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تخلیق فرمایا ہے اور بامقصد نظام کے تحت ان کو وجود بخشا ہے۔ ان تمام مخلوقات پر اس ذات باری تعالیٰ کا حکم نازل ہوتا ہے اور وہ اس ہستی کا کہنا مانتی ہیں۔ کسی مخلوق میں یہ مجال نہیں کہ اس کے حکم سے انکار کر سکے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاء وھو العزیز الغفور.
الذی خلق سبع سمٰوات طباقا ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت...... واعتدنالھم عذاب السعیر" (118)

(وہ جس نے پیدا کیا موت اور حیات کو، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اعمال میں اچھا کون ہے؟ اور وہ بڑا زبردست، خوب بخشنے والا ہے۔ وہ جس نے پیدا کیے سات آسمان اوپر نیچے۔ تم رحمٰن کے پیدا کرنے میں کوئی فرق نہیں دیکھو گے، پس لوٹا تو نگاہ کو، کیا تو دیکھتا ہے، کوئی شگاف یا نقص۔ پھر لوٹا تو نگاہ کو دوبارہ (بار بار) لوٹ آئے گی تیرے پاس ذلیل ہو کر اس حال میں کہ وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ اور بے شک ہم نے زینت دی آسمان دنیا کو چراغوں سے، اور بنایا ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ، اور تیار کیا ہے ہم نے ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب۔)

اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند اور عظیم ہستی ہے۔ یہ اس کی عظمت ہے کہ عالم علوی اور عالم سفلی کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جس کے ہاتھ میں اس کا اقتدار بھی ہے۔ اس نے موت وحیات کو اپنے بندوں کے لیے مقدر کیا تاکہ وہ آزمائے کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ صاحب اخلاص اور صحیح راستے پر ہے۔ بندوں کی آزمائش کے بارے میں علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدیؒ فرماتے ہیں:

''یہ آزمائش اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کر کے ان کو اس دنیا میں بھیجا، انہیں یہ بھی بتا دیا کہ انہیں عنقریب یہاں سے منتقل کیا جائے گا، ان کو اوامر ونواہی دیے، اور اپنے ان اوامر کی معارض شہوات کے ذریعے سے ان کو آزمایا۔'' (119)

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بے نقص اور بامقصد بنائی ہے اور سات آسمان طبق بر طبق پیدا فرمائے۔ انسانوں کی رہنمائی اور منفعت کیلئے آسمان کو چراغوں یعنی ستاروں سے مزین بھی فرمایا

اور خدا کی تخلیق میں کوئی نقص یا عیب جب نہیں ہے تو وہ ہر لحاظ سے کامل، متناسب اور اصلی و حقیقی ہے جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن مجید میں یہ بات بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان کیلئے دنیا میں انسان کو بھیجا ہے وہ اس طرح نہیں لیا جارہا کہ اسے (انسان کو) بالکل ہی خبر نہ ہو۔ بلکہ ان کو براہ راست بتانے کا انتظام۔ جو کہ ممکن ترین انداز میں معقول ترین تھا۔ کا بندوبست کیا ہے۔ انفرادی سطح پر انسان کے اندر عقل و شعور، ارادہ و اختیار، قوت تمیز اور ضمیر کا چراغ دے کر اور اجتماعی سطح پر اپنے پیغمبر بھیج کر! اور کتابیں نازل فرما کر اب انسان کا سارا امتحان اس امر میں ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مان کر سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے یا ان سے منہ موڑ کر خود اپنی خواہشات، تاویلات، تشریحات اور تخیلات (Illusions) کے پیچھے چلتا ہے۔ اس طرح رسالت دراصل اللہ تعالیٰ کی وہ حجت ہے جو اس نے انسان پر قائم کردی ہے، اور اس کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انبیاء کے آنے اور ان کا پیغام نشر ہو جانے کے بعد کوئی شخص لاعلمی کا عذر نہیں کرسکتا۔

کیا مابعد جدید دور کے مفکرین اور فلسفہ کے چوزے اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ انسان کو اگر کچھ معاملات میں آزادی دی گئی ہے تو زندگی کے بہت سے معاملات میں اسے مجبور (تکوین امور کے تحت) بھی رکھا گیا ہے۔ کیا یہ ثابت کرنے کے لیے دلائل کے انبار لگانا پڑیں گے کہ انسان کو محض چند دہائیاں زندگی دی گئی ہے اور یہ نصف یا پون صدی زندگی گزارنے میں دنیا کا ہر انسان مساوی ہے۔ موت کے آگے سب مجبور ہیں۔ Aging process کو کوئی سائنس یا ٹیکنالوجی نہیں روک سکی اور ایسا ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ پیدا ہونے کے بارے میں کسی Choice کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ بیماری، بھوک، موسم کے اثرات کے آگے ہر انسان مجبور ہے۔ دنیا کا امیر ترین انسان بل گیٹس ہو یا پھتونائی دونوں کے معدہ کا سائز برابر ہے۔ اگر انسان نے اپنی زندگی کی بھاگ دوڑ کا مقصد محض دنیاوی آسائشوں کو جمع کرنا قرار دے لیا ہے تو قرآن اس بارے میں تنبیہ کرتا ہے:

"قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا. الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا"(120)

(کیا ہم نہ بتائیں کہ اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ! کہ

دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہتی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں)

اس آیت مبارکہ میں قرآن متنبہ کرتا ہے کہ وہ لوگ جو محض اپنا Status بلند کرنے کیلئے یا ہائی سوسائٹی میں معیار اونچا رکھنے کیلئے اپنی زندگی کھپاتے رہے یا جنھوں نے سمجھا کہ زندگی محض کھاؤ، پیو اور عیش کرو کا نام ہے سارا دن کولہو کے بیل کی طرح دس دس گھنٹے کام کرو اور رات کو گدھے کی طرح لیٹ کر خراٹے مارتے رہو۔ محض یہ زندگی کا مقصد جنھوں نے بنا لیا ان کی یہ محنت، یہ ساری دوڑ دھوپ بے کار جائے گی اور ان کی جمع پونجی، شاندار مکان، جمے جمائے کاروبار، گزیٹڈ گریڈوں کی نوکریاں اور لیز پر لی گئی گاڑیاں بہت جلد چھن جائیں گی اور ان کو مل جائیں گی جو ان سے بھی بڑھ کر دنیا کے حریص ہوں گے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفہیم اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''یعنی اس طرح کے لوگوں نے خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے کیوں نہ سرانجام دے ہوں، بہرحال وہ ختم ہو جائیں گے۔ اپنے قصر اور محلات، اپنی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں، اپنے کارخانے اور معمل اپنی سڑکیں (Motor ways) اور ریلیں، اپنی ایجادیں اور صنعتیں، اپنے علوم وفنون اور اپنی آرٹ گیلریاں، اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے تھے سب ختم ہو جائیں گے اور جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف مقاصد عمل اور نتائج عمل ہیں۔'' (121)

آج کے دور کا انسان آسائشوں، آلائشوں اور تصنعات (Artificialities) میں اتنا کھو گیا ہے کہ اسے یہ دنیا ہی غیر حقیقی لگنے لگی ہے۔ ہر شخص نے چہرے پر منافقت کی نقاب اوڑھی ہوئی ہے بظاہر مسکرا کر ملنا اور بباطن Cut throat competition کی فضا معاشرے پر چھائی ہوئی ہے۔ دھوکہ، فریب، دغا، جھوٹ، منافقت جسے انسانی ضمیر اور عقل سلیم ہمیشہ برا سمجھتی آئی ہے، آج کے معاشروں کا چلن اور کامیابی کے گر بن گئے ہیں۔ ہر انسان نے اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی منزل متعین کی ہوئی ہے اور اسی منزل کے حصول کے گرد اس کی ساری کوششیں گھومتی ہیں لیکن بقول شاعر:

تقدیر کے مضطر گوشوں میں تسکین کا پہلو کوئی نہیں
راہی جب منزل پر آتا ہے وہ رہگزر ہو جاتی ہے

لوگ اپنی خواہشات کے بت کے پجاری ہیں، اسی کو قرآن نے نفس کی پوجا قرار دیا ہے۔
ایک دور تھا جب خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر۔ تو انسان نے اپنی باطنی تسکین کیلئے بت تراش لیے
پھر دور بدلا اور انسان فلسفہ اور نظریات (Ideologies) کا پجاری بن گیا۔ یہ جدیدیت تک تھا۔
مابعد جدید دور کا انسان نہ کسی نظریہ کو مانتا ہے نہ عقیدہ کو، اسے صرف اپنی خواہشات کی تکمیل سے غرض ہے، اپنے Goal تک پہنچنا اور معاشرے میں طاقت اور دولت کا حصول مقصد ہے، جس کی وجہ سے اسے عزت اور وقار ملتا ہے۔ نفس آج کے دور کے انسان کا خدا ہے، قرآن نے خبردار کیا تھا:

"اریت من اتخذالٰهۃ هواه" (122)

(کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے خواہش نفس کو ہی اپنا الٰہ بنالیا ہے۔)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

(افریت من اتخذ الٰهۃ هواه (123)

(پس کیا تو نے دیکھا ہے ایسا شخص جس نے نفس کی خواہش کو ہی اپنا خدا بنالیا ہے۔)

جبکہ اس کے علی الرغم قرآن ہمیں حکم دیتا ہے کہ محض اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی مت کرنا۔ بلکہ نفس کی خواہشات کو رد کرنا کیونکہ دل کے پاس اگر پاسبان عقل نہ ہو تو انسان گمراہی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ قرآن کریم میں حکم ہوا ہے:

"ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه" (124)

(اس کا کہنا نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔)

بلکہ قرآن نے بتایا ہے کہ ہر دور میں حق قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی انسان کا نفس رہا ہے:

"فان لم يستجيبوا لک فاعلم انما يتبعون اهواء هم ومن اضل ممن اتبع هو نه بغير هدى من الله ان الله لايهدى القوم الظلمين" (125)

(پھر اگر یہ تیری نہ مانیں تو تو یقین کر لے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو، بغیر اللہ کی رہنمائی

کے؟ بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔)

اسلام نے انسان کو کاروبار کے کھرے اور صاف ستھرے اصول دیے ہیں۔ جس میں نہ کسی کو دھوکہ دیا جاتا ہے اور نہ دھوکہ قبول کیا جاتا ہے۔ اشیائے صرف جو برائے فروخت ہوں ان میں کوئی نقص ہو تو اسے بیان کرنا بھی فرض ہوتا ہے۔ آج کل کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرح نہیں کہ اشتہار بازی پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور معیار کی طرف کم۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ لین دین کی کچھ شرائط واضح ہوں اور کچھ شرائط خفیہ ہوں۔ اس سلسلہ میں چند احادیث پیش خدمت ہیں۔

آج کے دور میں عیب دار مال کو چمکتے دمکتے Wrapper اور دلکش عورتوں کے فوٹو چپکا کر بیچنے کا رواج عام ہے۔ ڈبے کی رنگا رنگی اور اندر ناقص مال! اس معاملے میں اسلام کی رہنمائی یہ ہے کہ یہ کھلا دھوکا اور رزق حرام کمانا ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث ہے:

"عن ابی هریرة ان رسول الله مر علی صبره من طعام فادخل یده فیها فنا اصابعه بللا، فقال (ماهذا یاصاحب الطعام؟) قال اصابته السماء یارسول الله، قال: (افلا جعلته فوق الطعام؟) قال: (افلا جعلته فوق الطعام کی یراه الناس؟ من غش فلیس منی." (126)

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلے کے ایک ڈھیر پر سے گزرے (جو تاجر نے بیچنے کیلئے منڈی میں رکھا ہوا تھا) آپ نے اپنا ہاتھ غلے میں ڈالا تو انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی۔ آپؐ نے تاجر سے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا بارش کی وجہ سے نمی ہے اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس گیلے غلے کو تم نے ڈھیر کے اوپر کیوں نہ رکھا۔۔۔؟ تا کہ لوگوں کو پتہ چل جاتا۔۔۔ جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مشہور محدث صاحب سبل السلام امیر یمانی الصنعانی لکھتے ہیں:

"لیس ممن اهتدی بهدی، واقتدی بعلمی وعملی، وحسن طریقتی والحدیث دلیل علی تحریم الغش، وهو مجمع علی تحریمه شرعا مذموم فاعله عقلا". (127)

جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔ یعنی میری ہدایت پر اس نے عمل نہ کیا۔ اور میرے علم وعمل کی اقتدا نہ کی اور نہ میرے خوبصورت طریقہ پر چلا۔ اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دھوکہ دہی حرام ہے اور عقل وشریعت دونوں کی رو سے حرام ہے۔)

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ایسے کاروبار سے بھی منع فرمایا ہے جس کی شرائط واضح نہ ہوں یا جس میں دھوکے کا امکان ہو۔ شریعت نے اس طرح کی خرید وفروخت کو ''بیع غرر'' قرار دیا ہے۔ بنکوں، انشورنس کمپنیوں، موبائل فون سروس پرووائڈر کمپنیوں کی شرائط Iceberg کی طرح ہوتی ہیں کہ بظاہر تو بہت کم نظر آتا ہے لیکن تحت الماء بہت کچھ مخفی ہوتا ہے اور مشتری (Customer) جب پھنس جاتا ہے تو اصل شرائط سامنے لاتے ہیں۔ حدیث ہے:

''عن ابی هريرة،قال:نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر وعن بيع الحصاة'' (128)

(ابو ہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکے کی بیع اور کنکریوں کی بیع سے منع فرمایا ہے۔)

شیخ الحدیث فضیلۃ الشیخ الاستاذ محمد علی جانبازؒ انجاز الحاجۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''نهى عن بيع الغرر: هو ما كان له ظاهر يغر المشترى، وباطن مجهول،ويدخل فيه بيوع كثيرة من كل مجهول.'' (129)

دھوکے کی بیع سے منع فرمایا (یعنی ہر وہ سودا جس کا بظاہر تو مشتری (Customer) کو دھوکہ دے اور باطن پوشیدہ ہو۔ اس طرح اسلام نے ہر وہ سودا یا کاروبار منع فرمادیا ہے جس میں خریدار یا بیچنے والے دونوں میں سے ایک کو نقصان پہنچتا ہو۔)

ہائپر ریلیٹی کی بدترین اور خطرناک ترین شکل (Show Business) اور Glamour World ہے جس میں سارا کاروبار دھوکے اور منافقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یونان کی تماثیل ہوں یا روم کے تھیٹر یا مسیحیت کے Oracles، ان سب میں بہروپ بھر کر وہ سب کچھ پیش کیا جاتا تھا جو کہ حقیقت میں ہوتا ہی نہیں تھا اور لوگوں کو خیالی جنتوں کی سیر کروائی جاتی تھی۔ اسی کی ترقی یافتہ شکل آج کا میڈیا اور فلم انڈسٹری ہے۔ قصہ کہانی میں دلچسپی تو انسان کو ہمیشہ سے ہی رہی ہے، انسانی ذہن

کو کہانیاں متاثر بھی کرتی ہیں۔ انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہادری کے کارنامے سرانجام دے، ظلم کو ختم کرے، دولت مند بن کر عیش کرے اور حسین وجمیل نظاروں سے لطف اندوز ہو۔ اسی لیے بعض لوگ خواب وخیال کی دنیا میں مست رہتے ہیں لیکن جب زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو انسان اپنے آپ کو حقیر جانتا اور مقابلے سے فرار حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ نشے کی لعنت میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے بھی انسان کی اس نفسیاتی کمزوری کا لحاظ رکھا ہے۔ قرآن نے ''ایام اللہ'' کے تحت گزشتہ اقوام وملل اور ہیروز (انبیاء) کے قصص بھی بیان کیے ہیں۔ اور Side Heroes یا Villains کو بھی فراموش نہیں کیا ان کو بھی قصص میں جائز مقام دیا ہے لیکن مقصدیت کو مدنظر رکھ کر۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں جتنے بھی قصص بیان ہوئے ہیں وہ دینی مقاصد کے تحت بیان ہوئے ہیں کیونکہ قرآن کریم ہدایت اور ضابطہ زندگی کی کتاب ہے، محض قصے اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود ادبی قواعد اور ابلاغ کے بہترین اسلوب کی پیروی نے ان قصص کو فنی لحاظ سے بھی خوب تر بنا دیا ہے۔ قرآن کریم کے قصص کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد قطبؒ لکھتے ہیں:

> ''قرآن کریم قصہ کے ہیرو کا وہ بلند ترین، پاکیزہ اور صاف ترین لمحہ بیان کرتا ہے جو مثالی نمونہ بن سکے اور جو قارئین کو رفعت اختیار کرنے پر آمادہ کر سکے۔ اسی طرح منحرفین (Diverted people, Villains) کے نفوس کا وہ تاریک حصہ، ان کے قلوب کا وہ سیاہ گوشہ اور ان کے انحراف کی وہ برائی اجاگر کرتا ہے جس سے دوسروں کو ان کے برے افعال سے نفرت ہو اور ان کے برے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ یہی اسلوب درحقیقت قرآن کے مقاصد سے ہم آہنگ ہے۔'' (130)

دوسری طرف دیکھیں تو فلموں اور ڈراموں میں بدکرداروں اور بدمعاشوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جرائم اور بدکاری کے نئے نئے راستے کھولے جاتے ہیں۔ اور جرم وگناہ کو اتنا خوبصورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ معصوم ذہن پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم اگر تجزیہ نفس کی خاطر انسانی کمزوری کے لمحات کو بعض اوقات تفصیل سے بھی بیان کرے تو گناہ سے نفرت ہی پیدا کرتا ہے۔ قرآن کا رویہ وہ نہیں ہوتا جو جدید فنون کا ہوتا ہے جو انسان کی حیوانی تعبیر سے متاثر ہو کر انسان

کے بے راہ روی کے لمحات کو دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بلکہ قرآن ان لمحات کو واقعی انداز میں بیان کرتا ہے مگر زیادہ دیر ان لمحات پر نہیں ٹھہرتا بلکہ جلد ہی انوار الٰہی کی روشنیاں بکھیرنا شروع کر دیتا ہے۔

قرآن کریم اس فتنہ کو، جس میں حضرات سلیمان، داؤد، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام مبتلا ہوئے بلا کم و کاست بیان کرتا ہے کہ یہ ضعف (انسانی کمزوری) جو فطری میلانات کی طرف التفات کی بنا پر واقع ہوئی، اور اس ضعف کی جانب توجہ اسی قدر مقصود ہے کہ انسان دوبارہ اللہ کی جانب رجوع کرے۔ اور اس لمحہ سے بلند ہو کر پاکیزہ ہو جائے۔ قرآن کریم بشری کمزوریوں کو تو بیان کرتا ہے مگر انہیں ہیروشپ کے لمحات نہیں بناتا۔ مثلاً آدم علیہ السلام کے قصے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں قرآن کا منہاج بخوبی واضح اور اجاگر ہے جو مغرب کے اس جدید منہاج سے مختلف ہے جس میں انسانی کمزوریوں کو وقیع بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہی لمحات انسان کی ہیروشپ کے لمحات ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے مقصد تخلیق کو فراموش کر کے نافرمانی کے راستے پر چل نکلتا ہے اور اس طرح خواہش نفس کا شکار ہو کر شیطان کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ لیکن مغربی لٹریچر اور میڈیا اپنے انحراف کی بنا پر انسان کے ان کمزوری کے لمحات کو اس کی جرأت کے لمحات بنا کر پیش کرتا ہے اور معصیت اور گناہ کو اس کی ذات کا اثبات اور اس کے وجود کی آزادی قرار دیتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغربی ذہن و دماغ ہدایت الٰہی سے منحرف اور اس قدیم یونانی دیو مالا (Greek Mythology) سے متاثر ہے جس کی رو سے خدا اور بندے میں ہمیشہ ایک کش مکش جاری رہتی ہے اور بندہ ہمیشہ جابر دیوتا پر کامیابی اور فتح حاصل کرنے کا متمنی رہتا ہے (اس کی وضاحت ہم مقالہ کے آغاز میں زیوس دیوتا اور پرومیتھیوس کا مقدس آگ چرانا، میں کر چکے ہیں۔)

مغربی فلم انڈسٹری ہو، میڈیا ہو یا لٹریچر، اس معاملے میں بڑے ظالم اور بدترین واقع ہوئے ہیں ان کی تاثیر نہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی نافرمانی پر اکساتے ہیں، خواہشات کی بے قید تکمیل کی راہ پر لگاتے ہیں بلکہ خدا سے دشمنی پر اکساتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ انسان کی تکمیل ذات کا یہی طریقہ ہے اور یہی آزادی اظہار رائے ہے۔ مغربی میڈیا کیا، مشرقی اور مسلم میڈیا میں ہر جگہ عورت ہی چھائی ہوئی ہے اور اسے محض شو پیس بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہر ڈرامے، ناول اور فلم کی کہانی مرد

اورعورت کے رومانس کے گرد گھومتی ہے۔پورے ماحول پر جنس (Sex) اور جنسیت (Sexuality) چھائی ہوئی ہے۔یوں لگتا ہے جیسے انسان کی ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ کا مقصد محض جنسی تسکین ہے۔قرآن کریم نے بھی جنس کا ذکر کیا ہے، امرأۃ العزیز کی وارفتگی اور زنانِ مصر کے فریب کو بھی بیان کیا ہے۔اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاک دامنی کی بھی گواہی دی ہے۔مدین کے کنویں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات دو دوشیزاؤں سے ہوئی تھی اور ان میں ایک تن تنہا اپنے باپ کے حکم سے بعد میں جب سیدنا موسیٰؑ کو بلانے آئی تو اس کی باحیا چال اور باوقار گفتگو کا تذکرہ بھی قرآن نے کیا ہے۔قرآن کے مقصد تذکرۂ جنس کی محمد قطبؒ اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

> ''قرآن کریم میں جہاں برے کاموں اور جنس کا ذکر آیا ہے تو اس کا انداز بیان یہ نہیں ہے کہ اس سے لذت حاصل کی جائے۔درحقیقت جنس انسان کی پوری زندگی نہیں ہے بلکہ ایک لمحہ زندگی ہے جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور اس لیے گزر جاتا ہے تا کہ اس کی جگہ دیگر مقاصد حیات لے سکیں اور کائنات وحیات اور انسان کے بارے میں ایمانی تصور ذہن میں جگہ پائے اور نفس انسانی عملی زندگی میں جدوجہد کیلئے آزاد ہو جائے۔'' (131)

اسلام چاہتا ہے کہ ایسا صاف ستھرا معاشرہ ہو جس میں حق اور عدل ہو، راست بازی ہو، باہمی احترام ہو، جس میں لوگوں کو ان کے حقوق میسر آئیں اور لوگ بغیر کسی فتنہ اور انحراف کے عمدگی اور خوش اسلوبی سے زندگی گزاریں۔سب کو بنیادی ضروریاتِ زندگی ملیں۔حلال طریقے سے دولت کمانے پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں رکھی۔بلکہ اپنی محنت اور خدا کے فضل سے حاصل کی ہوئی دولت پر اسلام نے معاشرے کے محروم طبقوں کا بھی حق رکھا ہے۔کمزوروں، ضعیفوں، یتیموں، بیواؤں اور حاجتمندوں کو باعزت اور باوقار طریقے سے حکومتی نظام زکوٰۃ اور کفالت سسٹم سے حصہ رسدی بہم پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔یہ وہ عظیم مقاصد ہیں جن کا حصول انسانیت کے لیے ناگزیر ہے۔اور حقیقی معنوں میں فلاحی معاشرے کے قیام کی منزل کے حصول کا ذریعہ۔

انسانی طبیعت کچھ اس طرح کی ہے کہ جب وہ دنیا میں حد سے زیادہ مگن ہو جاتا ہے تو وہ مقصد حیات بھول جاتا ہے۔جب انسان اپنی حقیقت کو ہی بھول جائے تو پھر اسے دنیا کی حقیقت کیسے معلوم پڑ سکتی ہے۔وہ دنیا کو کھیل تماشا اور دھوکہ (مایا، اعیان، ہائپر ریلیٹی) قرار دیتا ہے قرآن

نے متعدد مقامات پر انسانی ذہن کی اس روش کو موضوع بحث بنایا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ محض دنیا کے ساز و سامان میں مگن نہ ہو جانا، دنیا کی چمک دمک میں مت کھو جانا۔ یہ سرسبز اور ہری بھری دنیا دھوکہ دے گی اور جسے تم مستقل سمجھتے ہو بہت جلد تم سے چھن جائے گی۔ دنیا کی زندگی سامان فریب ہے ، جو اس سے دامن بچا کر نکل گیا وہ خوش نصیب، اور جو اس کے فریب میں پھنس کر محض دنیا کا ہی ہو کر رہ گیا، وہ ناکام و نامراد ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وما الحیوۃ الدنیا لامتاع الغرور"(132)

(اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے)۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ یونس آیت نمبر 25-24، سورہ ابراہیم آیت نمبر 18، سورۃ الکہف آیت نمبر 46-45، سورۃ النور آیت نمبر 39۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''ان سب مقامات پر جو بات انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی دراصل ایک عارضی زندگی ہے یہاں کی بہار بھی عارضی ہے اور خزاں بھی عارضی ہے۔ دل بہلانے کا سامان یہاں بہت کچھ ہے، مگر در حقیقت وہ نہایت حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں جنہیں اپنی کم ظرفی کی وجہ سے آدمی بڑی چیز سمجھتا ہے اور اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ انہی کو پالینا گویا کامیابی کے منتہا تک پہنچ جانا ہے۔ حالانکہ جو بڑے سے بڑے فائدے اور لطف و لذت کے سامان بھی یہاں حاصل ہونے ممکن ہیں وہ بہت حقیر اور صرف چند سال کی حیات مستعار تک محدود ہیں اور ان کا حال بھی یہ ہے کہ تقدیر کی ایک ہی گردش خود اسی دنیا میں ان سب پر جھاڑو پھیر دینے کے لیے کافی ہے۔'' (133)

قرآن کی تعلیمات کی رو سے یہ بات تو صاف ہے کہ یہ دنیا اور مافیہا (اس کے اندر جو کچھ بھی ہے) ایک ٹھوس حقیقت ہے اور بامقصد نظام زندگی ہے۔ دنیا کو خالق کائنات نے دارالامتحان اور آزمائش گاہ بنایا ہے۔ لیکن انسان محض دنیا کی چکا چوند میں کھو کر دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں کو اصلی سمجھ کر دھوکا کھانا یہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ اس مقام پر مابعد جدید صورتحال اور قرآن کی تعلیمات میں اتفاق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کی تنبیہ یہ بھی ہے کہ اس دھوکے

سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اس دنیا کے عارضی ہونے کو سمجھے، اس کی حقیقت کو جان کر اس سے اتنا ہی فائدہ اٹھائے جتنا کہ ضروری ہو اور اصل مقصد کو فراموش نہ کرے۔

اسی مضمون کو دوسرے مقام پر قرآن نے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

"اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یھیج فترہ مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرۃ عذاب شدید ومغفرۃ من اللہ ورضوان وماالحیوۃ الدنیا الامتاع الغرور۔"(134)

(خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا، زینت و آرائش، تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایسے ہے، جیسے بارش ہوئی تو اس کی نباتات نے کاشکاروں کو خوش کر دیا، پھر وہ جوبن پر آتی ہے پھر تو اسے زرد پڑتی ہوئی دیکھتا ہے۔ پھر آخر کار وہ بھس بن جاتی ہے جبکہ آخرت میں (ایسی غفلت کی زندگی کا بدلہ) سخت عذاب ہے۔ اور (ایمان والوں کے لیے) اللہ کی بخشش اور اس کی رضا ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔)

اس آیۂ مبارکہ میں انسان کی دنیاوی زندگی کا نباتات کی زندگی سے تقابل پیش کیا گیا ہے اور بعض مفسرین نے اس زندگی کو چار مراحل میں تقسیم کر کے ان دونوں قسم کی زندگی کا تقابل بتایا ہے۔ مثلاً یہ کہ انسان اپنا بچپن کھیل کود میں گزار دیتا ہے۔ پھر جب اس پر جوانی آتی ہے تو اس کا محبوب مشغلہ اپنے آپ کو بنا سنوار کر پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ اگر وہ مرد ہے تو عورتوں کی توجہ کا مرکز بنے اور عورت ہے تو مردوں کے لیے دلکشی کا باعث ہو، پھر جب اس عمر سے گزرتا ہے تو ہم چو ما دیگرے نیست قسم کی چیز بننے کی خواہش لاحق ہوتی ہے اور آخری عمر میں اس کی ہوس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی خوشحالی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی اولاد کے لیے جان کھپانا شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ اسے موت آ لیتی ہے۔ نباتات کا بھی یہی حال ہے۔ کھیتی جب بیج سے پھوٹنا شروع ہوتی ہے اپنے مالکوں/کسانوں کو خوش کرتی ہے۔ اور ان کی کئی توقعات اس سے وابستہ ہوتی ہیں۔ پھر اس پر جوانی کا دور آتا ہے تو ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس پر بڑھاپا آ جاتا ہے اور وہ زرد پڑنے لگتی ہے۔ اور انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ جانوروں کی خوراک بنتا ہے باقی پاؤں تلے

روندا جاتا ہے اور اس مثال سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جیسے نباتات کی بہار بھی عارضی چیز ہے اور خزاں بھی۔ اسی طرح انسان کی زندگی کی خوشحالیاں بھی عارضی چیزیں ہیں۔ جو شخص دنیا کی دلکشیوں میں کھو گیا اور اسکی بہار پرست ہو گیا وہ بہت بڑے دھوکے میں پڑ گیا۔ اصل دانشمندی یہ ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو محض کھیل کود سمجھنے کی بجائے اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی سمجھے اور اپنی عاقبت کو سنوارنے کی کوشش کرے۔

عورت......اور جنس ہمیشہ سے ہی ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نویسوں، فلم میکروں اور فلسفیوں، مفکروں کا موضوع بحث رہی ہے، شاعروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اس جنس کو Exploit کیا ہے لیکن مابعد جدید دور میں جس طرح میڈیا اسے project کر رہا ہے اور عریاں کر کے ہر کاروبار میں شامل کر رہا ہے اس کی مثال سابقہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ مختلف تجارتی فرمیں، ادارے، کمپنیاں، دفاتر وغیرہ اپنی ملازم عورتوں کے لیے یونیفارم بنواتی ہیں اور اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اس کے بدن کے دلکش حصوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر کے Commercialise کیا جائے۔ معاشی مجبوری کے ساتھ ساتھ یہ شاید عورت کی نفسیاتی ضرورت بھی بن چکی ہے، یعنی موجودہ کاروباری، صارفانہ (Consumer) اور مقابلہ آرائی کے دور میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا! مابعد جدید دور کے ایک مفکر رولینڈ بارتھ (Roland Barth) نے یہ سبق پڑھایا تھا:

> "Is not the body's most erotic zone there where the garment leaves gaps."(135)

لہٰذا اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے Commercial Adds میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور رہی سہی کسر کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ذریعے پوری کر دی جاتی ہے۔ سیمنٹ کے اشتہار سے لے کر شیونگ کریم اور بلیڈ تک عورت کو ہی تشہیر کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ قرآن نے اس بارے میں چونکا دینے والی حقیقت بیان فرمائی ہے:

"الشیطٰن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا"(136)

(شیطان تمہیں فقیری سے دھمکاتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔)

اس آیۂ مبارکہ پرغور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کاروباری لوگ اپنے کاروبار کی ترقی اور publicity کیلئے فحاشی کا سہارا لیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر عورت کی تصویر پراڈکٹ پر نہ ہوگی تو شاید تجارت کامیاب نہ ہوگی، تو اصل میں یہ شیطانی سوچ ہے۔ شیطان انسان کو کاروبار چمکانے کے نت نئے گر سکھاتا ہے اور صلاح دیتا ہے کہ عورت کو زیادہ سے زیادہ عریاں کر کے پیش کرو، ورنہ تمہارا ٹی وی سٹیشن یا اخبار یا میگزین چلے گا نہیں۔ لہٰذا میڈیا کے مالکان پرکشش چہروں اور لوچدار آوازوں والی لڑکیوں کو بھاری مشاہرے پر ملازم رکھتے ہیں، اور اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا کہ خدا کے فضل اور مغفرت کا وعدہ تو متقین کیلئے ہی ہے۔ مابعد جدید ذہنوں میں ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ لو جی! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے زمانے میں کیا دقیانوسی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو؟ اگر ہم زمانے کے چلن کا ساتھ نہیں دیں گے تو پیچھے رہ جائیں گے۔ مگر ہم کہتے ہیں! صنعتی کمالات لازمی طور پر ذہنی بلندی کا ثبوت نہیں ہیں اور نہ اخلاق کی برتری کا۔ ہر ترقی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تنزل لاتی ہے۔ ایک اعتبار سے انسان ترقی کرتا ہے اور دوسرے اعتبار سے تنزل کا شکار ہوتا ہے۔ چاند تک انسان کا سفر سائنس سے زیادہ انجینئر نگ کا کارنامہ ہے اور سائنس پرستوں کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ گو سائنس بذات خود غیر جانبدار ہے مگر سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں طاقت کا ہتھیار ہے اور انسان کو بے روح مشین بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آج انسان اپنے ذہن کا مقتول ہے اور اپنی ذات کا خود قاتل ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ زمان و مکان کے اسرار منکشف کرنے کے پیچھے پڑ کر انسان اپنے آپ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ان عظیم انسانی فتوحات کے سیلاب میں انسان کا اصل مقصد کہیں گم ہو گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خدا کے آخری پیغام کی دعوت کو عام کیا جائے۔ انسان کو اس کی پہچان کرائی جائے اور اسے اندرونی اور بیرونی سکون کا تحفہ دیا جائے!

اپنی بات کو ہم یہاں سمیٹتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یہ کائنات ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس دنیا کی تخلیق محض تفریحی عمل نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، لیکن انسان نے دنیا کی کشش اور رنگینیوں میں کھو کر دنیا کو دھوکے کا سامان سمجھ لیا ہے جس کی وجہ سے وہ تخلیق کائنات کے مقصد اور اپنی ذات کے عرفان سے دور ہو گیا ہے۔ ہم مسلمان اپنے ذہن کی ساختہ حقیقتیں تشکیل نہیں دیتے بلکہ خدا کے رسول کے پیغام کو برحق مان کر ایمان رکھتے اور دنیا، اس کی

ساختہ حقیقتیں تشکیل نہیں دیتے بلکہ خدا کے رسول کے پیغام کو برحق مان کر ایمان رکھتے اور دنیا، اس کی حقیقت، اور انجام سے انکار نہیں کرتے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے:

"وماخلقنا السموات والارض ومابینھما لعبین ماخلقنھما الا بالحق ولکن اکثر ھم لایعلمون"(137)

(اور ہم نے آسمانوں کو، اور زمین کو، اور جو کچھ ان میں ہے، اس کو بھی کسی تفریحی عمل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ کسی حقیقی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔")

یہی مضمون اس سے قبل سورۃ ص کی آیت نمبر 27، سورۃ المومنون آیت نمبر 115-116، سورۃ الحجر آیت نمبر 85 وغیرھا میں بیان ہو چکا ہے۔

اور خدا کی اس وسیع کائنات اور اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر ہم بھی وہی کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے:

"ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف الیل والنھار لأیٰت لاولی الالباب.
الذین یذکرون اللہ قیما وقعود وعلی جنوبھم یتفکرون فی خلق السمٰوات والارض، ربنا ما خلقت ھذا باطلا(138)

(اس میں شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، دن اور رات کے بدل بدل کر آنے میں یقیناً عقل مندوں کیلئے نشانیاں ہیں، جو کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، کہ لیٹے ہوں۔ اور آسمان و زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ باطل پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔)

قرآن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے گوناگوں تعلقات کے بارے میں بلند تر شعور پیدا کر دیا جائے۔ علامہ اقبالؒ اپنے خطبے Knowledge and Religious Experience میں گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe 1749-1832) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"Goethe, while making a general review of Islam as an

educational force, said to Eckermann: 'You see this teaching never fails; with all our system, we cannot go, and generally speaking no man can go, rather than that." (139)

(گوئٹے نے اسلام کا تعلیمی قوت ہونے کی حیثیت سے جائزہ لیتے ہوئے اکرمن سے کہا تھا: تم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ تعلیم کہیں بھی ہزیمت نہیں کھاتی۔ اپنے تمام نظاموں کے باوجود ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے اور ایک ہم ہی نہیں کوئی بھی نہیں جا سکتا۔)

ردِّ تشکیل (Deconstruction)

مابعد جدیدیت کی بحث میں ردِّ تشکیل ایک اہم نظریہ ہے، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت سے ردِّ تشکیل منہا (Minus) کر دیا جائے تو پھر اس کا کوئی تصور پیدا ہونا مشکل ہے یا کم از کم اس کی بحث ادھوری رہے گی۔ ردِّ تشکیل انگریزی لفظ De-Construction کا اردو مترادف ہے، جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، De جو کہ ایک سابقہ ہے بمعنی رد، نفی، مکرر، اور construction بمعنی بناوٹ، ترکیب، تشکیل وغیرہ۔ علاوہ ازیں یہ لفظ تعبیر، توجیہہ، تفسیر اور تجزیے کے معانی کو بھی حاوی ہے۔ Decons اس کا مخفف ہے۔

اردو ادب میں (مفہوم میں کچھ تبدیلی کے ساتھ) تنقیدی تحریروں میں نقادانِ فن اس اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں لہٰذا اردو میں ردِّ تشکیل کے علاوہ؛ ردِّ تعمیر، لاتشکیل، ساخت شکن جیسے مترادفات بھی مستعمل ہیں۔ سابقہ **De میں نفی کا پہلو مضمر ہے لہٰذا یہ ایک منفی فلسفہ اور رویہ ہے اس کا انتہا پسند پہلو یہ ہے کہ اس کا رویہ غیر مفاہمانہ، غیر ہمدردانہ اور بالکل روایت مخالف ہے۔ اسی لیے بعض مغربی مفکرین بھی اسے قطعی انکاریت (Nihilism) ہی کی ایک شق قرار دیتے ہیں کیونکہ اپنی بیش تر صورت میں اس کا رخ نیستی، معدومیت اور لاشیئیت کی طرف ہے۔ ردِّ تشکیل سلسلہ فکر میں متن و معنی یا ادراکِ حقیقت کے تصور میں اکثر تناقص، تضاد یا ابہام کا تاثر نمایاں ہے اور اشتقاقی سطح پر ردِّ تشکیل کا کام معنی کو بے دخل (undo) کرنے کے ہیں۔ یعنی پچھلی قائم شدہ روایات و اسالیب، اصول، حقائق اور صداقتوں کی تشکیل نو کرنا۔ اس لیے ردِّ تشکیل تنقید سے زیادہ "انکاریت" اور "تردید" کا فلسفہ ہے۔**

ردتشکیل کا سب سے بڑا نمائندہ جیکوس دریدا (Jacques Derrida) ہے، جو معنی، پس معنی، معنی در معنی کے تصور کو الٹ کر معنی، ردمعنی میں بدل دیتا ہے اور چونکہ معنی دریدا کے مفہوم میں تعلیق ہی تعلیق ہے، التوا ہی التوا ہے، اس لیے صداقت کا نہ تو وجود ہے اور نہ مطلقیت، وہ کیا ہے؟ اس کی کیا شکل ہے؟ ردتشکیل ان کے جواب فراہم نہیں کرتی بلکہ سوال در سوال پر مہمیز کرتی ہے، دریدا کے نزدیک جوہر یا مرکز تک رسائی یا حتمی اور اساسی معنی بطور وحدت جیسے تصورات اور ان بنیادوں پر جس مغربی فلسفے نے اپنے مابعد الطبیعاتی تصورات کی عمارت کھڑی کی ہے، محض ایک بھرم ہے۔ وہ اس صوت مرکز (Phonocentric) تصور صداقت کو بھی بے دخل کر دیتا ہے جس کے تحت لفظ حتیٰ کہ ''خدا'' بھی بطور صداقت کے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ صوت مرکزیت (Phoncentrism) کا تصور بھی اسی بنیاد پر قائم ہے کہ تحریر پر تقریر کو فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے بھی کہ معرض تحریر میں آتے ہی تقریر کا تقدس آلودہ ہو جاتا ہے۔ تقریر کا تصور راوی اور سامع کے تصور کے ساتھ منتھی ہے۔ دونوں مل کر معنی کو موجود بناتے ہیں اسی بنا پر فرض کر لیا جاتا ہے کہ راوی جو صداقت کا بیان کنندہ ہے، مکمل طور پر صداقت کے علم سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے۔ اس قسم کی کسی بھی فلسفیانہ یا صداقت جویانہ کوشش، دریدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں رکھتی کیوں کہ ان سب کا رخ کسی مطلق اور معین مفروضے کی طرف ہوتا ہے اور مطلق و معین جیسے الفاظ دریدا کی لغت سے باہر ہیں۔

دریدا کا تصور دراصل اس خیال میں مضمر ہے کہ تقریر اور تحریر کو ایک ضد کے طور پر استعمال کرنا اور پھر اس کا احساس دلانا کہ تقریر، تحریر پر فوقیت رکھتی ہے، کچھ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ تقریر کی اہمیت صرف اس لیے ہے کہ اس میں شخص کی موجودگی یعنی Presence کا معاملہ ہے لیکن دلچسپ بات وہ کہتا ہے کہ Absence کا کیا کیا جائے جس کی اہمیت اپنے آپ میں مقدم ہے۔ مثلاً افلاطون کو آج ہم پڑھتے ہی ہیں وہ اپنی قبر سے تو تقریر نہیں کر سکتا۔

اصل میں دریدا مغربی روایات میں پائے جانے والے تصور Logo Centrism (وہ رجحان جو استدلال یا خیال کو زبان اور فلسفے کا مرکزی اصول قرار دیتا ہے) کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ اس لیے کہ مسیحیت (مغرب) میں یہ عقیدہ ہے کہ دنیا کی ابتدا بولے ہوئے لفظ سے ممکن تھی اور یہی بولا ہوا لفظ خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔ دریدا کی کلاسیکی تسلیم کی گئی کتاب "Of Grammatology" میں ''لفظوں پر تصورات قائم ہونے کو (Logcentrism)

(لفظ مرکزیت) کہا گیا ہے۔ 'Logos' یونانی لفظ ہے، نیا عہد نامہ میں Logos ایسی اصطلاح ہے جو "موجودگی" کے تصور سے وابستہ ہے:

"In the beginning was the word (Logos), and the word was with God, and the word was God."

(ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا"۔)(140)

اپنی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ Difference پر گفتگو کرتا ہے۔ فرانسیسی میں لفظ Differer کے معنی افتراق یا فرق کے علاوہ، التوا، تعطل اور تعلیق کے بھی ہیں۔ دریدا لفظ Difference کی جگہ Differance کی شکل میں ایک نیا لفظ ایجاد کرتا ہے۔ وہ اس لفظ کو بطور اصطلاح ہر دو معنی میں استعمال کرتا ہے اور اس طرح سوسئیر (Sassure, Ferdinand) کے نظریۂ زبان کو اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ سوسئیر ہی نے یہ تصور قائم کیا تھا کہ زبان میں دال Signifier (یعنی تحریر یا تقریر میں ادا کردہ لفظ) اور مدلول، (Signified) (یعنی لفظ سے وابستہ تصور) کے اشتراک سے جو لسانی نشانات (Linguistic Signs) وضع ہوتے ہیں وہ افتراق (Differance) کی بنیاد پر خود مختار اور من مانے ہوتے ہیں۔ سوسئیر کہتا ہے کہ جس طرح ثقافتیں بدل جاتی ہیں، اسی طرح صداقتوں اور حقائق کے تناظرات بھی بدل جاتے ہیں۔ ہر ثقافت اپنی سچائیاں خود تعمیر و تخلیق کرتی ہے اور پچھلی صداقتوں کا رد تشکیل کرتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"The text is a tissue of quotations drawn from the innumerable centres of culture." (141)

دراصل مغرب میں مابعد جدیدیت، زندگی کی پوری وسعت کو سمیٹنا چاہتی ہے اس لیے چھٹی دہائی کے آخری ایام میں، مابعد جدیدیت کا پہلا حملہ رد تشکیل کی تھیوری کی شکل میں ہوا۔ دلچسپ نقطہ یہ ہے کہ مغربی دماغ تخریب اور شقاق دماغی (Schizophrenia) کا مظہر ہے، جو مابعد جدیدیت کے دور میں ظہور پذیر ہوا ہے اور جس نے مغربی ذہن کے تذبذب (Skepticism) کو سطح پر اچھال دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مغربی آدمی ہمیشہ ثنویت (Duality) میں فعال رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ سوچنے والے وجود (Cogito) سے منسلک رہا ہے اور اپنی ذات کی فوقیت میں مبتلا

رہا ہے اور دوسری طرف اس نے اپنا رشتہ معروضی دنیا سے قائم رکھا جو ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی اور غیر متوازن ہے۔

ماضی کی روایات واقدار کی جگہ نئی تصوریں لے لیتی ہیں، پرانے تصورات نئی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہوتے ہیں۔۔۔ یہی ردتشکیل ہے، پروفیسر گرامکسی (Antonio Gramsci) کا درج ذیل اقتباس دیکھئے:

> "Everything is political even philosophy and philosophies. In the realm of culture and of thought each production exists not only to earn a place for itself but to displace, win out over, others." (142)

اب ہم اپنی بحث کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وضاحت کریں کہ مابعد جدید مفکرین ردتشکیل (Deconstruction) سے کیا مراد لیتے ہیں۔ سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ آپ موصوف کے نزدیک:

> ''ردتشکیل (Deconstruction) سے مراد متن (Text) کے مطالعے کا وہ طریقۂ کار ہے جس کے ذریعے نہ صرف متن کے متعینہ معنی کو 'بے دخل' (Undo) کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی معنیاتی وحدت کو پارہ پارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ ردتشکیل اصل میں شدید نوعیت کا ''بت شکن رویہ'' ہے۔ اس کے نزدیک کوئی اصول، یا کوئی مفروضہ [عقیدہ، نظریۂ حیات، ایمان، یقین، وحی، الہام وغیرہ۔] مقدس نہیں ہے۔ اس کا معاملہ گویا اس صاحب نظر کا ہے جو 'دین بزرگاں خوش نہ کرد' کا شدت سے قائل ہو۔'' (143)

مابعد جدید مفکرین کا یہی رویہ ہے کہ وہ ماضی کے کسی علم، فلسفے، اصول، صداقت، مقدس متن، تھیوری وغیرہ کو بعینہٖ تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کی ردتشکیل کر کے نئی وضاحت اور نیا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ میری کلیگو (Mary Klags) لکھتی ہیں:

> "There are lots of questions to ask about postmodernism, and one of the most important is about the politics involved or more simply, is this movement toward fragmentation, provisionality, performance and instability something good or something bad: There are

various answers to that, in our contemporary society, the wave, the desire, to return to the pre-postmodern era tends to get associated with conservative political, religious and philosophical groups. In fact, one of the consequences, of postmodernism seems that the rise of religious fundamentalism, as a form of resistance to the questioning of the "grand narratives" of religious truth. This is perhaps more obvious when postmodern books like Salman Rushdie's the Satanic Verses because they deconstruct such grand narratives." (144)

مابعد جدیدیت کو بہت سے سوالات کا سامنا ہے، کیونکہ یہ فکر (مابعد جدیدیت) دعویٰ کرتی ہے کہ کوئی اصول، کوئی حقیقت حتمی، کامل اور غیر مبدل نہیں ہے۔ بلکہ اچھائی، برائی کے تصورات بھی عارضی ہیں۔ پھر مابعد جدیدیت میں، موجودہ معاشرے میں روایت پسند اور تبدیلی کے خلاف مزاحمت کا رجحان اور جدیدیت سے پہلے دور کی طرف رجعت پسندی کی خواہش ہے اور یہ رجعت پسندی سیاست، مذہب اور فلاسفہ کے گروپوں میں بھی ہے۔ درحقیقت مابعد جدیدیت کا ایک نتیجہ تو مذہبی شدت پسندی اور بنیاد پرستی کی لہر کی صورت میں ظاہر ہے اور مابعد جدیدیت کے ان اعتراضات کے خلاف مزاحمت کا رویہ ہے جو وہ ''مذہبی صداقتوں'' کے خلاف کرتی ہے۔ مثلاً سلمان رشدی (ملعون) نے جب کتاب ''شیطانی آیات'' لکھ کر مذہبی متن کی ردتشکیل کی تو اصل میں یہ مذہبی صداقت پر شک کا ہی اظہار تھا۔

مابعد جدیدیت کا نظریہ ردتشکیل ہی یہ ہے کہ اس کی زد سے کوئی اصول یا ضابطہ محفوظ نہیں بلکہ رد کیے جانے کے قابل ہے، حتیٰ کہ الہامی متون بھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، مابعد جدیدیت کے نزدیک جمہوریت، ترقی، آزادی، مذہب، خدا، اشتراکیت اور اس طرح کے دعووں کی وہی حیثیت ہے جو دیو مالائی (Myths) داستانوں اور عقیدوں کی ہے۔ اس لیے انہوں نے ان تمام دعووں اور عقیدوں کو عظیم بیانیے (Metanarratives) کا نام دے کر رد کر دیا ہے۔ جدیدیت (Modernism) کے مفکرین کا خیال تھا کہ انہوں نے بہت سی سچائیاں (Narratives) تشکیل دی (Construct) ہیں اور چاہے مذاہب ہوں یا جدید نظریات، ان کی بنیاد کچھ خودساختہ عالمی

سچائیوں پر استوار ہے۔ لہٰذا مابعد جدید مفکرین کے نزدیک ضروری ہے کہ ان تشکیل شدہ سچائیوں کی ردِ تشکیل (Deconstruction) کی جائے۔ یعنی ان "مفروضہ سچائیوں" کو ڈھا دیا جائے۔ چنانچہ ادب، فنون لطیفہ، آرٹ، سماجی اصول وضابطے ہر جگہ ان کے نزدیک کچھ خود ساختہ سچائیاں اور عظیم بیانیے ہیں جن کی ردِ تشکیل ضروری ہے تاکہ مابعد جدید ادب، فنون لطیفہ وغیرہ میں ایسے "غلط مفروضوں" کا عمل دخل نہ ہو۔ جیسا کہ مابعد جدیدیت کا ایک تجزیہ نگار لکھتا ہے:

"We deconstruct, displace and demystify the logocentic, ethnocentric, phallocentric order of things."(145)

چنانچہ مابعد جدید مفکرین ایسے تمام نظریات کو رد کرتے ہیں جو مابعد جدیدیت سے پہلے تھے چاہے وہ تصور ثقافت ہو، زبان، علم یا اخلاق ومذہب کے بارے میں ہو یا نسلی و مردانہ معاشرتی آرڈر کی بنیاد پر ہوں۔ ایسے تمام مباحث کو نئے سرے سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے اور نہ صرف جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے بلکہ انھیں نئے معنوں اور نئے حالات میں دیکھنا ہے۔
Logocentrism کا ذکر دوبارہ آیا ہے تو اسکے تفصیلی تعارف کیلئے درج ذیل اقتباس پر غور کیجئے:

"Logocentrism term ascribed to Jacques Derrieda that refers to the nature of western thought, language and culture sincc Plato's era. The Greek signifier of word speech and reason', logos possesses connotations in western culture for law and truth. Hence, logocentrism refers to a culture that revolves around a central set of universal principles or beliefs. More specially. Logocentrism denominates that process in the history of western thought which, since Aristotle, privileges speech over writing as being closer to mental experience. Thus, for Derrida the history of metaphysics in the west is the history of Logocentrism. The Logocentric insistence in western philosophy on the priority of voice over writing belongs to metaphysics of presence."(146)

جہاں سوسیئر کے تصور مشار/دال (Signifier) اور مشور/مدلول (Signified) سے گفتگو

کی گئی ہے، وہاں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح دال اور مدلول من مانا روایتی تصور معنی پیدا کرتا ہے۔ دریدا کہتا ہے کہ سوسئیر بے جا طور پر مشور پر زور دیتا ہے۔ اس لیے کہ من مانا تصور معنی جلد ہی ایک قائم مقام (Substitute) کی جگہ لے لیتا ہے۔ جو پوری تھیوری کو ناقص بنا سکتا ہے۔ اس کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ضد یا تفریق کے ساتھ ساتھ Differance (ضد اور التوا) سے مدد لینی چاہیے۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سوسئیر نے بتایا تھا کہ ہر نشان اپنے معنی کے لیے اپنی ضد کا متقاضی ہے یعنی Difference کا۔ دریدا نے اسے Differance سے بدل دیا۔ (یہ فرنچ لفظ ہے جس کا انگلش میں بھی متبادل نہیں ہے) اس کا خیال ہے کہ معنی کسی نشان میں اپنے آپ پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو دال محض مدلول کا ایک حوالہ ہوتا۔ حالانکہ مشار یا دال معدوم تصور معنی کا قائم مقام ہے۔ معنی ضد کی پیداوار ضرور ہے لیکن یہ التوا و افتراق سے بھی دو چار ہے۔ ایسے میں نشان کا کوئی حقیقی معنی نہیں ہو سکتا۔ نتیجے کے طور پر مشار پر زور دینا ناگزیر ہے، ساتھ ہی ساتھ متنیت (Textuality) پر بھی بجائے اس کے کہ مشور یا مدلول کے معنی پر۔ دریدا کے مطابق یہی اصول رد تعمیر میں معاون ہوں گے۔ ایک طرف تو ان سے Logocentric کی نقاب کشائی ممکن ہو سکے گی اور دوسری طرف متن کی زبان پر توجہ دی جا سکے گی اور یہ پتہ چلایا جا سکے گا کہ متنیت کی بنت (Diction) میں متن کا کیا حال ہے۔ Deconstruction کو اس سے غرض نہیں ہے کہ کوئی ایسا اصول وضع کرے کہ حقیقی اکہرے معنی تک رسائی ہو سکے۔ اس کی منطق یہ ہے کہ متن کا مفہوم ہمیشہ غیر متعین ہے۔ اس کے بارے میں کبھی کوئی حتمی فیصلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ Deconstruction کے ہم نواؤں میں امریکی Yale school کے J.Hillis Miller، Paul De man اور Jeffrey Hartman خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ امریکی رد تشکیل میں یوں تو دریدا ہر جگہ موجود ہے لیکن یہ پہلو بھی واضح رہنا چاہیے کہ عمومی طور پر رد تشکیل کی توسیع میں ان دانشوروں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

مابعد جدید مفکرین کے نزدیک کلاسیکی اور روایتی سرمایہ بشمول الہامی متون جنھیں حتمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس کو مستند، حتمی اور مستقل نہ تصور کرتے ہوئے اسے بہت سے تنقیدی پہلوؤں سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال مارکسیت سے دی جا سکتی ہے۔ کچھ دن پہلے تک مارکسیت کا تصور ایک ایسا تصور تھا جس کے آگے مذہبی اقدار بھی گھٹنے ٹیک رہی تھیں اور ایسا محسوس

ہوتا تھا کہ اس کے عوامل حتمی اور مستقل ہیں۔لیکن یہ تصور اب کھوکھلا ثابت ہو چکا ہے۔اسی طرح دیگر isms کو کیوں نہ رد کر دیا جائے اور ان کے چہرے سے تقدیس کی نقاب نوچ لی جائے۔

Hutchinson Dictionary رد تشکیل کی تعریف اس طرح کرتی ہے:

> "A literary theory which views text as a 'decentred' play of structures, lacking any ultimately determinable meaning." (147)

مابعد جدید مفکرین کا خیال ہے کہ ہر ثقافت کے اپنے تصورات و ادراکات ہوتے ہیں اور جب وقت گزرنے سے ثقافت بدلتی ہے تو یہ تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ جان ڈیوی (John Dewy) کہتا ہے:

> "As culture changes, the conceptions that are dominant in a culture change.... History is rewritten."(148)

آیئے رد تشکیل کا ایک اور نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ صدیوں سے چلی آ رہی ہیومنزم (Humanism) کی روایت کی بنیاد، شعور انسانی کے تصور کے محور پر تھی۔ ڈیکارٹ کے یہاں Ego Cogito سے مراد شعور انسانی ہی ہے جو انسان کی شناخت کا مرکز ہے۔ کانٹ اور ہیگل نے اسے مزید مستحکم کیا۔ کانٹ کہتا ہے کہ 'میں سوچتا ہوں' کا لاحقہ انسانی تجربے کی جان ہے، اور شعور انفرادی کا مرکز ہے۔ ڈیکارٹ جس کا زمانہ سولہویں سترہویں صدی کا ہے ان سے پہلے کہہ چکا تھا:

"Cogito ergo sum" (I think therefore I am) لیکن موجودہ فلسفے نے اس اصول کی کایا پلٹ دی۔ لاکاں (Jaques Lacan 1901-1981) بدلیل کہتا ہے:

> "I think where I am not; therefore I am where I do not think." (149)

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی خالی از علت نہ ہوگا کہ بعض مابعد جدید مفکرین ماضی کی روایات و اصول کو مکمل طور پر منہدم کر دینے اور جو نقش کہن نظر آئے مٹادو، کے قائل نہیں بلکہ ان کے نزدیک مابعد جدیدیت پہلے سے موجود نظریات کی نفی کے بجائے انہیں ان کے تناظر کا پابند بناتی ہے

۔یہ ماسبق کے استرداد یا اس کے غلط، غیر اہم اور غیر مفید ہونے پر اصرار کرنے کے بجائے Modify and contextualize کرنے کی حامی ہے:

"Postmodernism seeks not to destroy these theories, but merely to modify and contextualize the claims and knowledge produced by them while self-reflexively acknowledging the limits and basis of any mode of inquiring and representation." (150)

گیاتری سپائی واک (Guattari Spivak) ایک اہم نوآبادیاتی نقاد ہیں۔ان کے کام میں ہمیں ردتشکیل کے اصولوں کی پابندی نظر آتی ہے۔وہ دریدا کی Of Grammatology کی مترجم بھی ہے۔وہ کہتی ہے:

''ردتشکیل ایسی شے کی زبان بول سکتی ہے جس پر وہ تنقید کررہی ہے۔۔۔ آپ اسی شے کی ردتشکیل کر سکتے ہیں جس کی آپ دل سے قدر کرتے آئے ہوں۔'' (151)

بادریلا (Baudrillard) مابعد جدیدیت کے حوالے سے ردتشکیل کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

"We must now come to terms with second revolution. "That of the twentieth century, of postmodernity, which is the immense process of the destruction of meaning equal to the destruction of appearances whoever lives by meaning dies by meaning." (152)

Deconstruction کی اصطلاح کا خالق کیونکہ دریدا ہے اس لیے جب تک دریدا کے حوالے سے اس پر مزید بحث نہ ہو، گفتگو تشنہ رہے گی۔دریدا کہتا ہے:

"A text employees its own stratagems against it, producing a force of dislocation that spreads itself through an entire system." (153)

دریدا کی ردتشکیل فکر میں متن اور معنی دونوں نہ تو ایک ہیں اور نہ دونوں مماثل ہیں۔ایک معنی دوسرے معنی کا رد ہے اور اس رد میں ہی تیسرے معنی کے پھوٹ نکلنے کا امکان بھی پنہاں ہے۔جو ایک

غیر متعین مرحلے پر خود آپ اپنا رد ثابت ہوتا ہے۔ Wikipedia کا مقالہ نگار اپنے الفاظ میں اوپر ذکر کردہ بات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"Deconstruction is the name given by French philosopher Jacques Derrida to an approach (whether in philosophy, literary analysis, or in other fields) which rigorously pursues the meaning of a text to the point undoing the opposition on which it is apparently found, and to the point of showing that those foundations are irreducibly complex, unstable or impossible." (154)

دریدا پر رد تشکیل کے سلسلے میں جن مفکرین کا اثر تھا ان کے نام یہ ہیں: ہسرل (Edmund Husserl)، ہائیڈگر (Martin Heidegger)، فرائڈ (Sigmund Freud)، نطشے (Friedrich Nietzsche)، اور سوسیئر (Ferdinand de Saussure) وغیرہ۔ اوپر ذکر کردہ مفکرین کے علاوہ دریدا نے اپنی تھیوری Differance کیلئے بنیادی Concept افلاطون کے اپوریا (Aporia) سے لیا تھا۔ اپوریا یونانی لفظ ہے جس کا لفظی مطلب ''تعطل معما'' ہے یعنی ''افتراق والتوا'' Differance سے ملتی جلتی شے ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمات میں اپوریا کو ایک فلسفیانہ حربے کے طور پر اختیار کیا ہے۔ بعد میں اس کا شاگرد سقراط، مکالمات میں اپنے مخاطب سے کسی تصور کی تعریف کرنے کو کہتا ہے اور پھر تعریف کے جواب میں اس سے سوالات کر کے اس کی تعریف کو ناقص ثابت کر کے اسے ''تعطل اور معمے'' کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت اپوریا ہے، جس میں تذبذب، عدم یقین اور بے یقینی کے عناصر ہیں۔

رد تشکیل کیا ہے؟ اوپر کے مباحث سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس کا براہ راست جواب دینا خاصا مشکل ہے، رد تشکیل کا سب سے زیادہ زور اسی بات پر ہے کہ معنی کی قیمت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ رد تشکیل متعینہ معنی کو کس طرح بے دخل کرتی ہے اور اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے، یہ بہت صاف ہے کہ اصول و اقدار اور الہامی متون کی صداقت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ اس بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ نکتہ جس نے مابعد الطبیعیاتی فکر کا رخ موڑ دیا ہے اور جس کا اطلاق مذہب پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کہ خدا کے کلام اور اس کی تشریح یعنی پیغمبر کا فرمان اور عمل یعنی سنت بھی تنقید

اور ردِ تشکیل سے بالا نہیں! کیونکہ الہامی متن جب انسانی زبان میں لکھی اور بولی ہوئی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے تو اس کی تفہیم کیلئے بہر حال زبان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یہ کہ انسانی 'علم' یا 'معنی' کسی ایسے جوہر یا اصل (Essence) سے عبارت نہیں جو اظہار (Expression) سے پہلے یا اظہار کے بعد 'آزادانہ' وجود رکھتا ہو۔ ردِ تشکیلی فکر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ 'علم' یا 'معنی' وہ تصورات ہیں جو زبان کی پر افتراق اور مبنی بر تضاد ماہیت اور نوعیت کے پروردہ ہیں، اس لیے یہ 'بے مرکز' ہیں اور عدم قطعیت کا شکار ہیں۔ جیسا کہ مابعد جدیدیت کا ایک تجزیہ نگار لکھتا ہے:

''مابعد جدید مفکرین کا خیال ہے کہ ہماری طرح کے ایک غیر آفاقی اور غیر مرکزی سماج میں خود بخود مابعد جدید کی طرح کے ردِعمل جنم لیتے ہیں۔ عظیم بیانات کے فکری استبداد کا استرداد، ساخت اور طرز کی وحدت کے روایتی سانچوں کی شکست و ریخت اور منطق کی مرکزیت اور اس طرح کے دیگر مصنوعی طور پر مسلط کردہ نظاموں کو اٹھا کر پھینک دینے کا عمل۔'' (155)

ردِ تشکیل کے مباحث سے ہم جو نکات اخذ کر سکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

1۔ ہر ثقافت اور نسل کی اپنی سچائیاں اور اصول ہوتے ہیں اور مابعد جدیدیت؛ جدیدیت اور اس سے پہلے کی تمام روایات کو رد کرنے اور نئے سرے سے تشکیل دینے کی داعی ہے۔''

2۔ متن کے بمشکل ہی وہ معنی قرار پا سکتے ہیں جو بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

3۔ کلاسیکی سرمایہ بشمول الہامی اور مذہبی مقدس متون کی ردِ تشکیل کی جا سکتی ہے۔

4۔ ردِ تشکیل ایسی کسی بھی قسم کی تفہیم کو جارحانہ بتاتی ہے جو اپنے اخذ کردہ، وضع کردہ یا خلق کردہ معنی کو دوسروں پر عائد کرتی اور اپنے ہی معنی کو حتمی سمجھتی ہے۔

5۔ ردِ تشکیل، معنی ہی نہیں سچائی پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے کہ کسی دعوے، عقیدے یا تھیوری کے سچ کا پتہ لگانے سے پہلے اس کی منشا فہمی (Understanding) ضروری ہے۔ ردِ تشکیل فکر چونکہ متن ہی نہیں ساری کائنات کو صداقت اور معنی سے خالی قرار دیتی ہے، اس لیے لفظ ''قدر'' بھی اس کیلئے ایک جزوِ زائد کا حکم رکھتا ہے۔ ردِ تشکیل کا نظریہ ایسی تمام قدروں سے انکاری ہے جو عرفِ عام، اخلاقی، مذہبی، سیاسی، جمالیاتی اور تعلیمی صیغوں سے متعلق سمجھی جاتی ہیں۔ انکار کے اس رویے کے پیشِ نظر بعض نقادوں کا خیال ہے کہ:

''انکاریت ایک ایسی وبا ہے جو مغربی معاشرے میں تھوڑے وقفے سے اپنا سر اٹھاتی رہتی ہے اور مغربی معقولیت پسندی کی طویل روایت، سیاسی استقامت اور اخلاقی نفاست کے تئیں ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہے۔''(156)

ردِّ تشکیل (Deconstruction) کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر:

اسلامؒ کے نقطہ نظر سے ردِ تشکیل کا نظریہ باطل اور انسانی معاشرے کو انتشار و خلفشار میں مبتلا کرنے والا ہے۔ آج کے دور کا انسان جب ہر گزشتہ نظام اور صداقت کو باطل قرار دے کر سچائی سے محروم ہو چکا ہے۔ جو 'معنی' کی اہمیت سے انکاری ہے، وہ اندھیرے میں بھٹکتا ہوا ایک ایسا اندھا ہے جو تنگ پہاڑی راستے پر بے مہابا بھاگا چلا جا رہا ہے اور جس کے انجام کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کیلئے عقل افلاطون کی ضرورت نہیں۔ مابعد جدیدیت، جدیدیت کے رد کے زعم میں ہر صداقت، ہر مرکز، ہر معنویت اور ہر روایت سے باغی ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے بے مثل انقلاب سے اس درجہ مرعوب ہے کہ اس کے شعور کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ فکر انسانی کا یہ کیسا مضحکہ خیز مقام آ گیا ہے کہ انسانی شعور اپنی ہی نسلوں کی تسلیم شدہ، صدیوں سے طے شدہ تھیوریز اور صداقتوں کے انہدام کے درپے ہے۔ محض تبدیلیٔ زماں کی وجہ سے؟ حالانکہ قابل غور بات یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں جو بھی تبدیلی آ رہی ہے وہ ذرائع اور وسائل کی دنیا میں ہے نہ کہ مقاصد اور اصول واخلاق کی دنیا میں! فنی ایجادات اور تکنیکی انکشافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو بڑھا رہے ہیں۔ زمان و مکان کی رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں، اور انسان کا اقتدار بڑھ رہا ہے لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہے۔ اس تبدیلی کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ صدیوں سے طے شدہ اور انسانیت کی آزمودہ صداقتوں کو ڈھا دیا جائے، اصول اخلاق اور اقدار حیات کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر سپر سونک (Super Sonic) طیاروں اور جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین و آسمان کی وسعتیں سمٹ گئی ہیں، اگر میڈیا نے (بشمول انٹرنیٹ) ہماری آنکھوں اور کانوں کی قدرت کو کائنات کی وسعتوں اور سمندروں کی پہنائیوں تک پہنچا دیا ہے تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک برائی تھی آج مطلوب ہو جائے۔ اگر تمام یا اکثر انسانی علم Digitalize ہو کر a click away (انگلی کی دوری پر) ہے تو خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر

آخر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ کنزیومر سوسائٹی کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ اصول دھوکہ دہی اور اصول انصاف کو بھی بدل دیا جائے؟ پروفیسر خورشید احمد رقم طراز ہیں:

''جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ زمانی تغیرات، اصولوں میں ردوبدل کے متقاضی ہیں۔ درحقیقت تمام ایجادات وانکشافات انسان کیلئے ہیں نہ انسان ان کیلئے۔ یہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں اسی وقت نافع ہیں جب وہ اعلیٰ مقاصد کے تابع ہوں۔ مقاصد واصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد واصول کے مطابق بدلنا چاہیے۔ مقاصد اور اصولوں کی حیثیت تو ان معیارات کی ہے جن سے تکنیکی ترقیات کے حسن وقبح کو ناپا جائے گا۔ اگر ان ترقیات کے باوجود انسان پریشان ومضطرب ہی رہتا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے۔

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی

فقط ایک دل کی شگفتگی سبب نشاط بہار ہے۔'' (157)

انسانی حیات میں بیک وقت دائمی اور تغیر پذیر دونوں طرح کے عناصر کارفرما ہیں۔ انسانی جسم کے اندر بھی ہر لحہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ Biological Sciences ہمیں بتاتی ہیں کہ انسانی جسم کے خلیے (Cells) پرانے اور عمر رسیدہ ہو کر مردہ ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کیلئے نئے خلیے بنتے رہتے ہیں اور یہ عمل ہر لحظہ جاری ہے۔ میڈیکل سائنس کی اصطلاح میں اس عمل کو Metabolism کہا جاتا ہے۔ ایک بچے کا جسم جوان ہونے تک مکمل طور پر (تخریب وتعمیر کے عمل سے گزر کر) بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرتبہ انسان کا جسم اپنے آپ کو بالکل تبدیل کر کے ایک نیا جسم بن جاتا ہے لیکن اس تبدیلی میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی بنیادی عقل اور اس کا شعور، انا (Ego) غیر متبدل رہتی ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ہماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی۔

مابعد جدیدیت سے پہلے جدیدیت کے بھی کچھ ایسے ہی دعوے تھے کہ ہر چیز میں تبدیلی اور نیا پن ہونا چاہیے اور قدیم روایات وضوابط کا انہوں نے بھی انکار کیا تھا۔ جدیدیت کے یہ دعاوی علامہ اقبالؒ کے سامنے بھی تھے اسی بنیاد پر انہوں نے کہا تھا:

''ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ وثبات کا ایک عنصر بھی

موجود ہے..... لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں انسان اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا..... اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر وتبدل کا جو بھی نقشہ ہم نے قائم کیا ہو اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں۔"(158)

لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے تبدیلی کا اگر امکان ہے تو وہ تہذیب وتمدن کے فروغ میں ہے اور ظواہر میں ہے، انسانی فطرت، کائنات کے بنیادی قوانین اور ہدایت وضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہم زیر غور مسئلے کی مزید تحقیق قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں کرتے ہیں۔

اسلام خدا کی ہدایت کا نام ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ انبیاء و رسل کے ذریعے انسان کی رہنمائی کیلئے وقتاً فوقتاً بھیجی ہے۔ تمام انبیاء کی بنیادی دعوت ایک ہی تھی اور ضابطۂ حیات کا نام اسلام ہی تھا۔ اور یہ ضابطۂ حیات مکمل اور آخری شکل میں ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ملا۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو عین فطرت کے اصولوں اور انسانی طبیعت کے مطابق ہے اور انسان اس کے ذریعہ سے دنیاوی اور اخروی دونوں کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اس قانون کو انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے اور غیر متبدل ہے:

"لاتبدیل لکلمٰت اللہ" (159)

(خدا کے احکام وفرامین بدل نہیں جاتے۔)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

"فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا"(160)

(پس تم خدا کے طریقے (فطری قوانین) میں تبدیلی نہ پاؤ گے)

قرآن کی یہ آیات بالکل صاف اور واضح ہیں اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ خدا کا دین، خدا کی کائنات کے نظام کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے اور محض زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلے پر عقل سلیم کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو فکر و نظر کا ہر پہلو اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ خدا کے قانون میں کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ اور اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے۔ زمانے کی تبدیلی کا اثر ان نظریات، قوانین اور تصورات پر پڑتا ہے جو انسان نے بنائی ہوں کیونکہ انسانی فکر زمان و مکان کی حدود میں مقید ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حقائق سے آگاہ نہیں۔ وہ ایک محدود بصیرت کے ساتھ آج ایک چیز کو صحیح سمجھ کر پیش کرتی ہے مگر کل جب وہ حالات پیش آتے ہیں جن کا کوئی تصور پہلے نہ تھا تو وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انسان کی پیش کردہ تصورات اور قوانین بعد والی نسلوں نے غلط ثابت نہ کیے ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق اور مدبر الامر ہے، رب ہے، رازق ہے، عزیز ہے، لطیف ہے، خبیر ہے، ذوالقوۃ المتین ہے۔ اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ زمان و مکان کی قیود اس کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو قانون ایسے حکیم اور رب العالمین کی طرف سے ہو اس کا کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ محدود ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ خدا کے علم اور قانون کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی out dated ہو جائے وہ ہمیشہ اتنا ہی تازہ رہے گا جتنی صبح بہار۔

دوسری بات یہ کہ خدا کا یہ قانون بنیادی طور پر ہدایت و ضلالت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے اور ان اصولوں اور ان اقدار کو بیان کرتا ہے جن پر تغیرات عقل و شعور اور زمان و مکان، تہذیبوں کے عروج و زوال کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ فطرت کا قانون ہے جو قائم اور مستحکم ہے۔

تیسری بات یہ کہ قرآن و سنت اصولی رہنمائی فراہم کرتے ہیں: انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں متحرک (Functional) رہنا چاہیے۔

اسی لیے قرآن نے وہ دعویٰ کیا ہے جو دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے نہیں کیا:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (161)

(آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔)

اسلام نے ختم نبوت کا نظریہ دیا ہے یعنی یہ عقیدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا اور وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور اب قیامت تک قرآن ہی اللہ کی کتاب اور بنی نوع انسان کی ہدایت کا ذریعہ ہے یہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب زمانے میں کسی ایسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے جو بنیادی اصولوں میں کسی ترمیم کی متقاضی ہو۔ آنے والی ہر جدت کی نوعیت جزوی اور ذیلی ہی ہوگی۔ اس لیے یہ کہنا کہ اب ہم جدیدیت کے عہد میں ہیں، اس لیے ماقبل جدیدیت کی ہر چیز تبدیل ہونی چاہیے۔ یا یہ کہ اب ہم مابعد جدیدیت کے عہد میں ہیں اس لیے جدیدیت کی ہر چیز اور تھیوری کی رد تشکیل ضروری ہے ایک نہایت لغو اور ناقابل تسلیم بات ہے۔ اگر ہر آنے والی نسل پچھلی نسل کے علمی سرمائے کے ساتھ یہی "بت شکن" رویہ اپنائی رہے تو سوچیے ہم علم کے ورثے کو خاک محفوظ کر سکیں گے! آنے والی نسلوں کو کیا منتقل کریں گے؟ تہذیب و تمدن کا ارتقاء کیسے ہوگا؟ ان سوالوں کے جواب ابھی مابعد جدیدیت کے ذمہ ہیں۔

رد تشکیل کا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ ہر معنی کی تہہ میں مزید معنی ہوتے ہیں اور معنی در معنی کے اس نظریہ کو رد کیا جانا چاہیے بلکہ 'معنی' کو رد معنی کی تھیوری میں بدلنا چاہیے۔ یعنی دال (Signifier) اور مدلول (Signified) کا باہمی رشتہ ایسا پیچیدہ ہے کہ اس سے ایک متعین مفہوم اخذ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ نقطہ نظر بالکل غلط اور خود رد تشکیل کے حوالہ کیے جانے کے قابل ہے۔

دیکھیے! خالق کائنات نے جب سب سے پہلے انسان سیدنا آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو انہیں:

"علم ادم الاسمآء کلھا"(162)

(اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھائے)

نہ صرف دال/مشار (Singifier) بلکہ مدلول/مشیر (Signified) دونوں کا علم دیا۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"آدم علیہ السلام کو تمام نام بتائے یعنی ان کی تمام اولاد کے علاوہ سب جانوروں، زمین،

آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، چرند، فرشتے، تارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے نام بتائے۔" (163)

اور علامہ سعدیؒ مزید وضاحت فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء اور ان کے مسمّی کا علم عطا فرمایا۔ یعنی الفاظ اور معانی دونوں کا علم سکھایا۔ یہاں تک کہ اسما میں سے مکبر اور مصغر کے مابین امتیاز کو بھی واضح کر دیا۔" (164)

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات حتیٰ کہ فرشتوں پر بھی انسان کو فضیلت عطا فرمائی ہے۔ انسان کو فرشتوں سے زائد جو چیز ودیعت کی گئی تھی۔ وہ تھی زمین کی اشیا کے نام، ان کے خواص، ان خواص کے ذریعے نامعلوم باتوں تک پہنچنے (تحقیق یا استنباط) کی قوت۔ یعنی انسان کو اشیاء کا سرسری علم دیا گیا تھا۔ پھر وہ تحقیق اور جستجو کے ذریعہ اس میں از خود اضافہ کر سکتا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ایسا کیا ہے جبھی تو علوم میں ارتقا ہوا ہے۔ لیکن اگر دوال اور مدلول میں افتراق والتوا اور ردِ معنی تسلیم کر لیا جائے تو آپ بتایئے کہ فکر انسانی کسی ایک نقطے پر بھی متفق ہو سکے گی؟ یا تحقیق و تنقید کے نام پر نئی نئی نکتہ سنجیاں کی جائیں گی۔ اور ایسا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی متن کو مغرب میں Authority تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ تاریخی حقائق اور دلائل سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خدا کا آخری کلام یعنی قرآن مجید غیر متبدل اور غیر محرف ہے۔ اس کے الفاظ و معانی بھی واضح اور بغیر آمیزش کے ہیں۔ قرآن عرب قوم پر نازل ہوا تھا، ایسی قوم جو اپنے علاوہ باقیوں کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے۔ لیکن جب قرآن عربی مبین میں نازل ہوا تو اسے سن کر کامل العقل اور باضمیر فوراً ایمان لے آئے اور بڑے بڑے شعرا نے تسلیم کیا کہ قرآن کی زبان کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کا اپنی زبان کے بارے میں دعویٰ ہے:

"هذا لسان عربي مبين" (165)

(یہ قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے۔)

یعنی قرآن ایسی صاف عربی زبان میں ہے جو فصاحت و بلاغت اور اعجاز بیان میں بے نظیر ہے۔ اور قرآن نے اپنے مخاطب عربوں کو کھول کھول کر حقائق واضح کر دیئے ان فصیح و بلیغ عربیوں

میں کبھی الفاظ و معانی کو لے کر تنازعہ نہیں پیدا ہوا۔ کبھی قرآن پر یہ اعتراض نہیں کیا گیا کہ یہ جو الفاظ نازل ہوتے ہیں ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

"الرٰ تلک ایٰت الکتٰب المبین. انا انزلنه قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون"(166)

(یہ آیتیں واضح کتاب کی ہیں۔ یقیناً ہم نے اس قرآن عربی کو نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔)

آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد، لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ کتاب اس زبان میں ہو جس کو وہ سمجھ سکیں اس لیے ہر آسمانی کتاب اس قومی زبان پر نازل ہوئی۔ جس قوم کی ہدایت کیلئے وہ اتاری گئی تھی۔ قرآن کریم کے مخاطب اول چونکہ عرب تھے۔ اس لیے قرآن بھی عربی زبان میں نازل ہوا۔ علاوہ ازیں عربی زبان اپنی فصاحت و بلاغت، ایجاز و اعجاز اور ادائے معانی کے لحاظ سے دنیا کی بہترین زبان ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"انزل الکتب باشرف اللغات علی اشرف الرسل بسفارة اشرف الملائکه وکان ذالک فی اشراف بقاع الارض وابتداء انزاله فی اشرف شهور السنة وهو رمضان فکمل من کل الوجوه."(167)

(اللہ تعالیٰ نے اشرف الکتب (قرآن) کو اشرف اللغات (عربی) میں اشرف الرسل (افصح العرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اشرف الملائکہ (جبرائیل) کے ذریعے نازل فرمایا اور مکہ، جہاں اس کا آغاز ہوا، دنیا کا اشرف ترین مقام ہے اور جس مہینے میں اس کے نزول کی ابتدا ہوئی وہ بھی اشرف ترین مہینہ (رمضان) ہے۔

لہٰذا قرآن کو سمجھنے میں اس کے مخاطبین کو کبھی الجھن پیش نہیں آئی کیونکہ یہ صاف صاف اور کھول کھول کر اپنا پیغام بیان کرتا ہے۔ اس کے دال اور مدلول میں کبھی افتراق و التوا کا مسئلہ نہیں بنا۔ چودہ صدیاں ہوگئی ہیں اس کے نزول کو نہ صحابہ میں اس کے اصول پر اختلاف نہ مابعد امت میں۔ مفسرین میں بھی اگر اختلاف ہے تو انسانی فہم و شعور کی رسائی کے نقص اور کمی کی وجہ سے ہے ورنہ اصولی اختلاف کہیں نہیں ہے۔

معنی کے 'عدم استحکام' اور الفاظ کے 'باطنی معنی' مراد لینا جس طرح کہ ردتشکیل کی تھیوری آج

کہتی ہے تاریخ اسلام میں اس کا ظہور پہلے بھی ہو چکا ہے۔ سوادِ اعظم، اہل السنّت والجماعۃ کے آئمہ مسلمین نے بڑی شد و مد کے ساتھ باطنیوں کے ہر دعویٰ کو رد کیا اور دلائل سے قرآن و حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم کا دفاع کیا۔ یہ باطنی لوگ کون تھے اس بارے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''باطنیہ: (الف) اسماعیلیوں (شیعہ فرقہ) کو یہ نام خصوصاً اس لیے دیا گیا کہ وہ قرآن مجید اور احادیث کے ظاہری الفاظ کے باطنی معنوں پر زور دیتے تھے۔ (ب) عموماً اس کلمے کا اطلاق ہر ایسے شخص پر بھی ہوتا تھا جس پر یہ الزام ہو کہ وہ قرآن و حدیث میں لفظی معنوں کو رد اور باطنی معنوں کو قبول کرتا ہے...... عقاید سے قطع نظر ان مصطلحات اور تصورات نے صوفی خیالات کی تمثیلات پر بہت اثر ڈالا۔ اس قسم کی تاویل نے جو مختلف صورتیں بدلیں اس کا خاص اثر سنیوں پر یہ ہوا کہ وہ ہر قسم کی تمثیلی تاویل کو مشکوک سمجھنے لگے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب القسطاس المستقیم، میں عام تاویل کی قانونی حد بندی کے تجزیے میں اسماعیلی باطنیہ کے خیالات سے مختلف راستہ اختیار کیا ہے۔

بعد کے سنّی مصنفین نے باطنیہ کی اصطلاح کو مخالفانہ طور پر ان مصنفین کیلئے استعمال کیا ہے جو ظاہری معنوں کی تردید میں باطنی معنوں کی کلی حمایت پر بہت زور دیتے ہیں، چنانچہ امام ابن تیمیہؒ نے اس اصطلاح کو نہ صرف باطنی شیعوں کیلئے استعمال کیا بلکہ اس میں انہوں نے صوفیوں کو بھی شامل کرلیا۔ صوفیوں کی رائے میں قرآن مجید کے بہت وسیع باطنی معنی ہیں، جن کی شرح غور و خوض کرنے والے پر ا ہوتی ہے۔'' (168)

معذرت خواہ ہوں کہ ایک طویل اقتباس نقل کرنا پڑا لیکن باطنیہ کے رد تشکیل کے نظریہ کی وضاحت کیلئے ضروری تھا۔ باطنیہ کے مقابلہ میں اہل السنّت والجماعت کا وہ گروہ جو قرآن و حدیث کے ظاہری معنی مراد لینے کا قائل تھا 'ظاہریہ' کہلایا۔ ظاہریہ اور باطنیہ کی ان بحثوں میں جو دورِ حاضر کی رد تشکیل کی بحثوں کی مماثل ہیں، گیارویں صدی کے اندلسی علما میں ظاہریہ کا پلڑا بھاری رہا۔ انہوں نے باطنیہ کی مخالفت کرتے ہوئے باطنیہ کی پر اسرار اور تمثیلی تاویلوں کو رد کیا اور اصرار کیا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کا نزول ایک بے مثل تاریخی حقیقت ہے، بخلاف انجیل یا کسی دوسرے صحیفۂ مذہبیہ کے، چنانچہ کلام الٰہی سے وہی معنی مراد لیے جا سکتے ہیں، جو ازروئے دین اور ازروئے تاریخ (حدیث و سیرت) اور ازروئے صورتحال مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ اس وقت سے

لیے آنے والے زمانوں کے لیے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ علمائے ظاہریہ میں نحوی بھی تھے اور ماہرین لسان ولغت بھی۔ لیکن یہ متن مقدسہ کی قرأت مخصوص سے ہٹ کر کسی بھی رمزیہ یا باطنی تمثیلی یا فلسفیانہ تاویل کے سخت خلاف تھے۔ علمائے ظاہریہ میں ابن حزمؒ اور ان کے بعض معاصرین کا خصوصیت سے ذکر آتا ہے ان کے نظریۂ متن (Text Theory) اور نظریہ قرأت سے مشہور مابعد جدید مفکر ایڈورڈ ڈبلیو سعید نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے، اور ظاہریہ و باطنیہ کی ان بحثوں کو دور حاضر کی رد تشکیلی اور لسانی بحثوں کے مماثل قرار دیا ہے۔ ایڈورڈ کہتا ہے:

"During the eleventh century in Andalusia, there existed a remarkably sophisticated and unexpectedly prophetic school of Islamic philosophic grammarians, whose polemics anticipate twentieth century debates between structuralists and generative grammarians, between Descriptivists and Behaviorists, nor is this all. One small group of these Andalusian linguists directed its energies against tendencies amongst rival linguists to turn the question of meaning in language into esoteric and allegorical exercises. Among the group were three linguists and theoretical grammarians, Ibn Hazm, Ibn Jinni, and Ibn Mada, Alqurtoli, all of whom worked in Cordoba during the eleventh century, all belonging to the zahirite school, all antagonists of the batinist school. Batinists held that meaning in language is concealed within the words; meaning is therefore available only as the result of an Inward-tending exegesis. The zahirites their name derives from the Arabic word for clear, apparent, and phenomenal, batin connote internal argued that words had only a surface meaning, one that was anchored to a particular usage, circumstance, historical and religious situation.... Since the Koran is the result of a unique event, the literal "Descent" into worldliness of a

text, as well as its language and form are then to be viewed as stable and complete. More over, the language of the text is Arabic, which therefore becomes a privileged language, and its vessel is the prophet (or messenger), Mohammad, similarly privileged. Such a text can be regarded as having an absolutely defined origin and consequently cannot be referred back to any particular interpreter or interpretation, although this is clearly what the Batinites tried to...." (169)

ایڈورڈ نے اپنی کتاب میں اگر چہ ظاہریہ اور باطنیہ کی بحث کو سوسیئر اور چومسکی کے مویدین کے مباحث سے مماثل قرار دیا ہے۔ لیکن تاریخ اسلام میں کبھی بھی باطنیہ کے نقطۂ نظر کو پذیرائی نہیں مل سکی۔ اگر چہ امت مسلمہ میں ایک قابل ذکر تعداد اہل تشیع کی بھی ہے لیکن شیعوں میں بھی باطنیہ ایک قلیل فرقہ ہی ہے جس کے پیروکار ہر دور میں اقلیت میں رہے ہیں۔ لیکن اس افسوسناک حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ باطنیوں کے نقطۂ نظر کا اثر سنی مسلمان صوفیا اور فلاسفہ کے افکار پر ملتا ہے لیکن سنیوں میں بھی اہل حدیث (محدثین) اور فقہا کے گروہ نے صوفیا کے باطنی افکار کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

ہم اس مقام پر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی تعلیمات صاف ستھری، واضح اور کجی سے پاک ہیں جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات نے ایسا کوئی چور دروازہ نہیں چھوڑا جس کی آڑ لے کر کوئی متونِ شریعہ (قرآن وحدیث) کی من مانی تاویلات کرتا رہے اور امت اسے قبول کرلے۔ کسی مفکر یا ''بزرگِ صالح'' کے گمراہ اور ''ضال مضل'' ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ دین میں کسی ایسے طریقے کی طرف دعوت دے جس پر اسلافِ امت اور خیر القرون سے مثال نہ پیش کی جا سکے۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''عن ابی الدرداء قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لقد تركتكم على مثل البيضاء ليلها ونهارها سواء قال ابو درداء صدق، والله، رسول الله صلى الله عليه وسلم تركنا، والله، على مثل البيضاء ليلها ونهارها سواء.''(170)

(ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں نے تم کو ایسی شریعت پر چھوڑا ہے کہ رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ کہا ابو درداء نے کہ سچ فرمایا اللہ کے رسول نے، خدا کی قسم! آپؐ نے ہم کو ایسی ہی شریعت پر چھوڑا ہے جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔)

مراد یہ ہے کہ یہ ایسی شریعت ہے جس کے احکام نہایت صاف اور واضح ہیں، جن پر عمل کرنا نہایت آسان ہے، فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہیں۔ ایسی شریعت ہے کہ اس میں غوامض اور رموز و مغلوطات اور چیستانیں نہیں ہیں کہ کسی کے فہم وادراک میں نہ آسکیں۔ اور نہ احکام ایسے شدید ہیں کہ اس پر عمل نہ ہو سکے۔

آخر میں ہم ردتشکیل سے سوال پوچھتے ہیں جن کے جواب فراہم کرنا اس کے ذمہ باقی اور واجب ہیں کہ: کیا واقعی اس کا مقصد ہر اس روایت کو تہس نہس کرنا ہے، جو صدیوں سے نکھرتی، سنورتی اور منتقل ہوتی چلی آئی ہے؟ یا اس تنظیم ہی کی مخالفت اس کے قصد میں شامل ہے جو انسانوں کو یک جہتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بلند کوش مقصد پر استوار ہے؟ کیا ردتشکیل کے پاس اس شک کا کوئی تدارک ہے کہ: ردتشکیل نے تردید وتشکیک وتخریب کے علم وفکر کی اشاعت کیلئے زمین تیار کی ہے جو دانشورانہ منظرنامے میں ایک ایسے مہلک کیڑے کی طرح ہے جو نباتات کو اندر اور باہر دونوں طرف سے کھوکھلا اور چھلنی کر دیتا ہے۔

حواشی (باب دوم)

(1) Retrieved from www.wikipedia.org.

(2) www.askoxford.com/concise-oed/postmodernism

(3) Merriam-Webster's definition of postmodernism (online).

(4) Ruth Reichl, cook's (November 1989); American Heritage Dictionary's definition of the postmodern.

(5) The Hutchinson Dictionary of Ideas (1994): Helicon publishing Ltd. Oxford.

(6) Cuddon J.a, The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, Penguin Books London 1991, p.732.

(7) www.pbs.org/faithandreason/postm-body.html

(8) Lyotard, Jean-Francois (1993) The Postmodern Condition: A Report on knowledge: (Translation from the French by Geoff Bennington and Brian Massumi) Minneapolis: university of Minnesota press. pp.15-23.

(9) براؤنی حرکت: سکاٹش ماہر نباتات رابرٹ براؤن (Brown Robert 1773-1858) جنہوں نے ایٹموں اور مالیکیولوں کی بے ترتیب حرکت کا ماڈل 1827ء میں پیش کیا ان کے نام پر بے ترتیب اور بے

مقصد حرکت کو براؤنی حرکت کہا جاتا ہے۔

(10) www.gseis-ucla.edu/courses/ed2539/GLOBE.

(11) روزنامہ جنگ لاہور جلد 30 نمبر 260، 3 جولائی 2009ء

(12) اس موضوع پر تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے:

Bauman, Zygmunt (2000), liquid Modernity, Cambridge: Polity Press.

(13) Lyotard, J-F. (1993) The Postmodern condition: A Report on knowledge, Ibid, p24

(14) www.wikipedia.org

(15) The Postmodern Turn, Essays in postmodern Theory and culture, Ohio university press, (1987). p12

(16) Thompson J-M. Post-Modernism, The Hibbert Journal, Vol. xii No.4 July 1994 p33.

(17) www.wikipedia.org

(18) Ibid

(19) Ibid

(20) Encyclopaedia Britannica. 1991:

(21) www.wikipedia.org quoted from Walter Truett Anderson (1996) the Fontana postmodernism Reader

(22) Lyotard, J.F. (1993) The Postmodern condition: A Report on knowledge Ibid, p19

(23) Lyotard J-F (1993) The Postmodern condition: A Report on Knowledge Ibid. p24.

(24) نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994ء، ص 531

(25) ایضاً

(26) ایضاً، ص 533

(27) Novak Philip, The vision of Nietzsche, Element, Brisbane (1996) p.108

(28) نارنگ، گوپی چند، ایضاً، ص 541

(29) نیر، ناصر عباس، مابعد جدیدیت نظری مباحث، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، س ن ص 91

(30) Encarta.msn.com.

(31) مطالعہ پاکستان برائے ہائر سیکنڈری، کورس کوڈ 317، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2007، ص 31

(32) ایضاً، ص327

(33) نارنگ گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایضاً، ص543

(34) www.colorado.edu/English

(35) Ibid

(36) نارنگ، گوپی چند، ایضاً، ص533

(37) Akbar S. Ahmad (1992), Postmodernism and Islam, predicament and promise Routledge, p.10

(38) Encyclopaedia of cultural Anthropology p.994

(39) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2007، صفحہ 37

(40) ایضاً، ص40

(41) ایضاً، ص43

(42) Jencks, Charles (1993) Postmodern Architecture, London p.319

(43) Postmodernism پر تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے:

Foucault, Michel (1972) the Archaeology of knowledge. Sheriden Smith, A.M. (trans) London, Tavistock.

(44) Harvey, David (1993) The Idea of the Postmodern, Oxford: Blackwell p.124

(45) Ibid p.126

(46) نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایضاً، ص534

(47) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، ایضاً، ص60

(48) مابعد جدیدیت کے مفکرین کے خیالات کے ساتھ ان کے سوانح اس لیے بیان کر رہا ہوں تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ قول و فعل کے لحاظ سے یہ امامان وقت کیا تھے Non-Monogamous Partnership مغرب میں شادی کا ایسا تصور ہے جس میں مرد و عورت بغیر Wedlock کے میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ اور مرد جتنی عورتوں سے چاہے منہ کالا کرتا پھرے، Partner کو اعتراض نہیں ہوتا۔ اسی طرح عورت جتنے مردوں سے چاہے تذلیل کرواتی پھرے مرد اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس بات سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کس کی کوکھ میں کس کا نطفہ پل رہا ہے۔ یہ ہے مابعد جدیدیت!

(49) Foucault Michel (1980) what is An Author? Sheriden Smith, A.M. (trans) London: Tavistock.

(50) The Hutchinson Dictionary of Ideas, (1994) Helicon p.211 publishing Ltd. Oxford p.49

(51) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت ۔مضمرات وممکنات، ایضاً ص90

(52) نظام صدیقی، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، اختر مطبوعات کراچی 1999ء، ص402

(53) نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایضاً ص524

(54) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات، ایضاً، عقبی سرورق

(55) The Hutchinson Dictionary of Ideas, Ibid, p.442

(56) ندوی، سید ابوالحسن علی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ایضاً ص341

(57) حسینی، سید سعادت اللہ، مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور جلد 135، عدد 7، جولائی 2008ء، ص68، بحوالہ

Anderson, Walter Truett (1995) The Truth About Truth: De-Confusing and Re-constructing the Postmodern world, New York Penguin, pp.239-244

(58) www. Wikipedia, org/wiki/Metanarrative.

(59) Lyotard, J-F (1993), The Postmodern Condition; Ibid pp.22-25

(60) Ibid

(61) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات ایضاً ص53

(62) Harvey David (1993), The Idea of the postmodern, oxford: Blackwell p.124

(63) Ibid p.128

(64) Callinicos, Alex, Against Postmodernism: A Marxist critique Cambridge: polity press, (1991) p.289

(65) Habermas, Jurgen,(1993) Modernity versus Postmodernity, Cambridge: Polity Press, p.314

(66) www.pbs.org/faithandreason/gengloss/postm-body.html

(67) www.wikipedia.org/wiki/Metanarrative

(68) Stephens, John (1998), Retelling Stories, Framing Culture: Traditional story and Metanarratives in children's Literature ISBN o-8153-1298-9

(69) Lyotard, J-F(1993) Introduction: The Postmodern Condition: Ibid. p.21

(70) www.wikipedia.org/wiki/Metanarrative

(71) www.pbs.org/faithandreason/gengloss/postm-body.html

(72) Lyotard, J-F (1993) Ibid, p.16

(73) Hans Bertens (1995), The Idea of the Postmodern: A History, Routledge. p.124

(74) www.pbs.org/faith and reason/gengloss/postm-body.html

(75) Novak, Philip, (1996) The vision of Nietzsche, Element, Brisbane, p.74

(76) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکۂ مذہب وسائنس، الفیصل ناشران کتب لاہور، 2004ء، ص315

(77) Vaclav Havel, The Need for Transcendence in the Postmodern world, Philadelphia, July 94. Retrieved from www.wikipedia.org

(78) Josh McDowell & Bob Hostetler (1998) The New Tolerance. carol stream p.208

(79) Umberto Eco, Retrieved from www.Wikipedia.org.

(80) الروم:30

(81) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح مع فتح الباری، دارالسلام الریاض سعودی عرب، ج3، ص312

(82) شبلی نعمانی علامہ، علم الکلام اور الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی، 1967ء، ص175

(83) ابن تیمیہ، امام احمد، مقدمہ فی اصول التفسیر، مکتبہ سلفیہ لاہور، 1994ء، ص35

(84) حامد کمال الدین، فہم دین کا مصدر، مطبوعات ایقاظ لاہور، 2008ء، ص44

(85) محمد فواد عبدالباقی، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، منشورات ذوی القربی، 1423ھ، ص595

(86) البقرہ:164

(87) یوسف:105

(88) الاعراف:179

(89) مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح، نعمانی کتب خانہ لاہور، 2004ء، ج1 ص88

(90) البقرہ:231

(91) آل عمران:48

(92) عطیہ، ڈاکٹر جمال الدین، النظریة العامة للشریعة الاسلامیة (شریعت اسلامی کا عمومی تصور، مترجم: مولانا حبیب الرحمٰن) شریعہ اکیڈمی جامعہ اسلامیہ العالمیہ اسلام آباد، 2002ء، ص34

(93) غزالی، ابوحامد محمد بن محمد بن احمد، تہافۃ الفلاسفہ (تقدیم مولانا محمد حنیف ندوی) ادارہ ثقافت اسلامیہ

لاہور،1995ء،ص78

(94) اس موضوع پر امام غزالی نے جو بحث کی ہے اس کے لیے ملاحظہ فرمایئے:

www.ghazali.org/site/dissert/html

(95) ایضاً

(96) مودودی، مولانا سید ابوالاعلیٰ، دین حق، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر، نئی دہلی، 2007ء، ص22

(97) اقبال، علامہ ڈاکٹر سر محمد، ضرب کلیم در کلیاتِ اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1986ء، ص38.500

(98) آل عمران:5

(99) البقرہ:255

(100) آل عمران:159

(101) مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المکتبۃ السلفیہ لاہور، 2000ء، ص288

(102) ولی اللہ، امام علامہ الشیخ الہند احمد دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ، قدیمی کتب خانہ کراچی، س ن، ج1 ص295

(103) ندوی، علامہ سید سلیمان، سیرت النبی الفیصل ناشران کتب لاہور، 1991ء، ج4، ص84

(104) The Hutchinson Dictionary of Ideas, Ibid p.340

(105) کرشن جی مہاراج، شری مد بھگوت گیتا (مترجم اردو: خواجہ دل محمد ایم اے فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور) خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور، 1945ء، ادھیائے 10,16، اشلوک 61-18

(106) ڈریپر، ڈاکٹر جان ولیم، معرکۂ مذہب و سائنس، ایضاً، ص98,130

(107) J.R.Firth, (1945) Techniques of Semantics, London, p.86

(108) حسینی، سید سعادت اللہ، مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام، ایضاً، ص70

(109) www.wikipedia.org/wiki/Hyperreality

(110) Jean Baudrillard (1988), Simulacra and simulations; in selected writings, Mark Poster, ed. Stanford: Stanford University Press p.184

(111) Umberto Eco (1986), Travels in Hyperreality, New York, Harcourt Brace Jovanovich, p.43

(112) John Tiffin (2001), Hyperreality: paradigm for the third Millennium, New York, Routledge, p.30

(113) Ibid p.83

(114) www. wikipedia.org/wiki/Hyperreality

(115) Jean Baudrillard (1988), Simulacra and simulations; Ibid. p.168

(116) آل عمران:83

(117) الرعد:15

(118) الملک: 2-5
(119) السعدی، فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر، تفسیر السعدی، دارالسلام لاہور، 2007ء، ج3، ص806
(120) الکہف: 103-104
(121) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1991ء، ج3، ص49
(122) الفرقان: 43
(123) الجاثیہ: 23
(124) الکہف: 28
(125) القصص: 50
(126) مسلم بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، الحدیث 102 ایضاً
(127) الصنعانی، الشیخ محمد بن اسماعیل، الامیر الیمینی، سبل السلام شرح بلوغ المرام دارالمعرفہ بیروت، 2001ء، ج3، ص45
(128) ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، السنن، کتاب التجارت، الحدیث 2194، مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2005ء، ج7، ص85
(129) جانباز، الشیخ محمد علیؒ، انجاز الحاجۃ شرح سنن ابن ماجہ، المکتبۃ القدوسیہ لاہور، 2005ء، ج7، ص85
(130) محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، 1986ء، ص325
(131) ایضاً، ص331
(132) آل عمران: 185
(133) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ایضاً ج4، ص318
(134) الحدید: 20
(135) نارنگ گوپی چند، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2006ء، ص206 بحوالہ Barth, Roland, Pleasure of Text اس بے ہودہ عبارت کا ترجمہ کرنے سے میری پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ جیسا "روشن خیال" ہندو بھی کہتا ہے: اس کا لفظی ترجمہ مشکل ہے۔
(136) البقرہ: 268
(137) الدخان: 38-39
(138) آل عمران: 190-191
(139) Iqbal, Allama Muhammad, (1989) The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy Pakistan Lahore p.7
(140) یوحنا کی انجیل باب 1، آیت نمبر 1، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور۔ س ن
(141) Collins, Jim, (1989) uncommon cultures: popular culture and

postmodernism, Routledg, p.189

(142) Ibid. 191

(143) نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایضاً، ص205

(144) Klags, Mary, (2007), Literary Theory: A Guide for the perplexed. continuum press, p.432

(145) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات، ایضاً، ص132

(146) ایضاً، ص26

(147) The Hutchinson Dictionary of Ideas Ibid p.139

(148) John Dewy (1985) Hegel (ed. Michel Inwood) London oxford Press. p.187

(149) نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایضاً، ص504

(150) Encyclopaedia of Cultural Anthropology (1994) Editor David Levinson, Melvin Ember, New York, Henry Halt & Comapny, p.994

(151) نیر، ناصر عباس، مابعد جدیدیت نظری مباحث، ایضاً، ص247

(152) Shannon Weiss (2007) Postmodernism and its critics, university of Alabama press, p.432

(153) Ibid p.429

(154) www.wikipedia.org/Deconstruction

(155) Charles Upton (2001) The system of Antichrist Truth & Falshood in Postmodernism & the New Age, Sophia: Perennis p.45

بحوالہ سعادت اللہ حسینی، مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، جولائی 2008ء، ص70

(156) نیر، ناصر عباس، مابعد جدیدیت نظری مباحث، ایضاً، ص183

(157) خورشید احمد، پروفیسر، اسلامی نظریہ حیات، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی، 2006ء، ص110

(158) اقبال، علامہ محمد، خطبات (ترجمہ: نذیر نیازی) بزم اقبال لاہور، 1973ء، ص257

(159) یونس: 64

(160) فاطر: 43

(161) المائدہ: 3

(162) البقرہ: 31

(163) ابن کثیر، حافظ ابوالفدا عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2003ء، ص، ج1، ص131

(164) السعدی، فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر، ایضاً، ج1، ص100

(165) النحل: 103

(166) یوسف:103

(167) ابن کثیر، حافظ ابو الفدا عماد الدین، ایضاً، ج2، ص735

(168) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، 1980ء، ج3، ص941

(169) Edward w.Said (1983), The world, the Text, And the critic, Faber and Faber, London, p.36-37

(170) ابن ماجہ، ابو عبداللہ محمد بن یزید، السنن، المقدمہ، الحدیث 5، ایضاً، ج1، ص143

فصل اول

مابعد جدیدیت کے اثرات

الف۔ اسلامی معاشرہ کے تناظر میں

عہد حاضر کا ایک اہم عالمی مسئلہ انسان کی بے بسی، بے کسی، تنہائی اور بے قراری ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سرمایہ داری، سوشلزم، کمیونزم اور ماڈرنزم جو کہ ''لبرل ازم'' (Liberalism) کے مختلف مظاہر ہیں، انسانی معاشروں کو کیف وسرور، سکون واطمینان، لذت ومسرت مہیا کرنے کے عظیم الشان دعووں کے ساتھ آئے تھے مگر انسانیت نے سب سے زیادہ دکھ تہذیبِ نو کے انہی دعویداروں کے ہاتھوں اٹھائے۔ فطرت پرستی، انسان پرستی، نفس پرستی، قوم پرستی، وطن پرستی، مادہ پرستی، شہوت پرستی اور دنیا پرستی کے یہ علم بردار جو ''خالق کی موت'' کا اعلان کر رہے تھے اور اس کائنات میں انسان کی الوہیت اور منصبِ خدائی پر فائز ہونے کا فرمان جاری کر چکے تھے۔ ان خدا دشمن تہذیبوں کے عروج کے دور میں دنیا نے اتنی بڑی تعداد میں انسانوں کا وحشیانہ قتل عام دیکھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جدیدیت/ ماڈرنزم کے خدا بننے سے پہلے اس زمین پر مذہب اور اہل مذہب کی حکمرانی تھی (وہ حکمرانی صحیح تھی یا غلط) مگر تاریخ صاف بتاتی ہے کہ مذہبی حکمرانی کے عہد میں انسانیت نے وہ مظالم، مصائب اور دکھ کبھی نہیں دیکھے جوان جدیدیوں کے عروج کے بعد انسانیت کا مقدر ٹھہرے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اور پھر مابعد جدیدیت کے عہد میں

ویت نام، بوسنیا، عراق، فلسطین، کوسووا اور افغانستان تک، جتنے لوگ مارے گئے ان کی کل تعداد دنیا کی ساڑھے سات ہزار سال کی تاریخ میں تمام لڑی جانے والی جنگوں کے کل مقتولین سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ یعنی تقریباً صرف ساڑھے تین سو سال میں ایک ارب پچھتر کروڑ انسان جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy اس وحشیانہ جمہوری سفاک تاریخ کے خونی چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔(1) انسانوں کا قتل ایک المیہ ہے لیکن جدیدیت اور پھر مابعد جدیدیت نے انسانی فطرت، روح اور فکر صحیح، انسانی رشتوں، فطری اداروں، فطری جذبات/تعلقات کو جس طرح مسخ کیا ہے وہ عہدِ حاضر اور لمحۂ موجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

بیسویں صدی ایک طرف بے خدا فلسفوں کے درمیان کش مکش اور دوسری طرف یورپی قوموں کے درمیان تجارتی و معاشی رقابت کی بنا پر خون ریز تصادم کی صدی تھی۔ اس سے ماقبل انیسویں صدی میں ترگنیف (Turgenev 1883) نے عدمیت (Nihilism)، (زندگی ایک بے معنی اور محض وجودی چیز ہے یا One who approves of nothing) کے نظریے کو بڑے دعوے سے پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ گزشتہ دو صدیوں میں ''جواب دہی کے تصور سے بالا'' انسان کی مزعومہ سوچ کا سرچشمہ اسی فکر سے پھوٹتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے فروغ، سرمایہ دارانہ نظام معیشت اور کنزیومر کلچر کے رجحان کے نتیجے میں بظاہر معیار زندگی بڑھ رہا ہے، تنخواہیں بڑھ رہی ہیں۔ لیکن اصلاً لوگوں کی قوت خرید ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں کبوتروں کے ڈربوں جیسے گھر لاکھوں روپے میں فروخت ہو رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رہنے کا گھر انسان کی قوت خرید سے باہر ہو جائے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا کمال ہے جب مکان خریدنے کی قوت نچوڑ کر ختم کر دی گئی تو سرمایہ داری، اسلامی بنکاری کی چھتری تلے یا کریڈٹ کارڈ کے ذریعے سود پر گھروں کی خریداری کے خوبصورت منصوبے پیش کر رہی ہے۔ تاکہ لوگوں کی کمائی کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا جائے۔ مابعد جدیدیت کا عفریت، سرمایہ کاری، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ارض و سماء میں محوِ رقص ہے! زندگی مشکل سے مشکل اور مہنگی سے مہنگی اور محض خواب و خیال ہوتی جا رہی ہے۔ ضروریات زندگی پورا کرنا عام آدمی کیلئے محال ہو گیا ہے۔ مابعد جدیدیت قدیم اجتماعیتوں کو ختم کر رہی ہے۔ شہروں کی طرف بے تحاشا نقل مکانی، برادری، قبیلے، خاندان کا انہدام، رشتوں کی پامالی، بے

اطمینانی، دہشت گردی، بے حسی، بے بسی، بے کسی، پتھر دل، بنجر آنکھیں، خلاؤں میں گھورتے ہوئے زرد چہرے، مستقبل سے مایوس، حالات سے ناامید، ٹھکرائے ہوئے لوگ قدم قدم پر اپنا نوحہ پڑھنے کی صلاحیت بھی کھو چکے ہیں۔

مابعد جدید دور کا انسان کس طرح محض اپنی ہی عافیت چاہتے ہوئے خود غرضی اور بے حسی کے کمبل تلے دبک کر جی رہا ہے، اختر الایمان کی ایک نظم ''شیشے کا آدمی'' طنزیہ انداز میں اس کا نقشہ یو

اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں
ہماری عمر کا اک اور دن تمام ہوا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
زبان سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا
خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی
اسی طرح سے کٹا، منہ اندھیرے اٹھ بیٹھے
پیالی چائے کی پی، خبریں دیکھیں، ناشتہ پر
ثبوت بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے
بخیر و خوبی پلٹ آئے جیسے شام ہوئی
اور اگلے روز کا موہوم خوف دل میں لیے
ڈرے ڈرے سے ذرا بال پڑ نہ جائے کہیں
لیے دیے یونہی بستر میں جا کے لیٹ گئے! (2)

مابعد جدید معاشروں (بشمول تیسری دنیا اور مسلم معاشروں کے) کی حالت بھی عجیب سے عجیب اور المناک ترین ہوتی جا رہی ہے۔ احساسات و جذبات کچلے جا رہے ہیں۔ مشینیں اور آلات، مروت و محبت اور وضعداری کو دھوئیں کے مرغولوں میں تحلیل کر رہے ہیں۔ تعیّشات کے حصول کی دوڑ نے لوگوں کی تحویل سے رہے سہے اثاثے بھی نکال لیے ہیں۔ معیار زندگی کا خمار صدیوں/نسلوں کی بچتوں کو نگل رہا ہے۔ زندگی بیمار کی رات ہوگئی ہے جسے کاٹنا مشکل اور بسر کرنا اس سے بھی مشکل ہو گیا ہے۔ سادگی ہر جگہ سے رخصت ہوگئی ہے۔ نہ وفا ہے نہ محبت ۔۔۔ ہر ایک

کمار ہا ہے، کمانا ہی مقصودِ زندگی ہے۔ رشتے ٹوٹ رہے ہیں، ٹیکنالوجی کے ڈھالے ہوئے آلات ماں باپ اور دیگر رشتوں کا متبادل (نعم البدل نہیں) بن گئے ہیں۔ میل جول اور ملاقاتیں مہنگائی نے ناممکن بنادی ہیں۔ سواری اور مکان کے بغیر شہروں میں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ جھونپڑیاں بھی لاکھوں روپے میں بک رہی ہیں۔ فرصت عنقا ہے، مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ فرد خود اپنے آپ سے عدم ملاقات کا شاکی ہے۔ نہ توبہ کی فرصت نہ گناہگار زندگی بسر کرنے پر خلش۔ سرمایہ دارانہ نظام رزق کے وسیلے کم کر رہا ہے لیکن خواہشات وجذبات بھڑکانے اور بڑھانے کے ایسے ایسے طریقے، وسیلے، سلیقے اور قرینے ایجاد کر رہا ہے کہ عقل دنگ ہے۔ آج کے دور کا میڈیا دجال سے بڑھ کر powerful ہے۔ لوگ اشتہارات کی چکا چوند کو اصل زندگی سمجھ کر اس میں گم ہیں۔ بچوں کی معصومیت، میڈیا نے چھین لی ہے۔ اب وہ اسی طرح باتیں کرتے ہیں جس طرح بڑی عمر کے لوگ محو کلام ہوتے ہیں۔ غنڈے موالی کی زبان شرفا کے بچوں نے اپنالی ہے۔ شرفا کی بچیوں کو بھی Red Light Area کلچر سے واقفیت ہے۔ معصومیت اور سادگی کا یہ قتل کتنی پرکاری، عیاری اور شاطری سے کیا گیا ہے اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ لوگ ہنس ہنس کر دوسروں کو بتاتے ہیں کہ ہمارا بچہ اتنی سی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں کرتا ہے، انگور بننے سے پہلے منقا بننے کی کوشش تہذیب کیلئے خودکشی کے سوا کیا ہے؟ تصنع اور مطالبات کی فہرست نے نکاح کو مشکل اور سفاح (زنا) کو آسان بنادیا ہے۔ یہ وطن، یہ گھر، یہ معاشرہ، یہ تہذیب (تہذیب اسلامی) خطرے میں ہے۔ کہاں ہیں ثنا خوانِ تقدیس مشرق؟ بچے کو نوکری سے آنے والی ماں کا انتظار ہے، ماں کو آوارہ گردی سے لوٹنے والے بیٹے کا انتظار ہے۔ لڑکیوں کو موبائل فون پر بے ہودہ Sms اور لیٹ نائٹ فری ٹاک شاک کا انتظار ہے۔ بکواس کرنا ثقافت ہے، دین جس کا پیغام تھا کہ ''جو چپ رہا وہ نجات پا گیا''۔ وہاں صبح وشام خرافات سنی اور کہی جارہی ہے۔

مابعد جدیدیت کا سب سے خطرناک رخ خود فراموشی کے ساتھ ساتھ خدافراموشی بھی ہے۔ مسلمان معاشروں میں یہ صورتحال اس لیے بھی خطرناک ہے کہ دین اسلام کیلئے چیلنج کبھی بھی کوئی انسانی نظریہ نہیں بن سکا، کوئی دریافت، مشاہدہ، اصول، قانون دین اسلام کی حقانیت کو باطل ثابت نہیں کرسکا۔ لیکن اب صورتحال تشویشناک اس لیے ہے کہ اللہ رب العزت کا نام اور مالک الملک کا وجود ایک رسمی معاملہ بنادیا گیا ہے۔ مادیت پرستی نے نفس کو الٰہ بنادیا ہے۔ معرفت الٰہی خواب

دخیال ہوگئی ہے۔ دین دار لوگ بھی عموماً، اوران گھرانوں کی نئی نسل خصوصاً اس تیزی سے مادیت کے سیلاب میں بہہ رہے ہیں کہ انہیں اس کا شعور بھی نہیں رہا کہ وہ کیا کرر ہے ہیں! کہاں جارہے ہیں! چند عبادات کے سوا مذہب کی روح ہماری زندگی سے خارج ہو رہی ہے۔ "اس میں کیا حرج ہے!" ایسا نکتہ ہے جس نے مادیت کے تمام رنگوں کی اسلام کاری کردی ہے۔ نفس کی پرستش اس دین کے نام پر ہورہی ہے جو ضبط نفس کیلئے نازل کیا گیا تھا اور جس نے اعلان کیا تھا کہ:

"وماخلقت الجن والانس الالیعبدون"(3) انسانوں وجنوں کی پیدائش کا مقصد صرف اور صرف عبادت رب ہے۔ عہد حاضر نے نفس کے رب کو تلاش کرلیا ہے اور اس کی ایسی مخلصانہ عبادت کی جارہی ہے کہ شیطان کو بھی رشک آرہا ہے۔ عارضی زندگی کے ایک ایک لمحے کی مکمل تیاری کی جارہی ہے لیکن وہ زندگی جو دائم ہے۔۔۔ جو طویل ہے۔۔۔ بلکہ طویل تر ہے اس کیلئے کوئی تیاری نہیں ہے۔ موت سے متعلق رسومات اور تقریبات بھی دنیا پرستی کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ تعزیتی جلسے بھی مادہ پرستی کا اظہار بن گئے ہیں۔ زندگی سے محبت نے موت کی حقیقت کو بھلادیا ہے۔ "جب مریں گے تب دیکھا جائے گا ابھی بہت وقت ہے"۔ علما کا کردار معاشرے میں محدود سے محدود تر ہورہا ہے۔ گفتگو کے موضوعات تک بدل گئے ہیں۔ وہ ہاتھ جو کبھی انگلی کی پوروں پر تسبیح کیا کرتے تھے، ان ہاتھوں میں اب موبائل فون کی مالا آگئی ہے جن پر فسق وفجور کا رقص جاری ہے۔ مسجدیں تک موسیقی کے لہو ولعب سے گونج رہی ہیں۔ دنیا اس قدر غالب، فائق اور راجح ہے کہ لوگ امام مسجد کی بار بار یاددہانی کے باوجود موبائل فون بند کرنا بھول جاتے ہیں۔ حرم مکہ ومدینہ میں بھی موبائل فون کی آوازیں دنیا کے قوی تر وجود کا احساس دلارہی ہیں۔ اندھیرا ہے کہ بڑھتا جارہا ہے۔

میڈیا پر اقدار، روایات، شعائر اسلام، ذات پیغمبر، مالک الملک ہر ایک کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ فسق وفجور کی کھلی دعوت دی جارہی ہے۔ وہ کھیل جو مغرب میں مذہب کے خلاف تین سو سال پہلے کھیلا گیا تھا اسی آہنگ سے اب شب وروز ٹی وی چینلز پر کھیلا جارہا ہے۔ حدیث، سنت، ذاتِ رسالت مآب ﷺ اسلامی تاریخ، تہذیب سب کچھ تنقید کی زد پر ہے۔ ٹی وی پر مکالمے ہورہے ہیں کہ شراب پی جائے یا نہ پی جائے۔ اگر Controlled Level پر پی جائے تو کیا حرج ہے؟ لواطت میں کیا حرج ہے؟ ہیجڑا بن جانے میں مذہب کیوں رکاوٹ بنتا ہے؟ عمل قوم لوط ایک فطری ذوق ہے اس میں کیا مضائقہ ہے؟ رنڈیاں اور کسبیاں اسلام کی تشریح وتعبیر پیش کررہی ہیں۔ جاوید

غامدی جیسے استعماری کارندے ''سرکاری شیخ الاسلام'' اور میڈیا کے منظور نظر ہیں۔ حد تو یہ کہ Gay Poetry کے نمونے اردو میں بھی نمودار ہونے لگے ہیں۔ قاضی افضال حسین تبصرہ کرتا ہے:

''افتخار نسیم اردو میں Gay شاعری کی تنہا واضح آواز ہے۔ افتخار نسیم اپنی جنسی شناخت کیلئے کوئی خود ساختہ جواز پیش نہیں کرتے۔ بس وہ جیسے ہیں، وہی ان کی جبلت ہے، جسے بیان کرنا ان کیلئے اپنی شناخت کو دریافت کرنا ہے۔ انہیں اپنے اظہار کیلئے زبان کی ضرورت ہے جو یا تو تذکیر و تانیث کی ثنویت سے آزاد ہو یا جس میں متن، نفی سے اثبات برآمد کر سکتا ہو:

مجھ کو علم ہے
میں تم سے کتنا الگ ہوں
مجھے آدھا کاٹ دو گے تو پھر بھی
ایک مکمل خالق ہوں
تذکیر و تانیث کے جھگڑے سے میں جدا ہوں
میں اس دور کا انسان ہوں
میں نرمان ہوں'' (4)

ٹی وی کے پروگراموں میں شریک علما کو کسی مذہبی پروگرام کیلئے ایک دھیلا نہیں دیا جاتا۔ (اس بات کے گواہ میرے محترم استاد ڈاکٹر رانا صاحب بھی ہیں جو ''وسیب ٹی وی (WASEEB)'' کے مذہبی پروگراموں میں بلا معاوضہ شرکت کرتے رہے ہیں۔) لیکن فسق و فجور کے تمام پروگراموں میں شریک اداکاراؤں کو ایک ایک پروگرام کا معاوضہ ہزاروں روپے دیا جاتا ہے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کے ساتھ یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ ریڈیو پاکستان نے انہیں مذہبی پروگرام میں شرکت کیلئے مدعو کیا اور گھر پر سواری بھیجی۔ گاڑی میں کچھ گلوکار پہلے سے ہی سوار تھے اور آلات موسیقی وغیرہ بھی رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں مولانا کو صحبت ناجنس کا ہم سفر بنا دیا گیا۔ مولانا موصوف نے یہ صورت حال دیکھی تو لاحول پڑھتے ہوئے اتر گئے اور کہا کہ میں آلات غنا کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا۔ (5) ٹی وی پر دین کو بحث و مباحثے کے ذریعے بازیچۂ اطفال بنا دیا گیا ہے۔ سب اپنا اپنا تحفظ کر رہے ہیں۔ اقدار، روایات اور دین کے تحفظ کیلئے کوئی نہیں اٹھ رہا۔ ہر طرف

عبدالمطلب نظر آرہے ہیں جو کعبہ پر حملہ آور مابعد جدیدیوں سے یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے اونٹ ہمیں واپس کردو اپنے کعبے کی حفاظت خدا خود کرے گا!

ب۔ مابعد جدیدیت کے اثرات عالمی تناظر میں

جیسا کہ ہم اس پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں کہ مابعد جدیدیت ایک فکری تحریک اور دقیق فلسفیانہ بحث ہے۔ اس کے پیش رو، جدیدیت کے افکار بھی ایسے ہی دقیق فلسفے تھے۔ عام لوگوں کو ان گہرے فلسفوں سے سروکار نہیں ہوتا، لیکن عملی زندگی میں ان کے گہرے اثرات قبول کرتے ہیں۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی سب لوگ والٹیر، روسو، ڈیکارٹ، گوئٹے، ہیگل وغیرہ کی دقیق کتابیں نہیں پڑھتے تھے، لیکن آزادی، مساوات، جمہوریت، اپنے حقوق کا احساس، مساوات مردوزن، روایات کے خلاف بغاوت اور عقل پر اصرار جیسی چیزیں عام آدمی کے رویوں کا بھی حصہ تھیں۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے عہد میں بھی عام لوگ چاہے مابعد جدیدیت کی اصطلاحات اور بحثوں سے واقف نہ ہوں، لیکن محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اپنی عملی زندگی اور رویوں میں اس کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔

مابعد جدیدیت کا سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی سے لوگوں کی دلچسپی نہایت کم ہوگئی ہے۔ جدیدیت کے دور میں لوگوں کے مخصوص افکار و نظریات تھے۔ وہ ان کی تبلیغ و اشاعت کیلئے کوشاں تھے۔ لیکن مابعد جدید دور کے انسان کے نہ کوئی نظریات ہیں، نہ عقائد کہ جن سے وہ وفاداری نبھائے۔ آج کے دور کا انسان مابعد الطبعیات پر بحث کرنے کو اپنے وقت کا ضیاع سمجھتا ہے اور حیات بعد الموت پر بات کرنے والوں کو احمق گردانتا ہے۔ یعنی جو کچھ موجود، سامنے، ظاہر و باہر ہے یہی حقیقت ہے باقی سب وہم و گمان۔۔۔ یا اگر ہے بھی۔۔۔! تو ہمیں کیا۔ اس لیے اس عہد کو "عدم نظریہ کا عہد" (Age of no Ideology) اور مابعد جدیدیت کو اس کے علمبردار Antitheory قرار دیتے ہیں۔

اصول، افکار، نظریات، عقائد کے مبسوط اور مربوط نظام (Doctrine) کے بالمقابل مابعد جدید انسان کے پاس صرف جذبات، احساسات، خواہشات، شہوات کا لامتناہی سلسلہ ہے یا عملی مسائل (pragmatic Issues)۔ مابعد جدیدیت کا کہنا ہے کہ زندگی کی تمام بحثیں "مسئلہ

اور حل'' (Problem and Solution) تک محدود کی جاسکتی ہیں۔اس لیے اصولوں اور نظریوں کی بجائے ایک ایک مسئلے کو الگ الگ لیا جانا چاہیے اور اس کے حل پر بات ہونی چاہیے۔ چنانچہ مابعد جدید دور کے انسان کی بحث و گفتگو کا سارا زور یا تو روزمرہ کے عملی مسائل پر ہے یا روابط وتعلقات کی جذباتیت پر۔

مختلف اور باہم متضاد عقائد و خیالات میں سے ہر ایک کو بیک وقت درست خیال کرنا، مابعد جدیدیت کا خاصہ ہے کیونکہ مابعد جدیدیت کے نزدیک ہر سچائی اضافی اور مقامی طور پر درست ہوتی ہے اور آفاقیت کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔اس لیے مابعد جدید دور کے انسان کو عقائد و خیالات کی تنقیح اور تحقیق کے بعد درست فیصلے تک پہنچنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مذہبی معاملات میں ''وحدت ادیان'' کا نظریہ بہت قدیم ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس طرز فکر کو تقویت دی ہے۔ اب دنیا بھر میں لوگ بیک وقت سارے مذاہب کو سچ ماننے کیلئے تیار ہیں۔ ''بہائیوں'' کے مراکز کی تعداد مغربی ملکوں میں بڑھ رہی ہے۔کیونکہ وہ اپنے مرکز میں ایک ایسی عمارت تعمیر کرتے ہیں جس میں مسجد بھی، مندر بھی، گردوارہ بھی، چرچ بھی اور سیناگاگ بھی ہوتا ہے۔ اور ان تمام معبدوں کی سیر کرنا مابعد جدید انسان کا مشغلہ ہے۔ اسی لیے آئے دن مکالمہ بین المذاہب کے جلسے اقوام متحدہ اور دیگر اداروں کے زیر اثر برپا ہوتے رہتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے افکار کے زیر اثر الحاد و مذہب بے زاری کی شدت بھی ختم ہو رہی ہے۔ چونکہ الحاد بھی ایک ''دین'' یا ایک ''دعویٰ'' ہے،اس لیے مابعد جدید انسان اسے بھی ایک نظام/مذہب کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں۔اس لیے ہمارے عہد کو لادینیت کے خاتمے کا عہد (Age of Desecularisation) بھی کہا جاتا ہے۔ایک شخص خدا پر یقین نہ رکھتے ہوئے بھی روحانی سکون کی تلاش میں کسی مذہبی پیشوا کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔۔۔اور آج اسے کسی ہندو بابا کے ہاں سکون ملتا ہے۔۔۔تو کل کوئی عیسائی راہب اسے مطمئن کرسکتا ہے۔۔۔۔ پرسوں وہ کسی درگاہ پر سرنیاز جھکائے کھڑا نظر آئے گا۔یہ مابعد جدیدیت ہے۔

قدروں کی اضافیت کے نظریے۔نے سماجی اداروں اور انضباطی عوامل (Regulating Factors) کو بری طرح متاثر کیا ہے۔خاندانی نظام اور شادی بیاہ کے بندھنوں کا انکار ہے نہ

اقرار۔ عفت، ازدواجی وفاداری اور شادی کے بندھن مابعد جدیدیت میں ''عظیم بیانات'' (Metanarratives) قرار دیے گئے ہیں۔اسی طرح جنسوں کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ رول (Role) کو بھی وہ آفاقی نہیں مانتے۔نہ صرف مرد عورت کے درمیان تقسیم کار کے روایتی فارمولوں کے وہ منکر ہیں، بلکہ جنسی زندگی میں بھی مرد اور عورت کے جوڑے کو ضروری نہیں سمجھتے۔شادی مرد اور عورت کے درمیان تو ہو ہی سکتی ہے،اس کے علاوہ مرد مرد اور عورت عورت کے درمیان بھی، کوئی چاہے تو اپنے آپ سے بھی کر سکتا ہے۔مرد اور عورت شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنا چاہیں تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ایک ساتھ بھی نہیں رہنا ہے تو صرف تکمیل خواہش کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب ذاتی پسند اور ذوق کی بات ہے۔ذیشان الحسن عثمانی امریکہ کی صورت حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''امریکہ میں Sex کی تعریف بالکل بھوک جیسی ہے۔جہاں چاہا، جب چاہا، جیسے چاہا (سر عام یا بند ھے چھپے)، جس کے ساتھ چاہا (جنس کی بھی کوئی قید نہیں) سیر ہوئے اور چلتے بنے۔دو دن بعد یاد بھی نہیں کہ کس کے ساتھ......''(6)

مغربی ممالک میں بسنے والی مسلم اقلیتوں پر بھی مابعد جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔اسی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جانوروں میں سؤر (خنزیر) ہم جنس پرست ہوتا ہے، سؤر ہی یہ لوگ شوق سے کھاتے ہیں اور اس جیسے ہی ہوتے جا رہے ہیں۔میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کرتوت امریکن یا انگریزوں کے ہیں، کوئی مسلمان تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، مگر سان فرانسسکو، کیلی فورنیا جا کر پتہ چلا کر وہاں ہر سال Muslim Gays and Lesbian Conference ہوتی ہے۔ایسی ہی کانفرنسیں نیویارک، اور لینڈ و اور سان ڈیاگو میں بھی ہوتی ہیں۔ایک کانفرنس کے روح رواں (Chair) تو لاہور کے ایک 26 سالہ نوجوان ہیں جنہوں نے پاکستان چھوڑا ہی اس وجہ سے کہ وہاں ''ان کی کوئی نہیں سنتا۔''
>
> کیلی فورنیا میں ہر سال عریاں واک (Nude Walk) بھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ Clothing optional کے نام سے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔اس میں مرد و خواتین کپڑوں کے بغیر بھاگ کر ''آزاد امریکہ'' کا پرچار کرتے ہیں۔
>
> انسانی حقوق کے نام پر کینیڈین مسلم ایسوسی ایشن کا بیان جاری ہوا کہ کینیڈا کے مسلمان

Gays اور Lesbians کے ساتھ ہی اور ان کے تعلق کو قبول کرتے ہیں، ہر شخص کو پوری آزادی ہونی چاہیے وغیرہ۔ پھر کینیڈا سے ہی ایک نام نہاد مسلمان خاتون صحافی ''ارشاد مانجی'' نے کتاب لکھ ڈالی Troubles with Islam وہ علی الاعلان Lesbian ہے اور مڈل ایسٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ ''مڈل ایسٹ گیز اینڈ لیزبین سوسائٹی'' نے تو ان کی مشکلات اور زندگی پر "I exist" کے نام سے پوری ڈاکومنٹری فلم ہی بنا ڈالی۔

ایک امریکی وکیل نے بتایا کہ Gay اور Lesbian کے رشتے کو منظور اس لیے کرایا جاتا ہے کہ اس طرح یہ لوگ اپنے پارٹنر کی انشورنس، وراثت وغیرہ کلیم کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی بھی امریکی شہری کسی کو بھی دوسرے ملک سے Gay یا Lesbian پارٹنر بنا کر بلا سکتا ہے اور اس کیلئے شہریت/گرین کارڈ کا دعویٰ (Claim) کر سکتا ہے۔'' (7)

اسی طرح مابعد جدیدیت میں فیشن، لباس، طرز زندگی ہر معاملے میں کوئی بھی ضابطہ بندی گوارا نہیں ہے۔ مرد بال بڑھا سکتا ہے، چوٹی رکھ سکتا ہے، کانوں میں بالی پہن سکتا ہے، اسکرٹ پہن سکتا ہے، زنانہ نام رکھ سکتا ہے، کسی بھی رنگ اور ڈیزائن کا لباس پہن سکتا ہے۔ سوسائٹی کو کسی بھی رویے کو ناپسند کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مادر زاد برہنہ (Nude) رہنا چاہے تو سوسائٹی اس پر بھی معترض نہیں ہوسکتی۔ آدمی اگر موسم اور ضرورت کی مناسبت سے کوئی لباس پسند کرنا چاہے تو کرے اور اگر نہ پہننا چاہے تو انسانی کھال بہترین لباس ہے! وہ عریانیت کی تبلیغ کرتے ہیں (اوپر حوالہ گزرا)، Nude Races عام ہوتی ہے۔ انٹرنیٹ پر بھی اس طرز زندگی کے فروغ کیلئے ویب سائٹس، ہیلپ لائنیں، فیس بکس (Facebooks)، ڈسکشن فورم اور نہ جانے کیا کیا موجود ہے۔

زندگی کی دوڑ، تعیشات کے حصول، سماجی اداروں کی شکست و ریخت، خود غرضی اور شہوت رانی نے مابعد جدید انسان کو جذباتی سہاروں، ہمدردیوں، محبتوں، وفاؤں اور خلوص سے محروم کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مابعد جدید انسان اپنے نجی معاملات شیئر کرنے کی بھی فیس ادا کرتا ہے۔ آپ مغربی ممالک کیا، مشرقی ترقی یافتہ ممالک اور بڑے شہروں میں جب سڑک پر چل رہے ہوتے ہیں تو اندر سے تنہا اور Isolated ہونے کے باوجود باہر سے دیواروں سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ اشتہارات، وال چاکنگ، ہورڈنگز اور نیون سائنز آپ کو عجیب و غریب پیغامات اور ترغیبات

دے رہے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مابعد جدید انسان کی تنہائی کم ہونے میں نہیں آتی۔ مغربی میڈیا میں اس طرح کے اشتہارات عام نظر آتے ہیں:

"1) Black Executive, 30, seek, periodic liason with affectionate woman who's capable of involvement without marriage, race and age interesting, NYR, Box 3022.

2) Need someone to talk things over with? I'll keep your mail box filled with interesting personal letters, will offer suggestions to your problems, give encouragement and self-help information send 1000 cash to Mrs. J. Belt....."(8)

اشتہار بازی کی وبا نے مغرب کی ترقی یافتہ، مابعد جدید تہذیب میں جو اندوہناک شکل اختیار کی ہے اس کا کچھ اندازہ وہاں سے شائع ہونے والے درج بالا اشتہارات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی اب ذاتی معاملات میں مشورہ دینے کیلئے یا ذاتی خطوط لکھنے کیلئے بھی ذاتی تعلق کی کوئی شرط نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان اب فرد نہیں، صرف ایک تصور ہے یا علامت (Sign) اور ذاتی اظہار وافکار کیلئے بھی اب ذاتی تجربہ ضروری نہیں رہ گیا۔

مابعد جدیدیت کی تحریک نے سوسائٹی میں ہر جگہ مقتدرہ افسر شاہی اور ضابطوں اور اصولوں کی سخت گیری کو چیلنج کیا۔ نظامِ مراتب (Hierarchy) کے مقابلے میں انارکی، بندشوں کے مقابلے میں آزادی، اختیارات کی مرکزیت (Centralisation) کے مقابلہ میں غیر مرکزیت (Decentralisation) اور ضابطے اور اصول کے مقابلے میں انفرادیت پسندی اور آزادی کا احترام وغیرہ کے تصورات کو اپنایا۔ اس صورت حال نے منظم ہمہ گیر تحریکوں کے مقابلے میں ایشوز (Issues) پر مبنی وقتی اور موضوعاتی تحریکیں، سخت گیر بیوروکریٹک انتظام کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی قیادت وغیرہ کی کیفیتیں پیدا کیں۔ عالمگیریت کے بجائے مقامیت اور مقامی مطالعات کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کے میدان میں علاقائی زبانوں اور علاقائی ثقافتوں کے علم بردار اخبارات، ٹی وی سٹیشن اور ریڈیوز وغیرہ دھڑا دھڑ قائم ہو رہے ہیں اور انہیں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی

بھرپور حمایت حاصل ہے۔ اسی طرح یونیورسٹیوں میں ایریا سٹڈی سنٹرز قائم ہوئے اور اسلام کا مطالعہ بطور آفاقی مذہب کی بجائے مڈل ایسٹ اینڈ عرب سٹڈیز، ساؤتھ ایسٹ سٹڈیز اور فار ایسٹ سٹڈیز وغیرہ کے مختلف ناموں سے کیا جاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کا وہاں کی علاقائی رسوم و رواج کے تناظر میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔

عملی زندگی کے مختلف معاملات میں مابعد جدیدی ہر طرح کی روایت، اصول اور ضوابط کی عالمگیری کے خلاف ہیں اور ذاتی انفرادی پسند و ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ طرز ہائے زندگی سے متعلق معاملات میں ذاتی پسند افراد کی ہوتی ہے۔ اس کو منضبط کرنے کا معاشرے کو کوئی حق نہیں ہے اور اجتماعی معاملات میں پسند و ناپسند قبیلوں، آبادیوں، تنظیموں یا کسی بھی اجتماعی گروہ کی ہوسکتی ہے اس پر کنٹرول کرنے کا کسی عالمی یا قومی ادارے کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

یہ ہیں مابعد جدیدیت کے مختلف مظاہر اور اثرات جس سے مسلم معاشرے بھی محفوظ نہیں اور جس طرح روشن خیالی اور پھر جدیدیت کے علم برداروں نے بزور اپنے اصول و نظریات کو نافذ کرنے کی کوشش کی تھی، ویسے ہی مابعد جدیدیت کے علم بردار اپنے نظریات کو نافذ کرنے اور شائع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اس سب میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار، اکیسویں صدی کا دجال، الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا ہے جو لوگوں کے ذہنوں کو اپنے کنٹرول میں لیے ہوئے ہے۔

فصل دوم

مابعد جدیدیت اور فروغ اسلام

مابعد جدیدیت کا نظریہ اسلامی عقائد اور اسلام بطور تحریکِ دعوت و ارشاد کیلئے بیک وقت چیلنج کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور امکان کی بھی۔ تاریخ اسلام کی ابتدا سے ہی جب فتوحات کا دائرہ عجمی

اقوام وممالک تک وسیع ہوا تھا اور عباسی عہد میں جب ''بیت الحکمت'' کے تحت دنیا کی دیگر اقوام کے علوم کے تراجم ہوئے تھے، خاص طور پر یونانی علوم اور ارسطو کی منطق وفلسفہ وغیرہ تو اس وقت کے علما نے محدثین وفقہا سے قدرے ہٹ کر روش اپنائی تھی اور اسلامی فلسفہ اور علم الکلام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ابن رشدؒ، امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ وغیرہ نے اسلامی عقائد کو عقلی بنیادوں پر ثابت کیا۔

اسی طرح جدیدیت کی تحریک کے زمانے میں مفکرین اسلام نے اس کے اٹھائے ہوئے سوالات وشبہات کے مسکت جواب دیے تھے لیکن ساتھ ہی جدیدیت نے جو حالات اور رویے پیدا کیے تھے، حکمائے اسلام نے ان کا بھی لحاظ رکھا تھا۔ جدیدیت کی طرح مابعد جدیدیت نے بھی بعض سنجیدہ نظریاتی مسائل کھڑے کیے ہیں جن سے مسلم مفکرین اور علما کو فکری سطح پر نبرد آزما ہونا ہے۔ جدیدیت نے عقل کو اہمیت دینے کا مزاج بنایا تھا تو مفکرین اسلام نے عقلی طریقوں سے اسلام کی دعوت پیش کی اور اس کی حقانیت ثابت کی تھی۔ اسلامی تحریکوں کے ڈھانچے کی تشکیل میں بھی جائز حدود میں جدید طریقوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح مابعد جدیدیت کے بارے میں بھی حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں قرآن کی رہنمائی بالکل واضح اور صاف ہے:

''ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمت والموعظة الحسنة وجٰدلهم بالتی هی احسن انّ ربک هو اعلم بمن ضلّ عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین.''(9)

(اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے، یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے۔)

اس آیت میں دعوتِ دین پیش کرنے کے متعلق تین ہدایات دی گئی ہیں۔ پہلی ہدایت ''حکمت'' ہے۔ حکمت؛ علوم اسلامیہ کی نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے، جس کی مکمل تشریح کرنا شاید میرے لیے ممکن نہیں۔ لیکن اتنا واضح ہے کہ حکمت سے مراد، ماحول، حالات، رفتارِ زمانہ، تاریخی ارتقا، علوم انسانی کی ترقی وغیرہ کو سمجھنا اور پھر مخاطب کی نفسیات، عقلی استعداد، طلب، شوق، مزاج اور ذہنیت وغیرہ کو مدنظر رکھنا یہ سب باتیں حکمت میں سموئی ہوئی ہیں۔ دوسری ہدایت ''عمدہ نصیحت'' ہے۔ اس سے مراد ہے کہ جو بات آپ کہیں دلنشین انداز اور زمانے کے مروّجہ اسلوب کے مطابق ہو۔ مثلاً سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے اس زمانے میں ہم اگر لوگوں کو خدا کی قدرت سمجھانا

چاہئیں اور مخاطب کو توجہ دلائیں کہ مچھلیاں کیچڑ سے بنتی ہیں اور بچھو گوبر سے اور پتنگے ہوا سے جنم لیتے ہیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری بات میں کتنا وزن ہوگا۔ یعنی داعی کو مروجہ سماجی و سائنسی علوم سے آگاہی ہونا از حد ضروری ہے۔ تیسری ہدایت یہ ہے کہ اگر آپس میں دلائل سے بات کرنے کی نوبت آجائے تو اس کی بات غور سے سنیں اور اپنی دلیل بھی شائستہ انداز میں دیں اور اس کا مقصد افہام وتفہیم ہو۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو تین ہدایات؛ حکمت، موعظۃ الحسنہ اور جدال بالاحسن فرمائی ہیں تو یہ سب الگ الگ تین قسم کے لوگوں کیلئے ہیں۔ یعنی مخالفین میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں؛ ایک تو اہل عقل وخرد جو صرف معقول دلائل سے ہی قائل ہو سکتے ہیں، دوسرے وہ جو زیادہ ذہین تو نہیں ہوتے مگر عقل سلیم رکھتے ہیں اور ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہوتے، تیسرے وہ جو ہٹ دھرم اور کج بحث ہوتے ہیں۔

درج بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے ہمیں رہنمائی مہیا کی ہے کہ زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ اسلامی Framework کے اندر رہتے ہوئے داعی اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کر سکتا ہے اور یہ بات دعوت کے مؤثر ہونے کیلئے ضروری بھی ہے۔ لہٰذا مابعد جدیدیت کے بارے میں بھی یہی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ان فکری چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے جو مابعد جدیدیت نے پیش کیے ہیں اور دوسری طرف اسلام کی دعوت اس کے مباحث اور طریق کار میں ان کیفیتوں، مزاجوں اور رویوں کا لحاظ رکھنا ہے جو مابعد جدیدیت نے پیدا کیے ہیں۔

اس پس منظر میں مفکرین اسلام اور غلبۂ اسلام کیلئے کام کرنے والی تحریکیں اور تنظیمیں بہتر لائحہ عمل اپنا سکتے ہیں۔ اسلامی علوم کے ایک مبتدی کی حیثیت سے چند سفارشات پیش خدمت ہیں جو حرفِ آخر نہیں ہیں:

۱۔ مابعد جدید ذہن کی ایک خصوصیت ''شعور تقدس'' کا خاتمہ ہے۔ عملی طور پر مابعد جدید انسان کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ: وہ ایک ایسا شخص (مرد/عورت) ہے جو اس احساس سے عاری ہے اور اس کے خیالات نمایاں طور پر تقدس کے شعور کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری طرف دیکھئے تو اسلامی روایت تقدیس کی خوشبو سے معمور ہے اور الوہی نظام کی جگہ کسی دنیوی نظام یا تحریک کی قائل ہی نہیں۔ دنیا پرستی کو جائز حیثیت دے کر اسلام اس کے

ساتھ کوئی مکالمہ کر بھی نہیں سکتا۔ اس لیے مابعد جدیدیت سے اسلام کا مقابلہ محض غصے کے اظہار یا اپنی پارسائی جتا کر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض اس وقت ہو سکتا ہے جب مابعد جدیدیت کو مکمل طور پر اس کی جڑوں اور شاخوں سمیت سمجھ لیا جائے اور پھر پوری اسلامی روایت کو مابعد جدیدیت کے چیلنجز کے حل کیلئے بروئے کار لایا جائے۔ جو عہد حاضر نے اسلام کے لیے کھڑے کر دیے ہیں۔ اس کام میں مرکزی حیثیت اس عقل سلیم اور حکمت کی ہے جو اسلامی وحی کے قلب میں جاگزیں ہے۔

2۔ آخرت سے متعلق اسلامی عقائد اور مابعد جدیدیت کے تصورات کے درمیان ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسا خلا جس نے ان مسلمانوں کی روحوں اور ذہنوں میں ایک زبردست کشمکش پیدا کر دی ہے جو اسلامی تہذیب اور مغربی تصورات کے درمیان معلق ہیں۔ ترقی کے معنی ایسے اعمال کے ہیں جو کسی خاص مقصد کیلئے ہوں۔ اسلام میں ہر انسانی عمل کیلئے ضروری ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے مطابق ہو، جو شریعت کے قوانین میں مضمر ہے۔ ظاہر ہے ترقی کا وہ پہلو جو مابعد جدیدیت کے ہاں مقبول ہے یعنی لامحدود ترقی کے مقاصد کے ساتھ جس سے انسان محض زمینی مخلوق اور اقتصادی حیوان ہونے کی حیثیت سے وابستہ ہے، اسلام کے ہاں مقبول نہیں۔ **آج کا انسان فطرت کو فعل اللہ سمجھ کر اس پر غور و خوض کرنے اور اس سے ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا قائل نہیں بلکہ اس کی نظر میں یہ ذخیرۂ وسائل ہے جو تیزی سے لوٹے جانے اور فائدہ اٹھانے کیلئے ہے۔** بے شک دنیا میں آج انہی نظریات کا غلبہ ہے۔ لیکن ابھی اسلامی اقدار منہدم نہیں ہوئیں۔ یہ درحقیقت اتنی مضبوطی سے قائم ہیں کہ بہت سے معاشرتی دائروں میں روبہ ترقی ہیں اور مسلمان ملکوں میں یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے کہ اسلامی معاشرے دو انتہاؤں (Extremes) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسلامی روایات سے بغاوت کرنے والے بھی موجود ہیں اور اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی دنیا میں اب یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ خود ترقی کے عمل کو اسلامی اقدار کی روشنی میں از سر نو متعین کیا جائے۔ اسلامی تشخص کو اجاگر کیا جائے۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے داعیوں اور مفکرین کو معذرت خواہانہ رویہ ترک کرنا چاہیے اور معتدل انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنا چاہیے۔

3۔ اسلام کو بطور تحریکِ دعوت، آج بھی جدیدیت کی فلاسفی کا چیلنج درپیش ہے۔ مابعد جدیدیت

کی طاقتور تحریک کے باوجود ابھی تک عقلیت کا فریب پوری طرح بے نقاب نہیں ہو پایا ہے۔ سیاسی سطح پر عالمی سامراجی طاقتیں جو اسلامی حکومتوں کی حریف ہیں وہ آج بھی جدیدیت ہی کی مظہر ہیں۔ اسلامی دنیا میں اسلامی تحریکوں کو کچلنے والے تمام حکمران جدیدیت ہی کے منصوبے کے علم بردار ہیں۔ اس تناظر میں مابعد جدیدیت کے مفکرین ہمارے کس حد تک حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مابعد جدیدی مفکرین مغرب اور مغربی تہذیب کی شان و شوکت، سرمایہ دارانہ معیشت کی چکاچوند اور مغربی افکار اور عقلیت کے سحر کو توڑنے میں ہمارے معاون بن سکتے ہیں۔ دعوتِ اسلام پیش کرنے والوں کو بڑا چیلنج ان قوتوں سے درپیش ہے، جو اسلامی تعلیمات کو رجعت پسند قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں جمہوریت، مرد و زن کی مساوات وغیرہ کے مغربی تصورات کو اسلامی معاشروں کیلئے راہِ نجات قرار دیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے مفکرین بڑے زور و شور سے ان ''عظیم بیانات'' (Metanarratives) کی ردِ تشکیل (Deconstruction) میں مصروف ہیں، لہٰذا اس معاملے میں ہمیں ان کے افکار سے کسی حد تک معاونت مل سکتی ہے۔ مابعد جدید مفکرین نے جدید مغرب کے ''عظیم بیانات'' پر جو سوالات کھڑے کیے ہیں ہمیں ان کا مؤثر استعمال کرنا چاہیے۔

4۔ مابعد جدید مفکرین اگرچہ مذہبی روایات کو تقدیس کا درجہ دینے اور مذہب کو آفاقی سچائی کا مقام دینے کیلئے تیار نہیں، لیکن اگر کوئی شخص روحانی سکون کیلئے کوئی مذہب اختیار کرتا ہے یا کوئی معاشرہ اپنے لیے مذہبی قانون پسند کرتا ہے تو مابعد جدید مفکرین کے نزدیک یہ رویہ/طرزِ عمل قابلِ اعتراض نہیں۔ یہ صورتِ حال بھی اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کیلئے معاون و سازگار ثابت ہو سکتی ہے۔

5۔ آسائشاتِ زندگی کی دوڑ اور دولت کے حصول کی لگن؛ کی وجہ سے دنیا میں وسیع پیمانے پر ہجرت کا عمل جاری ہے۔ ملکوں کے اندر دیہاتوں سے شہروں کی طرف اور غریب ملکوں سے امیر ملکوں کی طرف وسیع پیمانے پر نقل مکانی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے دنیا بھر میں تکثیری معاشرے (Pluralistic societies) وجود میں آ رہے ہیں۔ ان معاشروں میں اہلِ اسلام کیلئے ایک بڑا مسئلہ اپنی اسلامی شناخت اور تشخص کے تحفظ کا ہے۔ مابعد جدیدیت یہاں بھی ہمیں Protection مہیا کرتی ہے۔ مثلاً یکساں Civil Code کا تصور جدیدیت کا Concept ہے۔ جبکہ مابعد جدید مفکرین کے نقطۂ نظر سے ایک ہی ملک میں

اپنی اپنی پسند کے علیحدہ علیحدہ قوانین کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ یہ تکثیریت قابل تحسین ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مسلم مفکرین، مابعد جدیدیت کے علم برداروں کو دوسری مذہبی اقلیتوں کیلئے اسلامی تعلیمات کے حق میں استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ مابعد جدیدیت کے مطابق ہر مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی قوانین کے مطابق اپنے معاملات چلانے کا حق ہے۔ لہٰذا جب خالص اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر مسلم معاشرتی اقلیتیں اپنے کردار کا مظاہرہ کریں گی تو یقیناً دیگر لوگوں کو متوجہ کرنے اور دعوت دینے کا سبب بنیں گی۔

6۔ مابعد جدیدیت کے نظریات مثلاً قدروں اور سچائی کی اضافیت اور مہابیانیہ کے رد کو مسلم مفکرین کو پرزور طریقے سے چیلنج کرنا چاہیے۔ ان مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالات پر اسلام کا معتدل اور متوازن موقف گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ موقف مابعد جدیدیت کے اندرونی تضادات سے بھی پاک ہے اور جدیدیت کی ان الجھنوں کو بھی نہایت خوبصورتی سے حل کرتا ہے جن کے حل کیلئے مابعد جدیدیت کی تحریک برپا ہوئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ممکنہ وسائل کو استعمال کرتے ہوئے یہ موقف پرزور طریقے سے دنیا کے سامنے لایا جائے۔

7۔ اس وقت دنیا بھر کے مذہبی اور نظریاتی فلسفے اپنے پیغام اور طرز پیش کش کو مابعد جدید ذہن کے حسب حال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیتھولک چرچ نے تو اس کی باقاعدہ منظم کوشش شروع کر دی ہے۔ اور مسیحی مطالعات میں Postmodern Evangelism باقاعدہ ایک ڈسپلن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔(10) مارکسزم کی نئی پیش کش نیو مارکسزم کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔ اسلام کے داعیوں کو بھی اپنی پیش کش میں بدلے ہوئے ذہن کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

مسلم مفکرین ابھی تک جدیدیت کو مدنظر رکھ کر اسلام کی حقانیت ثابت کرتے رہے ہیں۔ جن کا ہدف تھا کہ جدیدیت کے خیالات و نظریات کو غلط ثابت کیا جائے اور اس کے مقابلے میں اپنی دعوت کی معقولیت ثابت کی جائے۔ اب ہمارا سامنا ایک ایسے ذہن سے ہے جو کسی نظریے اور قدر/خیال کی ضرورت کا قائل نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ہماری دعوت اور ہمارے مخالف کی دعوت، دونوں کو صحیح اور غلط سمجھتا ہے۔ وہ نظریہ اور فکر کے معاملے میں سنجیدہ ہی نہیں ہے۔ وہ مذہب کے ساتھ

ساتھ فکر اور نظریے کو بھی انسان کا ذاتی / انفرادی معاملہ سمجھتا ہے جس پر بحث کرنے اور لڑنے یا سنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت ہے نہ جواز۔

یہ بدلی ہوئی صورت حال علمی و فکری مباحث کے پورے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیتی ہے اور اس کا لحاظ کیے بغیر ہم اپنی حکمت عملی کا صحیح طور پر تعین نہیں کر سکتے۔

8۔ مابعد جدیدیت نے فلسفے کا روایتی تصور ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ سابقہ نظریات کے ابطال کے بعد سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت نے معقولیات اور علمی دلائل کی اہمیت اس قدر گھٹا دی ہے کہ فلسفہ، سماجیات، تہذیبی مطالعات وغیرہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے بالکل نئے طریقے وجود میں آچکے ہیں۔ معقولات کے مقابلے میں قصے، کہانیاں اور داستانیں؛ عقل کے مقابلے میں جذباتی اپیل اور منظم اور مربوط بحث کے مقابلے میں ہلکی پھلکی اپیلیں مابعد جدید ذہن سے زیادہ قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن رشدؒ، امام غزالیؒ، ابن حزمؒ اور ابن تیمیہؒ کے بجائے سعدیؒ، رومیؒ، عمر خیامؒ اور اقبالؒ اس وقت بھی مغربی دنیا میں پڑھے جا رہے ہیں۔ ہمیں اپنی دعوت کی پیش کش میں اس تبدیلی کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا اور ایسے مطالعات تیار کرنے ہوں گے جن کے مقدمات مابعد جدید ذہن کو اپیل کر سکیں۔

9۔ معلومات اور اطلاعات کی اس غیر معمولی اہمیت کا جسے مابعد جدید عہد میں طاقت کے سب سے بڑے سرچشمے کا مقام مل چکا ہے۔ تقاضا ہے کہ مفکرین اسلام اس محاذ پر توجہ دیں۔ کہا جا رہا ہے کہ مابعد جدید دور میں سب سے بڑی قوت معلومات کی قوت ہی ہے۔ پچھلے باب میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ لیوٹارڈ نے لسانی کھیلوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ نئے دور میں معلومات کی ہر چال طاقت کی ایک وضع کی حامل ہے۔ اور بین الملکی طاقت کے کھیل میں کمپیوٹرائزڈ معلومات کا بڑا حصہ ہوگا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ قوموں اور ملکوں کی آئندہ رقابتیں اور دشمنیاں معلومات کے ذخیروں پر قدرت حاصل کرنے کیلئے ہوں گی یعنی معلومات گیری ملک گیری کی طرح عالمی سطح پر ہوس کا درجہ اختیار کر لے گی۔

اسی صورتحال کا نتیجہ ہے کہ ہر ملک اپنی معلومات پالیسی (Knowledge Policy) وضع کر رہا ہے اور معلومات کے انتظام (Information Management) کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس تناظر میں ہمیں بھی Information Technology سے صرفِ نظر نہ کرنا

چاہیے اور حکومتی اور نجی سطح پر قائم جامعات کو معلومات اور ڈیٹا (Data) کے جمع و انتظام اور استعمال پر خصوصی توجہ دینا ہوگی اور اپنی معلوماتی پالیسی وضع کرنا ہوگی۔ جبکہ ہمارے ہاں تو یہ افسوسناک صورتحال ہے کہ جامعات کے درمیان معلومات کی ترسیل کا باہم مربوط انتظام نہیں ہے۔ ابھی تک تحقیقی مقالہ جات کی فہرستیں ہی کمپیوٹرائزڈ نہیں ہوسکیں، مقالات کیا Digitalized ہوں گے۔ اس معاملے میں بھی پیش رفت کی ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ مابعد جدیدیت، جدیدیت کا ایک منفی ردعمل ہے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کا مظہر ہے جس میں مسلسل کئی نظریات کی ناکامی اور ابطال کے بعد ہمارے عہد کا پڑھا لکھا انسان بھٹک رہا ہے۔ افکار، نظریات اور فلسفوں کی عالیشان عمارتیں اس بری طرح سے زمین بوس ہوگئیں کہ نئے زمانہ کے فلسفیوں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ سوچنا ہی چھوڑ دیا جائے۔ فکر و خیال اور سچائی کے تصورات ہی کو واہمہ قرار دیا جائے۔ نظریے اور آئیڈیالوجی کو ایک ناپسندیدہ شے باور کیا جانے اور حیاتِ انسانی کو حالات اور افراتفری کے حوالے کر کے مابعد جدیدیت کی بھاری بھرکم اصطلاحات کی چھتری تلے اپنا بھرم قائم رکھا جائے۔ تمام جھوٹے خداؤں کے زمین بوس ہو جانے کے بعد مابعد جدیدیت دراصل ''لا الٰہ'' کا اعلان ہے۔ اب یہ مسلم مفکرین اور داعیانِ اسلام کے ذمہ ہے کہ وہ ''الا اللہ'' کا اعلان کس انداز سے کرتے ہیں جو یقیناً ہوگا اور موجودہ کیفیت کا لازمی اور منطقی انجام ہوگا۔

فصل سوم

مابعد جدیدیت اور اسلامی نظریۂ حیات

فرد ہو یا قوم، نظریے اور مقصودِ حیات کے بغیر اس کی ترقی اور استحکام ممکن نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیٔ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات (10)

(فرد کی زندگی جان وتن کے تعلق سے قائم ہے، اور قوم کی زندگی اپنی قدیم روایات کے تحفظ سے قائم رہتی ہے۔ فرد کی موت جوئے حیات خشک ہو جانے سے واقع ہو جاتی ہے، اور قوم کی موت مقصودِ حیات ترک کر دینے سے ہے۔)

پوری دنیا عموماً اور عالم اسلام خصوصاً مابعد جدیدیت کی ''بے نظریہ زندگی'' کی عالمی مہم کے نتیجے میں جن حالات سے دوچار ہے، وہ ''حفظ ناموس کہن'' کے لیے خطرہ اور ''ترک مقصود حیات'' کے تباہ کن راستے کی طرف دھکیلے جانے کا سامان ہے۔ ان خطرات اور اس بین الاقوامی یلغار کا بروقت مقابلہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

فرد اور قوم دونوں ہی کی زندگی میں نظریہ، تصورِ حیات اور زندگی کے مقصود کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ قرآن نے انسان کی سب سے بڑی ضرورت ''ہدایت'' کو قرار دیا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم. اس کی سب سے بنیادی دعا ہے اور ھدی للمتقین اس دعا کا جواب ہے۔

ہم پہلے بھی اس پر گفتگو کر چکے ہیں، مزید وضاحت کرتے ہوئے عرض ہے کہ قرآن پاک میں تخلیق آدم علیہ السلام کے واقعے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس کا مرکزی نکتہ انسان کا مقصدِ وجود ہے۔

یعنی خلافت اور نیابتِ الٰہی اور پورا قرآن اس ہدایت کا امین ہے جو انسان کو یہ کردار ادا کرنے کے لائق بناتا ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جس انسان کو اللہ نے خلیفۃ الارض بنایا، اسے علم الاشیاء سے نوازا' اسے عقل، ارادے، اور اختیار کی دولت سے مالا مال کیا۔ اس کے اندر خیر اور شر دونوں کا داعیہ رکھا:

"فالھمھا فجورھا وتقوٰھا". (11)

اسے حق و باطل اور خیر وشر میں تمیز کی صلاحیت سے نوازنے کے بعد، ہدایت سے بھی نوازا اور کامیابی کی شاہراہ کو روشن کر کے فرمایا کہ جو ہدایت کی پیروی کرے گا، وہی کامیاب ہے اور سے روگردانی کرے گا وہ ناکام ونامراد ہے؟

> **"فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون ٥ والذین کفروکذبوابایٰتنآ اولٓئک اصحٰب النارھم فیھا خالدون." (12)**

> (پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کی سب سے کارفرما قوت نظریہ اور ہدایت ہے۔ اس مثالیے (Paradigm) میں تین چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

1۔ **علم الاشیاء:** یعنی انسان کو اس کائنات کے وسائل اور خزانوں کا علم اور ادراک عطا کیا گیا ہے۔ اسی چیز نے انسان کو دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت بخشی اور اسے نیابت وخلافت کا اہل بنایا۔

2۔ **عقل اور انتخاب کی آزادی انسانوں کو عطا کی:** فرشتوں نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہ فساد کرے گا۔'' گویا ردوقبول کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبر میں نہیں کسا بلکہ اس کو آزادی اور انتخاب کی صلاحیت بھی دی ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو سیکولر سوچ (یا مابعد

جدیدیت) اور دینی سوچ میں مشترک ہیں۔البتہ اس سلسلے کی تیسری چیز (ہدایت) کے بارے میں جوانسانی زندگی کیلئے انتہائی ضروری ہے مغربی فکر (دور مظلمہ سے لے کر مابعدجدیدیت تک) اور دینی فکر میں بعدالمشرقین نظر آتا ہے اور یہیں سے اختلاف کی بنیاد سامنے آتی ہے۔

3۔ **ہدایت** سے مراد اس زندگی کو گزارنے کا اسلوب، احساس ذمہ داری کی میزان اور آخرت میں جواب دہی کی ذمہ داری ہے، جس کیلئے انبیا ورسل علیہم السلام کو بھیجا گیا، کتابوں اور ہدایت کی روشنی دی گئی اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی اس ابدی ہدایت کی تکمیل کی۔فرمایا:

"امن الرسول بماانزل الیه من ربه والمومنون کل امن باللہ وملئکته وکتبه ورسله لانفرق بین احد من رسله وقالو سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر". (13)

(رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں، انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے۔ یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔اور ان کا قول یہ ہے کہ: ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری طرف پلٹنا ہے۔)

مراد یہ ہے کہ **ہدایت وہ چیز ہے جو مقصد تک پہنچنے کی تمام تر جدوجہد کو سہارا عطا کرتی ہے، علم کو انسانیت کے لیے نافع اور سودمند بناتی ہے، اور نیابت وخلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کیلئے رہنمائی عطا کرتی ہے، دوسرے لفظوں میں علم الاشیاء، آزادیٔ انتخاب اور ہدایت کے تین ستونوں پر ہی نظریے، مقصد اور منزل کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ان کے بغیر نہ زندگی میں انضباط پیدا ہوتا ہے، نہ اصل جوہرِ انسانیت کا اظہار ہوتا ہے، اور نہ تحریک وتحرک کو کوئی راستہ ملتا ہے۔اس لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے نظریہ ناگزیر ہے، اور یہ سبھی معاشروں اور انسانوں کیلئے ضروری ہے،** جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہدایت، انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کیلئے یہ اصول طے کر دیا گیا ہے:

"اھدنا الصراط المستقیم ○ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لاالضآ لین ○" (14)

(ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ، جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔)

انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جن قوموں اور انسانوں کے سامنے کوئی نظریہ اور منزل تھی، انہی نے تاریخ کے اوراق میں اور تہذیب کے دامن میں نام پیدا کیا، نظریہ غلط ہو یا درست، شر پہ مبنی ہو یا خیر کا علم بردار، دونوں ہی صورتوں میں وہ ہمیشہ زندگی کی نشو و نما، پیش رفت اور ترقی کیلئے ایک بنیادی محرک رہا ہے۔ البتہ نظریہ اگر حق پر مبنی ہو تو اس سے انسانی زندگی اور دنیائے تہذیب میں خیر اور فلاح کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اگر وہ باطل پر مبنی ہے تو یہ جہان تنگ و تاز فساد کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔

بیسویں صدی ایک طرف تو بے خدا فلسفوں کے درمیان کشمکش اور دوسری طرف قوموں کے درمیان تجارتی و معاشی رقابت کی بنا پر خوں ریز تصادم کی صدی تھی۔ اس سے قبل انیسویں صدی میں ایوان تر گنیف (م 1883ء) نے عدمیت (Nihilism) زندگی ایک بے معنی اور محض وجودی چیز ہے) کے نظریے کو بڑے دعوے سے پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ گزشتہ دو صدیوں میں "جواب دہی کے تصور سے بالا" انسان کی مزعومہ سوچ کا سرچشمہ اسی فکر سے پھوٹتا ہے۔

آج دنیا میں ایک طرف تو یہ صورت حال ہے کہ مابعد جدید مفکرین ہر آفاقی بیان، صداقت اور نظریے کی تکذیب کرتے نظر آتے ہیں اور تکثیریت کی تبلیغ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آفاقی سطح پر عدم نظریہ یعنی مابعد جدیدیت کی Antitheory کی وجہ سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کیلئے دوسری طرف نظریات کی بالا دستی، مقاصد اور "اقدار بطور اصل کارفرما قوت" کے فہم اور حصول کی پیاس بڑھ رہی ہے۔ عصر حاضر میں پیدا شدہ عالمی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی بحران کا حل ایک بار پھر نظریاتی آدرشوں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اصل بحران، اخلاقی بحران ہے، نظریاتی شعور کی پستی کا بحران ہے، جس نے انسانی زندگی اور اس کے مستقبل کو خوفناک چیلنج سے دوچار کر دیا ہے۔

آج اہل فکر و نظر، اقدار اور اخلاق کی کارفرمائی کو زندگی کے فیصلہ کن مظہر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ انسانیت کا مستقبل اسی وقت روشن قرار دیا جا سکتا ہے، جب ایک ایسا عالمی نظام معرض وجود میں آئے، جو احترام آدمیت، اخوت، حریت اور مساوات اور بے لاگ انصاف پر استوار ہو، جو استحصال سے پاک اور انسانوں کے درمیان محبت، امداد باہمی اور مؤدت کا داعی ہو۔

پاکستان کے فکری بانی علامہ محمد اقبالؒ بھی کہہ گئے ہیں:

> ''جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں، بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ تو قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔''(15)

گویا اسلام ان نسلی اور علاقائی امتیازات سے بلند ہو کر انسان کو اس کی فطرت کی جانب بلاتا اور اسے ایک تصور جہاں (World view) کی روشنی دیتا ہے کہ جس کی بنا پر منصفانہ نظام جہاں (World Order) نمو پذیر ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک عالمی امت کا حصہ ہے، ایک مشن اور مقصد کا علم بردار ہے جسے مسلمانیت کی پہچان نے ایک خاص ذمہ داری سونپ دی ہے۔ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے، مگر وہ اسلام کے تصور جزا و سزا اور اخروی جواب دہی کے تصور سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے عقیدہ اور نظریہ حیات ہی اول و آخر مسلمان کی پہچان ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے ذہن میں تین بنیادی تصورات راسخ کر دیتا ہے:

1۔ غیر اللہ (مادی و معنوی) سے بغاوت۔

2۔ اللہ پر ایمان اور اس کے سامنے مکمل سپردگی۔

3۔ زندگی گزارنے کیلئے اللہ، رسول، قرآن اور آخرت پر ایمان اور قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق زندگی کو ڈھالنے کی جدوجہد ــــ یہ تینوں تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہی مسلم امت کی بنیاد ہیں اور اسی مناسبت سے ہر مسلمان مرد اور عورت کی شناخت متعین ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی (باب سوم)

(1) انصاری، مولوی ڈاکٹر خالد علی، بانی و مدیر، ماہنامہ ساحل کراچی، جلد سوم شمارہ تین مارچ 2007ء، ص26

(2) اختر الایمان، شیشے کا آدمی بحوالہ نارنگ، گوپی چند، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2006ء، ص647

(3) الذّٰریٰت:56

(4) نیر، ڈاکٹر ناصر عباس، مابعد جدیدیت۔ اطلاقی جہات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، س ن، ص182

(5) انصاری، مولوی ڈاکٹر خالد علی، بانی و مدیر، ماہنامہ ساحل کراچی، جلد سوم شمارہ تین، مارچ 2007ء، ص37

(6) عثمانی، ذیشان الحسن، سکھر سے فلوریڈا تک، گلوبل سائنس پبلی کیشنز کراچی، 2005ء، ص58

(7) ایضاً ص59

(8) نیو یارک ریویو آف بکس، اشاعت 5 نومبر 1970ء بحوالہ اشتیاق احمد، جدیدیت کا تنقیدی تناظر، بیت الحکمت لاہور 2006ء، ص220

(9) النحل:125

(10) www.gettysburgsem.org/mhoffman/other/postevangelism.html.

(10) اقبال، علامہ محمد، اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور، 1964ء، ص63

(11) الشمس:8

(12) البقرہ:39-38

(13) البقرہ:285

(14) الفاتحہ:6-5

(15) یکم جنوری 1938ء سال نو کا پیغام آل انڈیا ریڈیو لاہور، بحوالہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور ستمبر 2009ء، ص8

حاصل بحث

مابعد جدیدیت یا پس جدیدیت اصل میں انگریزی اصطلاح (Postmodernism) کا اردو ترجمہ ہے۔ مابعد جدیدیت آج کے دور کا فلسفہ، ترقی یافتہ معاشروں کا عقیدہ، طرزِ زندگی ،معاشرتی صورت حال اور نظریہ حیات کا نام ہے۔ابتدا میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح تنقیدی نظریہ (Critical Theory) کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ پھر بیسویں صدی کی اختتامی دہائیوں میں یہ اصطلاح قانون، تاریخ، کلچر اور مذہب کی وضاحت کیلئے بھی استعمال ہونے لگی۔ مابعد جدیدیت اصل میں اس سماجی اور فکری رجحان کا نام ہے جو جدیدیت کی فکری تحریک کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا اور Compact Dictionary کے مطابق مابعد جدیدیت ایسا تصورزندگی اور طرز فکر ہے جو نظریات وعقائد پر بے یقینی کی وجہ سے ممتاز ہے۔

مابعد جدیدیت کسی بھی حتمی اصول اور آفاقی سچائی کے وجود کا انکار کرتی ہے۔ یہ کسی بھی مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ صداقت کی منکر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس، فلسفہ اور مذہب آفاقی ہیں جبکہ مابعد جدیدیت اضافیت اور انفرادیت کی مدعی ہے۔ مابعد جدیدیت کا یہ تضاد (Paradox) ہے کہ یہ ہر قسم کے حتمی اور آفاقی اصول ونظریات کو رد کرتی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے اپنے اصول ودعاوی پھر کیونکر قابل تسلیم اور شک سے بالا ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت اپنے اصولوں کی بنیاد پر خود کو ہی ثابت نہیں کر سکتی جبکہ مابعد الطبیعیاتی نظریات کے ثبوت موجود ہیں جن کا مابعد جدیدیت کے حامی انکار کرتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے بانیوں میں ایک نمایاں ہستی جین فرینکوس لیوٹارڈ ہیں جنھوں نے فرانسیسی میں ایک کتاب لکھی جو مابعد جدیدیت کے نظریات کے حوالے سے بائبل کا درجہ رکھتی ہے کتاب کا نام ہے: The Postmodern Condition: A Report on Knowledge۔اس میں لیوٹارڈ لکھتا ہے:

I define postmodernism as incredulity towards metanarratives:

مابعد جدیدیت کے حامی کہتے ہیں کہ جدیدیت نے عقل کی بالاتری، آزادی، جمہوریت، ترقی، اوراشتراکیت جیسے خیالات عالمگیر سچائیوں(Metanarratives) کی حیثیتوں سے پیش کیے۔ یہ ایک کھلا فریب تھا۔ زمانے کی تبدیلی نے ان ساری خود ساختہ حقیقتوں کا جھوٹ واضح کردیا ہے۔اس لیے اب اس عہد میں اس طرح کے عظیم بیانات/مہابیانیے نہیں چلیں گے۔ یہ اس عہد کا خاصہ ہے اوراس عہد کی یہ خصوصیت ہی مابعد جدیدیت ہے۔

مابعد جدیدیت کے بنیادی نظریات درج ذیل ہیں:

۱۔ مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے۔

2۔ سماجی، سیاسی، ادبی، اخلاقی، مذہبی ہر معاملے میں بغاوت اورانحراف کا رجحان ہے۔

3۔ مہابیانیہ کا زمانہ گزر گیا۔ مہابیانیہ ختم ہوگئے یا دب گئے۔ یہ دور چھوٹے چھوٹے بیانیوں کا ہے،جو مقامی ثقافتوں کے مطابق درست ہوسکتے ہیں۔

4۔ سچائیاں ایک نہیں ہیں، ان کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوسکتا ہے۔مابعد جدیدیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ سچائی یونیورسل نہیں ہوسکتی۔

5۔ اب تک کلاسیکی سرمایہ کو عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے لیکن اس کو مستند اور حتمی نہیں تصور کرنا چاہیے۔اس کا ردتشکیل کیا جاسکتا ہے۔

6۔ دنیا غیر حقیقی ہوگئی ہے۔ دراصل اب چیزوں کی نمائندگی جس طرح ہوتی ہے وہ بذات خود متعلقہ اشیا سے مختلف ہوتی ہیں۔اورآئے دن کے مرحلے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ تو سچائیاں ہی مستقل ہیں اور نہ ان کی نمائندگی ہی!

مابعد جدیدیت کا پہلا نظریہ جسے ہم نے تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنایا ہے، وہ ہے: سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ کا ردّ''۔ مابعد جدیدیت کے مطابق دنیا میں کسی آفاقی صداقت کا وجود نہیں ہے۔ جدیدیت کے علم بردار دعویٰ کرتے ہیں کہ جمہوریت، آزادی و مساوات، سرمایہ دارانہ نظام معیشت یا اشتراکیت ایک عالمی سچائی ہے اور دنیا کو چاہیے کہ وہ ان نظاموں کو اپنا لیں۔

مابعد جدیدی دوسری انتہا پر جا کر عالمی آفاقی سچائیوں اور مذہب کے عقائد و تصورات کا انکار کرتے ہیں کہ کسی عالمی سچائی کا وجود ہی نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت سچائی، اخلاقی قدر، حسن، ذوق وغیرہ کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند اور حالات سے جوڑتی ہے۔ یعنی ایک ہی بات کسی مقام پر یا مخصوص صورت میں درست اور دوسری صورت میں جھوٹ ہو سکتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نزدیک کائنات میں ایسی کوئی قدر یا صداقت موجود نہیں جس پر زمان و مکان کی تبدیلی اثر انداز نہ ہو۔

مہابیانیہ کے رد اور آفاقی صداقت کے عدم وجود کا یہ مابعد جدیدی دعویٰ بھی تو ایک مہابیانیہ ہے۔ لہٰذا مابعد جدیدیت کا دعویٰ استبعاد (Pardox) ہے، لہٰذا ان کا اپنا دعویٰ بھی تو ان کی تھیوری کے مطابق ردّ ہو جاتا ہے۔ مابعد جدیدی جن پیمانوں پر سابقہ نظریات کو رد کرتے ہیں، انہی کی رو سے مابعد جدیدیت کے دعوے بھی رد ہو جاتے ہیں۔ فکر انسانی کی یہ عجیب شاہکار تھیوری ہے جو اپنے ہی پیمانوں پر اپنے آپ کو رد کر دیتی ہے۔

سچائی کی اضافیت کا نظریہ اسلامی تعلیمات کی رو سے بھی ایک باطل نظریہ ہے۔ شریعت اسلامی کی بنیاد حکمت و دانش پر ہے نہ کہ خواہشات، حماقتوں اور خرافات پر! یہ ایک بامقصد شریعت ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ عقل سے ثابت ہے اور عقل سلیم سے مذہب کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ مغیبات کا دائرہ اسلام میں محدود ہے اور غیبی عقائد بھی حد درجہ معقول ہیں۔

اس ساری بحث میں اسلام کا نقطۂ نظر حد درجہ معتدل، متوازن اور عقل کو اپیل کرنے والا ہے یعنی اسلام اس بات کا قائل ہے کہ عقل انسانی کے ذریعے مستنبط حقائق یقیناً اضافی ہیں اور شک و شبہ سے بالاتر نہیں ۔۔۔ اور وہ اضافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن حقائق کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہے وہ حتمی اور قطعی ہیں۔ امام غزالیؒ نے بھی محض عقل انسانی کے ذریعے حاصل شدہ علم کو اضافی کہا ہے۔ وہ سوال اٹھاتے

ہیں کہ حسیات کا دھوکہ عقل سے معلوم ہوتا ہے اور عقل کا دھوکہ کسی ایسے ذریعے سے ہی معلوم ہوگا جو عقل سے بالاتر ہو یعنی وحی الٰہی۔

جدید اسلامی مفکرین علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ وغیرہ نے بھی اس موضوع پر بحث کی ہے۔

مابعد جدیدیت کا دوسرا قابل اعتراض نظریہ ''دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ'' ہے۔ مابعد جدیدیت کے نزدیک جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس کی حیثیت سچائی کی نہیں ہے۔ اس کے علم برداروں کا خیال ہے کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کو حقیقی اور ٹھوس مناظر اور اشیا کے بجائے ایسے عکسوں اور شبیہوں سے عبارت سمجھتے ہیں جو غیر حقیقی اور غیر محسوس ہیں۔

جین بادریلا مابعد جدید معاشرے کو ہائپر ریئل قرار دیتا ہے یعنی ایسی چیز کی مکمل تمثیل جس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ یعنی دنیا Copy world ہے۔ وہ کنزیومر سوسائٹی کے اس طرز عمل کو غیر حقیقی دنیا قرار دیتا ہے۔

میڈیا ہر چیز کو قابل فروخت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اب فقط پراڈکٹ نہیں بلکہ خیال، تصورات، عقائد، انسانی جسم، آئیڈیالوجی، آرٹ، سیاسی ایجنڈا وغیرہ سب کچھ برائے فروخت ہے اور خوبصورت، دلکش فریب دے کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ کاروبار میں کھلا فریب دیا جاتا ہے اور بزنس کو چیستاں بنا دیا گیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ اسلام اس دنیا کو حقیقی اور خالق کے ایک منصوبے کی صورت میں تخلیق کی گئی قرار دیتا ہے۔ خدا کا تخلیق شدہ یہ نظام بامقصد ہے اور انسانوں کی آزمائش کی جا رہی ہے۔ اور خدا نے انسان کو ارادہ، اختیار، شعور اور قوت ضمیر دے کر دنیا میں پیدا فرمایا ہے اور اس بات کا انتہائی حد تک معقول انتظام فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے مقصد تخلیق سے آگاہ رکھا جائے۔ اس بات کیلئے اس نے اپنے ہادی اور پیغمبر بھیجے تا کہ دنیا کو گاہے بگاہے باخبر کرتے رہیں۔ لیکن انسان وحیٔ ربانی سے منہ موڑ کر اپنی خواہشات، تاویلات، تشریحات اور تخیلات کے پیچھے بھاگتا ہے۔ لوگ اپنے نفس کے پجاری ہیں۔ اسلام انسان کو کاروبار کے بھی صاف ستھرے اصول دیتا ہے جس میں دھوکہ یا فریب نہیں ہوتا۔ اور دھوکے سے عیب دار مال کو بیچنا حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے بیع غرر یعنی دھوکے کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے فحاشی

کا قلع قمع کرنے اور عورتوں کو استحصال (Exploitation) سے روکنے کیلئے پردہ کی تلقین کی ہے۔ قرآن نے انبیاء کے قصے عبرت کیلئے بیان کیے ہیں اور Glamour سے اجتناب کیا ہے، اگر برے کردار کو قرآن نے بیان بھی کیا ہے تو برائی سے نفرت پیدا کرنے کیلئے۔

اسلام چاہتا ہے کہ ایسا صاف ستھرا معاشرہ ہو جس میں حق اور عدل ہو، راست بازی ہو، باہمی احترام ہو، جس میں سب لوگوں کو ان کے حقوق میسر آئیں اور لوگ بغیر کسی فتنہ اور انحراف سے عمدگی اور خوش اسلوبی سے زندگی بسر کریں۔ اسلام نے محض دنیا کی زیب وزینت میں مگن ہونے کو ''متاع الغرور'' قرار دیا ہے اور بچنے کی تلقین کی ہے۔ بلکہ دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہو کر خالق تک رسائی حاصل کرنے کو اصل مقصد قرار دیا ہے۔

مابعد جدیدیت کا تیسرا نظریہ جس پر ہم نے تحقیقی نظر ڈالی ہے وہ ردتشکیل کا نظریہ ہے۔ ردتشکیل کا سب سے بڑا نمائندہ جیکوس دریدا ہے جو معنی، پس معنی، معنی در معنی کے تصور کو الٹ کر معنی، ردمعنی میں بدل دیتا ہے۔ اس لیے صداقت کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کر دیتا ہے۔ وہ Differance کا لفظ ایجاد کرتا ہے یعنی افتراق، مطلب یہ کہ دال اور مدلول کے اشتراک سے جو لسانی نشانات بنتے ہیں وہ Differance کی بنیاد پر خود مختار اور من مانے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سوسئیر بھی کہتا ہے کہ جس طرح ثقافتیں بدل جاتی ہیں، اسی طرح صداقتوں اور حقائق کے تناظرات بھی بدل جاتے ہیں۔ ہر ثقافت اپنی سچائیاں خود وضع کرتی ہے، اور پچھلی صداقتوں کا ردتشکیل کرتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند ادبی تنقید کے حوالے سے ردتشکیل کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ: ردتشکیل متن مطالعے کا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے نہ صرف متن کے متعینہ معنی کو بے دخل کیا جا سکتا ہے، اس کی معنیاتی وحدت کو بھی پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے۔ ردتشکیل اصل میں شدید قسم کا بت شکن رویہ ہے۔ اس کے نزدیک کوئی اصول یا مفروضہ مقدس نہیں ہے۔ اسی لیے مابعد جدید مفکرین ماضی کے کسی اصول، فلسفے، صداقت، مقدس متن وغیرہ کو بعینہٖ تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کی ردتشکیل کر کے نئی وضاحت اور نیا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اسی ذہنیت کے تحت سلمان رشدی ملعون نے ''شیطانی آیات'' (Satanic verses) نامی کتاب لکھی اور حال ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاکے بنا کر شائع کیے گئے۔

ردِ تشکیل کے مباحث سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

1۔ ہر ثقافت اور نسل کی اپنی سچائیاں اور اصول ہوتے ہیں اور وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اس سے پہلے کی تمام روایات کو رد کرنے اور نئے سرے سے تشکیل دینے کی داعی ہے۔

2۔ متن کے معنی بمشکل ہی وہ قرار پاسکتے ہیں جو بظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

3۔ کلاسیکی سرمایہ بشمول مقدس الہامی متون؛ کی ردِ تشکیل کی جاسکتی ہے۔

4۔ ردِ تشکیل ایسی تفہیم کو تسلیم نہیں کرتی جو اپنے اخذ کردہ یا علق کردہ معنی کو دوسروں پر عائد کرتی ہے۔

5۔ ردِ تشکیل معنی ہی نہیں سچائی پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے۔

ردِ تشکیل کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ یہ ایک غلط اور باطل نظریہ ہے، جو انسانی معاشرے کو خلفشار دانتشار میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ انسانی فکر صدیوں سے طے شدہ اصولوں ونظریات کو رد کر کے اپنی تھیوری پیش کرے۔ اگر ہر نسل ایسا کرے تو ثقافت کا تحفظ اور اس کی ترسیل کیسے ممکن ہو سکے گی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تہذیب وتمدن میں تو تبدیلی ہوسکتی ہے بلکہ انسانی مشاہدات وتجربات سے اخذ شدہ علوم ارتقاء پذیر ہیں لیکن انسانی فطرت، کائنات کے بنیادی قوانین اور ہدایت وضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلام نے ''ختم نبوت'' کا نظریہ دیا ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی نہیں ہوگا اور وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اب قیامت تک قرآن ہی اللہ کی کتاب اور بنی نوع انسان کی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اس نظریے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب زمانے میں کسی ایسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے جو بنیادی اصولوں میں کسی ترمیم کی متقاضی ہو۔ آنے والی ہر جدت کی نوعیت جزوی اور ذیلی ہی ہوگی۔ اس لیے مابعد جدیدیت کا ردِ تشکیل کا نظریہ لغو اور باطل ہے۔

ردِ تشکیل کا یہ دعویٰ کہ لفظ معنی در معنی اور باطنی معنی کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اور دال اور مدلول کا رشتہ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ ایک متعین مفہوم اخذ کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسلام میں گیارویں صدی میں دو فرقوں ''ظاہری'' (سنی مسلمان) اور باطنی (اسماعیلی شیعہ) کے درمیان موضوع بحث رہا ہے اور فقہاء

محدثین نے ہمیشہ قرآن وحدیث کے ظاہری اور متعین معنی کو قبول کیا ہے اور رمزیہ، اشاری یا باطنی تاویلات وتفاسیر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ امام ابن حزمؒ اور بعد میں امام ابن تیمیہؒ نے باطنیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کو مسکت جواب دیے۔

قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا جس کے مفہوم ومنشا کو سمجھنے میں صحابہ کو بھی دقت پیش نہ آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں ایسی شریعت دی جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں۔ یعنی اس کے احکام نہایت صاف اور واضح ہیں۔

☆☆☆☆☆

نتائج تحقیق

حاصل کلام یہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور اکیسویں صدی کے آغاز میں مغرب پر جس فکر و تحریک کا غلبہ ہے اسے مابعد جدیدیت (Postmodernism) کہا جاتا ہے۔ گزشتہ صدی، جدیدیت (Modernism) کی صدی تھی۔ جدیدیت اصل میں ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی، سماجی اور معاشی تحریکوں کا نام ہے جو گزشتہ دو صدیوں کے یورپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی جبر و استبداد کے ردعمل میں پیدا ہوئیں اور جن پر ہم پہلے باب میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ مابعد جدیدیت ان افکار کے مجموعے کا نام ہے جو جدیدیت کے بعد اور اکثر اس کے ردعمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ مابعد جدیدیت کے حامی مفکرین کی اکثریت کمیونزم سے وابستہ رہی تھی اور انہوں اس نظام سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن کمیونزم کی ناکامی کے بعد ان مفکرین نے مایوس ہو کر ہر قسم کی آفاقی صداقت کو مہابیانیہ (Metanarrative) کہہ کر رد کر دیا۔ بلکہ ہر ایسے اصول، ضابطے اور نظریے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو آفاقیت کا دعویدار ہو۔ یہ نظریہ چاہے سیاسی ہو، سماجی ہو، معاشی ہو، مذہبی ہو یا اخلاقی!

مابعد جدیدیت کے حامی مفکرین، مابعد جدید صورتحال کی درج ذیل تین خصوصیات پر زور دیتے ہیں:

1۔ سچائی کی اضافیت کا نظریہ اور مہابیانیہ کا رد۔ یعنی مابعد جدیدیت کے نزدیک دنیا میں کسی آفاقی سچائی کا وجود نہیں ہے بلکہ آفاقیت کا ہر دعویٰ Utopia ہے۔ مابعد جدیدیت کے نزدیک اصل شے، ''اضافیت اور تکثیریت'' ہے یعنی مختلف اور متضاد سچائیاں مخصوص حالات

اور مقامات کے تحت درست ہو سکتی ہیں۔ ہم نے عقلی اور نقلی بنیادوں پر ثابت کیا ہے کہ ایسا نظریہ غلط ہے۔ انسانی فطرت کچھ اصولوں اور ضابطوں کی یکسانیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ تنوع، جہاں تمدن کو رنگا رنگی عطا کرتا ہے، وہاں کچھ اصولوں پر اتفاق بھی انسانی تہذیب و ثقافت کے ارتقاء اور امن و ہم آہنگی کیلئے ضروری ہے۔ اسلامی تعلیمات نہ صرف آفاقی اور معتدل ہیں بلکہ انسانیت کیلئے قابل قبول اور قابل عمل بھی ہیں جن پر زمان و مکان کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوتی۔

2۔ مابعد جدیدیت کی دوسری خصوصیت دنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ یعنی Hyperreality ہے۔ مابعد جدید مفکرین موجودہ سوسائٹی کے چلن کو کنزیومر کلچر سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میڈیا کے طاقتور اثر نے دنیا کی حقیقت کو دھندلا دیا ہے۔ اور ہم وہی کچھ دیکھتے ہیں جو میڈیا ہمیں دکھاتا ہے یعنی میڈیا حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ حقائق تخلیق کرتا ہے۔ یہ مفکرین مزید کہتے ہیں کہ حقیقت کا وجود خارجی نہیں بلکہ ہر انسان کی سچائی کا معیار جدا جدا ہے اور معاشروں پر Fantasy کا غلبہ ہونے کی وجہ سے انسان کا صداقت کا معیار بدل گیا ہے۔ بادریلا وغیرہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم Copy world میں جی رہے ہیں۔

شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ نظریہ اور تصور بھی باطل ہے کہ ہر انسان اپنے لیے صداقت کے معیار طے کر لے: صداقت کی رہنمائی ہمیں وحی کے ذریعے خارجی اور عقل سلیم اور ضمیر (نفس مطمئنہ) کے ذریعے داخلی طور پر ہوتی ہے۔ خیر اور شر کے اصول انسان اپنی خواہشات اور شہوات کی روشنی میں نہیں طے کر سکتا بلکہ سماوی ہدایت ہی اصل معیار ہے جو انسانیت کیلئے کامیابی اور فلاح کی ضامن ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے دھوکہ دہی حرام اور ممنوع ہے اور اسلام کی صاف ستھری اور کھری تعلیمات کاروبار کے بہترین اصول طے کرتی ہیں۔ اپنے کردار کے ذریعے جو مسلمان تاجر اشاعت اسلام کرتے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی تعلیمات کو مابعد جدیدیت کے کنزیومر کلچر سے کوئی خدشہ درپیش نہیں ہے۔

3۔ مابعد جدیدیت کا تیسرا نظریہ ردتشکیل (Deconstruction) ہے۔ یعنی ہر نسل کی اپنی سچائیاں، اصول، معتقدات، معیار اور نظریات ہوتے ہیں اور گزشتہ نسلوں کے قائم شدہ اور مقدس سمجھے جانے والے معیارات (Norms) اور معتقدات کے تنقیدی اصولوں کی کسوٹی پر جانچ کر ان کی ردتشکیل یا تغیر و تبدل کی جانا چاہیے۔ مابعد جدیدیت کے نزدیک تقدیس کا مرتبہ نہ کسی ہستی کو حاصل ہے نہ متن (Text) کو! ہر نسل کو اپنے اصول و نظریات اور

معیارات خود قائم کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ہم مقالے میں مابعد جدیدیت کے نظریہ ردتشکیل کے اندرونی تضاد (Paradox) کو واضح کر آئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اگر ہر آنے والی نسل گزشتہ نسلوں کے معیارات کی ردتشکیل کرتی رہے گی تو انسانی علم وثقافت کا تحفظ اور ترسیل کیسے ممکن ہوگی اور علوم انسانی میں ارتقاء کس طرح وقوع پذیر ہوگا؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تقدیس کا مقام کسی کو نہیں دیا جا سکتا تو مابعد جدید مفکرین کے نظریات کو کس بنیاد پر تسلیم کیا جائے؟ یہ بھی تو چند انسانوں کی محض سوچ کا ہی نتیجہ ہے۔

مختصراً یہ ہے کہ مابعد جدیدیت نظریہ سے خالی عہد کا نام ہے اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے کا مظہر ہے جس میں آج کا انسان مسلسل کئی نظریات کی ناکامی کے بعد بھٹک رہا ہے۔ تمام جھوٹے نظریات کا ابطال اصل ہی لا الٰہ کا اعلان ہے۔ جو مابعد جدیدیت کر چکی ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات الا اللہ کا نقارہ ہے۔ اب یہ مسلم داعیان اور مفکرین کے ذمہ ہے کہ وہ اس کا اعلان کس طریقہ سے کرتے اور آج کے بے چین انسان کو اطمینان اور سکون قلب کا تحفہ دیتے ہیں۔

لہٰذا ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت کوئی بھی نظریہ اسلام کی صاف ستھری اور پراز حکمت تعلیمات کیلئے چیلنج کا درجہ نہیں رکھتا۔ اسلام کی رہنمائی آفاقی، ابدی، سرمدی اور ناقابل تغیر ہے۔ اسی لیے قرآن چیلنج کرتا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی

☆☆☆☆☆

اشاریہ

قرآنی آیات

ف

ق

ل

و

ہ

ی

اشاریہ

احادیث نبوی ﷺ

مصادر و مراجع

1 **القرآن الکریم۔**

2 یوحنا کی انجیل، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور س ن

3 **بھگوت گیتا** (ترجمہ از: خواجہ دل محمد، فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور) خواجہ بکڈ پو لاہور، 1945ء

اردو/عربی کتب

1۔ ابن تیمیہ، شیخ الاسلام امام احمد حرانی، مقدمہ فی اصول التفسیر، مکتبہ سلفیہ لاہور، 1994ء

2۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2003ء)

3۔ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، السنن، مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2005ء

4۔ اشتیاق احمد، جدیدیت کا تنقیدی تناظر، بیت الحکمت لاہور، 2006ء

5۔ افتخار حسین، ڈاکٹر آغا، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب لاہور، 1999ء

6۔ اقبال، علامہ ڈاکٹر سر محمد، اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور، 1964ء

7۔ اقبال، علامہ ڈاکٹر سر محمد، خطبات (ترجمہ از: نذیر نیازی) بزم اقبال لاہور، 1973ء

8۔ اقبال، علامہ ڈاکٹر سر محمد، ضرب کلیم در کلیاتِ اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور، 1986ء

9۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح مع فتح الباری، دارالسلام الریاض، 2000ء

10۔ بوکائیے، ڈاکٹر موریس، بائبل، قرآن اور سائنس (ترجمہ از: ثناء الحق صدیقی) وقاص پبلشرز سیالکوٹ، 2000ء

11۔ جارج سارٹن، قدیم علوم اور جدید تہذیب، دارالشعور لاہور، 2005ء

12۔ جارج سارٹن، مقدمہ تاریخ سائنس (ترجمہ از: نذیر نیازی) مجلس ترقی ادب لاہور، 1968ء

13۔ جانباز، شیخ الحدیث علامہ محمد علی، انجاز الحاجہ شرح السنن ابن ماجہ، مکتبہ قدوسیہ لاہور، 2005ء

14۔ جصاص، امام ابوبکر احمد بن علی الحنفی، احکام القرآن، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، 1999ء

15۔ حامد کمال الدین، فہم دین کا مصدر، مطبوعات ایقاظ لاہور، 2008ء

16۔ حسن عسکری، پروفیسر، جدیدیت، ادارہ فروغ اسلام لاہور، 1997ء

17۔ خورشید احمد، پروفیسر، اسلامی نظریۂ حیات، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، 2006ء

18۔ خورشید احمد، پروفیسر، سوشلزم یا اسلام، مکتبہ چراغ راہ کراچی، س ن۔

19۔ رسل، برٹرینڈ، سائنسی نقطۂ نظر (ترجمہ از: پروفیسر نعیم احمد) اردو سائنس بورڈ لاہور، 2003ء

20۔ السعدی، فضیلۃ الشیخ علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر، تفسیر السعدی، دارالسلام لاہور، 2007ء

21۔ سی اے قادر، تاریخ سائنس، ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1983ء

22۔ شہزاد احمد، فرائیڈ کی نفسیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2006ء

23۔ الصنعانی، امام الشیخ محمد بن اسماعیل امیر الیمینی، سبل السلام شرح بلوغ المرام، دارالمعرفہ بیروت، 2001ء

24۔ ظفر علی خاں، مولانا، معرکۂ مذہب و سائنس، (جان ولیم ڈریپر) الفیصل ناشران کتب لاہور، 2004ء

25۔ عثمانی، ذیشان الحسن، سکھر سے فلوریڈا تک، گلوبل سائنس پبلی کیشنز کراچی، 2005ء

26۔ عطیہ، ڈاکٹر جمال الدین، النظریۃ العامہ للشریعۃ الاسلامیہ (ترجمہ از: مولانا حبیب الرحمٰن) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، 2002ء

27۔ غزالی، ابو حامد محمد بن محمد بن احمد، تہافۃ الفلاسفہ (تقدیم: مولانا محمد حنیف ندوی) ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، 1995ء

28۔ کرشن جی مہاراج، شری مدبھگوت گیتا، (ترجمہ از: خواجہ دل محمد ایم اے فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور) خواجہ بک ڈپو، موہن لال روڈ لاہور، 1945ء

29۔ کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن، مکتبۃ السلام لاہور، 2003ء

30۔ مارکس، کارل، داس کیپٹل سرمایہ ترجمہ از: کامریڈ لال خاں) بک ہوم لاہور، 2003ء

31۔ مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، مکتبہ سلفیہ لاہور، 2000ء

32۔ محمد اسماعیل سید، رسول عربی اور عصر جدید، احمد پبلی کیشنز لاہور، 2003ء

33۔ محمد فواد عبدالباقی، المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الکریم، منشورات ذوی القربٰی، 1423ھ

34۔ محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، 1986ء

35۔ محمد قطب، جاھلیۃ القرن العشرین (جدید جاہلیت ترجمہ از: ساجد الرحمٰن صدیقی) البدر پبلی کیشنز لاہور، 1980ء

36۔ مسلم بن الحجاج القشیری، امام، الجامع الصحیح، نعمانی کتب خانہ لاہور، 2004ء

37۔ مطالعہ پاکستان برائے ہائر سیکنڈری، کورس کوڈ، 317، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، 2007ء

38۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، 1981ء

39۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، دین حق، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، 2007ء

40۔ نارنگ، پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند، ترقی پسندی جدیدیت، مابعد جدیدیت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2006ء

41۔ نارنگ، پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 1994ء

42۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن

43۔ ندوی، علامہ سید سلیمان، سیرت النبی، الفیصل ناشران کتب لاہور، 1991ء

44۔ نظام صدیقی، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، اختر مطبوعات کراچی، 1999ء

45۔ نعمانی، علامہ شبلی، علم الکلام اور الکلام، مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی، 1967ء

46۔ نعیم احمد، پروفیسر ڈاکٹر، فلسفے کی ماہیت، ادارۂ تالیف وترجمہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، مئی 1997ء

47۔ نیر، ڈاکٹر ناصر عباس، مابعد جدیدیت نظری مباحث، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، س ن

48۔ نیر، ڈاکٹر ناصر عباس، مابعد جدیدیت، اطلاقی جہات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، س ن

49۔ ولی اللہ، امام علامہ الشیخ الہند احمد دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، قدیمی کتب خانہ کراچی س ن

50۔ وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت۔ مضمرات وممکنات، پورب اکادمی اسلام آباد، 2007ء

English Books

1. Akbar s. Ahmad (1992) , Postmodernism and Islam: Predicament and Promise. Routledge.
2. Alain, Touraine (1995), Critique of Modernity, Cambridge Blackwell.
3. Bauman, Zygmunt (2000) ,Liquid Modernity, Cambridge: Polity Press.
4. Callinicos, Alex(1991), Against Postmodernism: A Marxist Critique. Cambridge: Polity Press.
5. Charles upton(2001), the system of Antichrist Truth Falsehood in Postmodernism & The New Age Sophia: Perennmis.
6. Collins, Jim, (1989), Uncommon Cultures: Popular Culture and Postmodernism, Routledge.
7. Cornalia, Klinger. (2004) From Freedom without choice to choice without Freedom: The Trajectory of the Modern Subject. Blackwell Publishing Ltd.
8. Darwin, charles (1996). The origin of species. oxford university press.
9. Descartes. Rene(2001) ,Discourse on Method. Meligan Inc.
10. Dewy, John (1985). Hegel (ed.Michel Inwood) London oxford press.
11. Focault, Michel (1980). What is an Author?(Tr. Sheriden smith A.M). London Tavistock.
12. Focault Michel (1972). The Archeology of knowledge (Tr. Sheriden smith A.M) London Tavistock.
13. Habermas, Jurgen (1993). Modernity Versus Postmodernity. Campridge: polity press.
14. Habermas, Jurgen (1987). The Philosophical Discourse of Modernity: Twelve Lectures.(Tr. Fredrick Lawrance) The MIT Press.
15. Hans. Bertens(1995). The Idea of Postmodern: A History. Routledge.
16. Harvey. David (1998). The Idea of Postmodern. Oxford: Blackwell.

17. Iqbal, Allama Muhammad, (1989), The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy Pakistan Lahore.
18. Issac Asimov(1967), The Genetic Code, Paperboard.
19. Jean Baudrillard (1988), Simulacra and simulaions In selected writings, (Mark Poster ed.) Standford university Press.
20. Jencks, Charles (1993), Postmodern Architecture, London.
21. John Tiffin (2001). Hyperreality: Paradigm For the Third Millennium, New York, Routledge.
22. Jones, Ernest (2003), The Life and Works of Sigmund Freud, Imperials London.
23. Josh me Dowell & Bob Hostetler (1998), The New Tolerance, Carol Stream.
24. Klags, Mary (2007), Literary Theory: A Guide For the Perplexed. Continum Press.
25. Lyotard, Jean-Francois (1993), The Postmodern Condition: A Report on Knowledge; (Tr. Geoff Bennington and Brian Massumi) Minneapolis: University of Minnesate Press.
26. Nasr, Syed Hossein (1993), A Young Muslims Guide to the Modern World, Cambridge university press.
27. Novak, Philip (1996), The vision of Nietzsche. Element Brisbane.
28. Pope, Alexander (1996), The Rape of the Lock, OUP.
29. R.S Woodworth, (1998) Psychology, Routledge London.
30. Said, Edward w. (1983), The World, The Text and the Critic, Faber and Faber, London.
31. Shakespeare, william (2000) Hamlet, Cambridge university press.
32. Shannon, weiss (2007), Postmodernism and its critics. University of Alabama press.
33. Sophocles. (1996) Oedipus Rex, Book Home New Delhi.
34. Stephens, John (1998), Retelling Stories, Framing culture: Traditional Story and Metanarratives in childern's Literature, ISBN 0-8153-1298-9.
35. Umberto Eco (1986), Travels in Hyperreality, NYC, Harcourt Brace Joranovich.
36. Willian's beck (2001), Modern Science and the Nature of Life. Penguin Books.

اردو رسائل و جرائد

1۔ سہ ماہی ایقاظ لاہور، مدیر مسئول: حامد کمال الدین۔
2۔ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، مدیر: پروفیسر خورشید احمد۔
3۔ ماہنامہ ساحل کراچی، بانی و مدیر: مولوی ڈاکٹر خالد علی۔
4۔ روزنامہ جنگ لاہور

Periodicals

1. The Postmodern Turn, Essays in Postmodern Theory and Cultures Ohio University Press, 1987.
2. Thompson J-M Postmodernism, the Hibbert Journal, Vol, XII, No.4, July 1994.

Encyclopedias

1. Encylopedia Britanica (1988), Encyclopedia Britanica Incorporated, Chicago, USA.
2. Encycolopedia of Cultural Anthropology (1984), Editor: David Lavinson, Melvin Ember, New York, Henry Halt company.
3. Encyclopedia of Faith and Reason (online).
4. Routledge Encyclopedia of Philosophy (1993), Routledge.

5۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، 1982ء

Dictionaries

1. American Heritage Dictionary (online).
2. Chambers 20th Century Dictionary.
3. The Hutchinson Dictionary of Ideas. Helicon Publishing Ltd. Oxford. 1994.
4. Merriam-webster's Dictionary (online)
5. The oxford Advanced Learner's Dictionary, Oxford University Press.
6. The Penguin Dictionary of Literary Terms And Literary Theory. Penguin Books, 1992.
7. The Webster Encyclopediac unabridyed Dictionary 1994.

Websites

1. www.askoxford, com/concise-oed/postmodernism.
2. www.colorado.edu/English
3. www.drawinistsinmourning.com
4. www.durham.edu.uk
5. www.gettysburysem.org/mhoffman/other/postevangelism,html.
6. www.gyazali.org/site/dissert/html.
7. www.yseis-ucla.edu/courses/ed2539/GLOBE.
8. www.pbs.org/faithandreason/postm-body.html.
9. www.wikipedia.org.

ادارے کی شائع کردہ چند کتب

- ☆ الرسول ﷺ
- ☆ تاریخ الدولۃ المکیۃ
- ☆ فقہائے احناف اور فہم حدیث
- ☆ مذہب حنفی کی تائید و ترجیح (مترجم)
- ☆ فضائل موئے مبارک ﷺ
- ☆ الشیخ احمد رضا خان الھندی البریلوی (عربی)
- ☆ تحقیق التراویح (مترجم)
- ☆ کتاب العقل
- ☆ جہاد مزاحمت اور بغاوت
- ☆ تہافت الفلاسفہ (مترجم)
- ☆ متون حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات
- ☆ احادیث توسل و زیارت (مترجم)
- ☆ دعوت اسلامی (فکر اور تنظیم کار)
- ☆ معارف اصول حدیث
- ☆ سرمایہ دارانہ نظام ایک تعارف
- ☆ اللمع فی تصوف (مترجم)
- ☆ اسلام یا جمہوریت
- ☆ کشف المحجوب (مترجم 2 کلر)
- ☆ اسلام اور جدید سائنس
- ☆ ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (مترجم)
- ☆ یہودی، مغرب اور مسلمان
- ☆ روح تصوف
- ☆ تحفۃ المجاہدین (متن و ترجمہ)
- ☆ فصوص الحکم (مترجم)
- ☆ مشنری سکول (متن و ترجمہ)
- ☆ بستان العارفین (مترجم)
- ☆ Rejecting Freedom & Progress
- ☆ مناقب ابن عربی (متن و ترجمہ)
- ☆ مابعد جدیدیت اور اسلامی تعلیمات
- ☆ شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
- ☆ فلسفہ اور سامراجی دہشت گردی
- ☆ زبدۃ المقامات (مترجم)
- ☆ نیچریت (متن و ترجمہ)
- ☆ افکار الصدرین
- ☆ کمپنی کی حکومت
- ☆ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ
- ☆ مقالات جامی
- ☆ وحدۃ الوجود (متن و ترجمہ)
- ☆ غزوۂ ہند
- ☆ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ
- ☆ صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی کی مکمل کتابوں کا سیٹ
- ☆ امام غزالی اور امام احمد رضا کی علمیات کا تقابلی جائزہ
- ☆ فکر رضا کے جلوے
- ☆ قصیدۂ بانت سعاد (متن و ترجمہ)
- ☆ امام احمد رضا کے افکار و نظریات
- ☆ اُصول جرح و تعدیل
- ☆ تحقیقات حدیث
- ☆ غیر مسلم خود کش حملہ آوروں کی تاریخ

3013

مابعد جدیدیت کے بنیادی نظریات

(1) مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے اس کے مطابق ہر نظریہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استبدادی ہوتا ہے، اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہے۔

(2) مابعد جدیدیت ہیگل کے تاریخی ارتقا کے نظریے کو رد کرتی ہے۔ بقول نطشے حقائق اس بات کی ضمانت نہیں دیتے کہ تاریخ لازماً ترقی کی راہ پر ہے۔

(3) مذہبی، سماجی، سیاسی، ادبی، اخلاقی ہر معاملے میں بغاوت اور انحراف کا رجحان ہے۔

(4) 'مہابیانیہ' کا زمانہ گزر گیا۔ 'مہابیانیہ' ختم ہو گئے یا دب گئے ہیں۔ یہ دور چھوٹے چھوٹے بیانیوں، کا ہے۔ یہ مقامی ثقافتوں کے مطابق درست ہو سکتے ہیں۔ لہذا چھوٹے بیانیے اور قصہ گوئی میں نئی دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔

(5) مابعد جدید عالمی مفکرین کلیت پسندی، مرکزیت یا نظریہ سازی کے خلاف ہیں۔ نیز کثرتیت، کثیر الوضعیت، مقامیت اور بوقلمونی پر اصرار کرتے ہیں۔

(6) سچائیاں ایک نہیں ہیں، ان کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہو سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت اس بات پر زور دیتی ہے۔ کہ سچائی Universal نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ سچائیوں کا تعلق بھی مخصوص ثقافتوں کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔

(7) اب تک کلاسیکی سرمایہ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو مستند اور حتمی (Ultimate) تصور کرنا درست نہیں۔ اس کا ردتشکیل (Deconstruction) کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی قدروں کو حتمی اور مستقل تصور نہ کرتے ہوئے اسے بہت سے تنقیدی پہلوؤں سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔

(8) دنیا غیر حقیقی ہو گئی ہے۔ ایک صورت تو Simulacra کی ہے۔ دراصل اب چیزوں کی جس طرح نمائندگی ہوتی ہے وہ بذات خود متعلقہ اشیا سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نمائندگی یا کاپی کے نام پر کچھ اور ہی شے پیش کی جا رہی ہے۔ جس میں حقیقت کا شائبہ نہیں رہتا۔ آئے دن کے مرحلے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نہ تو سچائیاں ہی مستقل ہیں اور نہ ان کی نمائندگی!

(9) مابعد جدیدیت ثقافت کے حوالے سے اس بات پر اصرار کرتی [illegible] کرتی رہی ہے اس لیے کسی ایک سچائی کو ہر زمانے کے لیے [illegible] اختلافات کی وجہ یہی ہے۔ یعنی سچائیاں بنی بنائی نہیں ہیں وضع [illegible]

(10) مغربی استعمار کی عالمگیریت (Globalization) [illegible]